یہ دل کے موسم



نگہت عبداللہ

ترتیب

⊖ ⊖ ⊖

یہ دل کے موسم

پتا نہیں کیسے لوگ کہتے ہیں کہ محبت انسان کو بہادر بنا دیتی ہے۔ جبکہ میں تو اتنی بزدل ہو گئی ہوں کہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگی ہوں۔ ذرا سی آہٹ پر دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے جیسے ابھی ساری دیواریں توڑ کر باہر آ گرے گا اور اگر کہیں کسی کو سرگوشی کرتے ہوئے دیکھ لوں یا انجانے ہی میں کسی کے ہاتھ کا اشارہ میری طرف ہو تو بیچ میری جان نکل جاتی ہے۔ بس یہی لگتا ہے جیسے لڑکیاں ایک دوسرے کو میرے بارے میں بتا رہی ہوں۔ خواہ مخواہ سب سے جھجکتی پھرتی ہوں یا شاید اپنی کم ہمتی کے باعث۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ یہاں لڑکیاں بڑے مزے سے ایک دوسرے کو اپنی محبتوں کے قصے سناتی ہیں بلکہ بعض کے بارے میں تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ یہاں پڑھنے نہیں بلکہ اپنی محبتوں کو پروان چڑھانے آئی ہیں۔ بہر حال میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ اول تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی میری زندگی میں کوئی ایسا شخص اچانک آئے گا جسے دیکھتے ہی میرا دل ساری حدیں پھلانگ جائے گا۔ کیونکہ میرے گھر کا ماحول خالص روایتی قسم کا ہے۔ جہاں خصوصاً لڑکیوں کی اپنی کوئی سوچ کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ میں اگر اپنے شہر سے دور یہاں ڈگری کالج میں پڑھنے آئی ہوں تو اس میں میرے شوق کو دخل ضرور تھا لیکن میں نے اظہار ہرگز نہیں کیا تھا۔

بس یہ اتفاق ہی تھا کہ جس روز میرا انٹر کا رزلٹ آیا اُس روز ابا جی کے کوئی جگری دوست کراچی سے آئے ہوتے تھے اور انہوں نے ہی ابا جی کو مجبور یا قائل کیا تھا کہ مجھے آگے ضرور پڑھنا چاہئے۔ یوں اُن کی مہربانی سے ابا جی خود آ کر مجھے یہاں داخل کرا گئے۔ رہائش کا انتظام بھی ہاسٹل میں کر دیا ساتھ ہی بہت ساری باتیں بھی سمجھا گئے تھے جو میرا خیال ہے میں خود بھی سمجھتی تھی جب ہی گھر سے دور آ کر اور یہاں شوخ اور چنچل لڑکیوں کے درمیان رہ کر بھی میں اپنے ماحول کی طرف سے لاگو پابندیوں سے نکل نہیں سکی۔ مجھے اپنی روایات بہت عزیز نہیں ہیں لیکن میں ان سے بغاوت بھی نہیں کرنا چاہتی یا شاید ابا جی کے خوف سے میں نے کبھی غیر ارادی طور پر بھی ایسا نہیں سوچا یا پھر اب تک مجھے کسی جبر کا سامنا نہیں کرنا پڑا جبھی ایسا خیال نہیں آیا۔ میرے لئے یہی بہت ہے کہ ابا جی نے مجھے مزید پڑھنے کی اجازت دے دی بلکہ میرے کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی ورنہ میں بھی فرزانہ باجی کی طرح انٹر کے بعد گھر کے کام کاج میں اماں کا ہاتھ بٹاتی اور پھر پیا دیس رخصت ہو جاتی۔ یہاں آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ زندگی بس یہی کچھ ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ احساس ہو رہا تھا کہ زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ رنگ، خوشبو، گیت اور بھی نجانے کیا کچھ۔ پھر بھی میں اپنے خول سے باہر نہیں نکل سکی۔ کیونکہ میں ابا جی سے ڈرتی

بھی بہت ہوں۔ ذرا سی خلافِ مزاج بات ہو جانے پر جس رفتار سے اُن کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں اُس سے میری رُوح تک کانپ جاتی ہے۔ اس لئے بھی میں بہت محتاط رہتی ہوں۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی۔ حالانکہ میری روم میٹ شرمین بے حد باتونی ہے۔ ایک منٹ چپ نہیں رہ سکتی۔ اس کی باتوں کے جواب میں بھی بس "ہوں ہاں" کرتی ہوں اور کبھی کبھی تو وہ بیچ بیچ کوئی چیز اُٹھا کر مجھے کھینچ مارتی ہے۔ پھر خوب بکتی جھکتی ہے۔ ایک روز تو باقاعدہ لڑنے کھڑی ہوگئی تھی۔

"آخر تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو......؟ یا تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے......؟"

"نہیں تو......!" میری سادگی پر وہ مزید تلملا گئی تھی۔

"کیا نہیں تو......؟ اُس وقت سے کیا میں دیواروں سے سر پھوڑ رہی ہوں......؟ بابا......! میں تم سے بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں......! میں سن رہی ہوں۔" میری بیچارگی پر اُسے ذرا رحم نہیں آیا۔ مزید چیخ کر بولی تھی۔

"سننے کی بھی کیا ضرورت ہے......؟ کان بند کرلیا کرو اگر ذرا سی زبان نہیں ہلا سکتیں تو...... بس اب مجھے اپنا انتظام کہیں اور کرنا پڑے گا۔"

"نہیں شرمین......! پلیز......! تم کہیں اور نہیں جانا۔" میں نے اس کی منت کر ڈالی تھی کیونکہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی باتیں، اس کی ادائیں، چیونگم چباتے ہوئے سر کو جھٹک جھٹک کر بولتی اور ایکٹو بھی بہت تھی۔ گو کہ میں اس کی طرح نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی میں چاہتی تھی وہ میرے ساتھ رہے اور اس روز میری کمزوری اس کے ہاتھ آگئی۔ اس کے بعد وہ روز بروز مجھ سے بہت سے کام کروانے لگی۔ اگر میں منع کرتی تو فوراً اپنا بوریا بستر سمیٹنے لگتی اور مجھے اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑتے۔

پہلے میں اپنے کمرے سے نکلتی ہی نہیں تھی اور اب وہ روز بروز شام میں مجھے اپنے ساتھ گراؤنڈ میں لے آتی جہاں لڑکیاں والی بال اور بیڈمنٹن کھیل رہی ہوتیں۔ مجھے کھیلوں سے دلچسپی نہیں تھی جبکہ وہ بہت اچھی کھلاڑی تھی۔ میں چپ چاپ کنارے بیٹھ کر اُسے دیکھتی رہتی۔ پھر اسی نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ یہ جو وقت ہماری دسترس میں ہے کم از کم اسے تو ہم اپنی مرضی سے گزار لیں۔ آئندہ کون جانے کیسے حالات سے سابقہ پڑے۔ پھر ایک روز اس نے مجھے اپنے ساتھ بازار چلنے کے لئے کہا اور میں بیچ بیچ بے حد خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ اس چار دیواری کے اندر وہ جو کہے گی میں کروں گی لیکن اس کے ساتھ باہر نہیں جا سکتی۔ کیونکہ مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔ ابا جی سختی سے منع کر گئے تھے اور جب میں نے اُسے ابا جی کے غصے کا بتایا تو وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

"تمہارے ابا جی کو کیا پتا چلے گا......؟"

"پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"بے وقوف ہو تم......! اسی لئے تو کہتی ہوں کہ جتنے دن یہاں ہو اپنی مرضی سے جی لو۔ دیکھو لو کہ دنیا کتنی حسین ہے بعد میں موقع نہیں ملے گا۔"

اس کی ساری باتوں کے جواب میں میرے پاس بس ایک نہیں تھی۔ بالآخر اس نے اپنا آخری حربہ

استعمال کیا یعنی خفا ہو کر بوریا بستر سمیٹنے لگی۔

"بس......! اب تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ تم بہت بور لڑکی ہو۔"

میں روہانسی ہوگئی اور اس کے ہاتھ سے چادر جو وہ بیڈ سے کھینچ چکی تھی، لے کر دوبارہ بچھاتے ہوئے بولی۔

"چل رہی ہوں لیکن اگر ابا جی کو پتا چل گیا نا تو......"

"انہیں کبھی پتا نہیں چلے گا۔"

اس کی ساری خفگی دُور ہوگئی اور فوراً کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی تھی۔ میں نے بادلِ ناخواستہ وہ پیسے جو اماں نے ابا جی سے چھپا کر مجھے دیئے تھے، پرس میں رکھے اور بڑی سی چادر اوڑھ کر تیار ہوگئی۔ وہ آئی تو مجھے دیکھ کر ہنسنے لگی تھی لیکن میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور اسی طرح اُس کے ساتھ باہر نکل گئی۔ وہ یقیناً میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں اپنی کسی دوست کے ساتھ باہر نکل رہی تھی وہ بھی گھر والوں کی اجازت کے بغیر۔ سچ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں جبکہ وہ اسٹاپ پر بڑے اطمینان سے کھڑی تھی۔ ایک بس آئی۔ پیر رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی پھر بھی وہ اس میں سوار ہونے کے لئے تیار تھی لیکن میں نے منع کرتے ہوئے مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا تھا۔

"پاگل ہو تم......!" وہ مجھ پر سخت جھنجلائی۔

"اس خوش فہمی میں مت رہو کہ خاص طور سے ہمارے لئے کوئی خالی بس آئے گی۔"

"لیکن اس میں تو چڑھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔"

"ارے......! دھکیل دھکال کر چڑھ جاتے۔ اچھا دیکھو بس آ رہی ہے اب کھڑی مت رہ جانا۔"

اس نے میری گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور میرا ہاتھ تھامنا چاہتی تھی کہ بس کی حالتِ زار دیکھ کر میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی جس سے میرا ہاتھ تو اس کے ہاتھ میں نہیں آیا البتہ چادر کا کونا آ گیا اور وہ اسے ہی کھینچتی ہوئی بس کی طرف لپکی جبکہ میں اُسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عجیب صورتِ حال تھی کہ وہ کھچا کھچ بھری بس میں چڑھنے پر بضد ساتھ میں مجھے بھی کھینچ رہی تھی اور میں ہرگز تیار نہیں تھی۔ پتا نہیں اُسے اتنی جلدی کیا تھی کہ میری طرف دیکھے بغیر "جلدی آؤ، جلدی آؤ" کہتی ہوئی بس میں سوار ہوگئی۔ میری چادر کا کونا اس کے ہاتھ میں تھا اور غالباً وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ گھسی ہوئی ہوں۔ اتنے میں بس چل پڑی۔ میں چند قدم ساتھ بھاگی اور پھر لگا جیسے میں کھلے آسمان تلے ایک دم برہنہ ہوگئی ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے گویا ایک دھند چھا گئی تھی اور دھند کے اُس پار میری چادر ہوا میں اُڑتی جا رہی تھی جس کا کونا یقیناً اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں اگر ذرا سی بھی بولڈ ہوتی تو خود کو سنبھال لیتی اور یوں کھڑی ہو جاتی جیسے میں ہاسٹل سے نکلی ہی بغیر دوپٹے کے تھی۔ اس اتنے بڑے شہر میں یہ کوئی ایسی قابلِ گرفت بات نہیں تھی لیکن بولڈ ہونا تو دُور کی بات میں تو پہلے ہی اندر یہ خوف لئے کھڑی تھی کہ اگر کسی جاننے والے کی نظر پڑ گئی اور اس نے ابا جی کو بتا دیا تو میرا کیا حشر ہوگا۔ اس پر اس نئی افتاد نے تو میرے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے۔

دھندلائی آنکھوں سے اپنے اطراف دیکھا اور پیچھے بنگلے کا گیٹ کھلا دیکھ کر بنا سوچے سمجھے تیز قدموں

سے چلتی ہوئی اس میں داخل ہوگئی تھی۔ اس وقت مجھے صرف ایک چادر کا خیال تھا کیونکہ میں تو کبھی اپنے گھر میں بھی کھلے سر نہیں رہی تھی۔ بہر حال کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے پر میں بے حد خوفزدہ ہونے کے باوجود برآمدے تک چلی گئی تھی۔ اس کے بعد خود سے اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی تو بہت آہستہ سے دروازہ ناک کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک چہرہ نمودار ہوا اور سوالیہ انداز میں مخاطب ہوا۔

"جی......؟" میں نے ذرا سی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ ملازموں والا حلیہ تھا۔ تب میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا تھا۔

"کوئی ہے......؟" اور غنیمت تھا کہ اس نے پوچھا نہیں کس سے ملنا ہے بلکہ سامنے سے ہٹتا ہوا بولا۔

"جی...... ! اندر آجائیں۔" میں اس کے پیچھے اندر داخل ہوگئی تھی۔ بڑا سا ہال کمرہ تھا اور سامنے صوفے پر کوئی شخص اپنے سامنے رکھی میز پر شیٹ پھیلائے ڈرائنگ میں مصروف تھا اور اس کا سر جھکا ہونے کے باعث ہی میں اُسے دیکھ سکی تھی۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت، چوڑی پیشانی کے اوپر سلیقے سے جمے بال، جن کی نمی بتا رہی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے نہا کر بیٹھا ہے، بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا جبکہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پنسل جس سے وہ شیٹ پر جگہ جگہ نشان لگا رہا تھا اور یہ سچ ہے کہ میں نے اس طرح کبھی کسی کو نہیں دیکھا تھا اور جسے دیکھ رہی تھی اس کی وجاہت نے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔

"سر...... ! یہ بی بی آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

(اُف یہ ملازم کیا کہہ رہا تھا......؟)۔

"کون......؟" سر اونچا کرنے کے ساتھ اس نے سگریٹ والے ہاتھ کو بھی حرکت دی۔ غالباً کش لینا چاہتا تھا لیکن مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا ہاتھ ہونٹوں سے کچھ ہی فاصلے پر رک گیا تھا اور اُسے یوں دیکھتے پا کر میں بری طرح نروس ہوگئی تھی۔

"جی......!" کافی دیر بعد اس نے غالباً مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی اور میں اس سے کیا کہتی۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو آنکھوں کے پیمانے چھلک گئے تھے۔

"ارے......!" وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھے بیٹھنے کا کہہ کر ملازم کو پکار کر پانی لانے کے لئے کہا۔ وہ پانی لایا تو اس سے گلاس لے کر میری طرف بڑھا کر بولا تھا۔

"پہلے پانی پی لیجئے......!" میں نے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرنے لگی تھی کہ معاً احساس ہوا گلے میں دوپٹہ تک نہیں ہے۔ فوراً بیگ اُٹھا کر سینے سے لگایا تو وہ پتا نہیں کیا سمجھا تھا۔

"ڈریں نہیں مجھے بتائیں کیا پرابلم ہے......؟"

"آپ......!" میں نے دزدیدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا تھا۔

"آپ کے گھر میں کوئی خاتون ہوں تو انہیں بلائیں۔"

"اس وقت تو بس آپ ہی ہیں۔" وہ خاصے ریلیکس انداز میں صوفے پر بیٹھا اور دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگا تھا۔

"اور تو کوئی خاتون نہیں ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتائیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں......؟"

(میرے خدا......!)۔ میں عجیب مشکل میں پھنس گئی تھی۔ پہلے سوچا کچھ کہے بغیر اُٹھ کر چلی جاؤں لیکن اس طرح ہاسٹل تک جانا قیامت سے کم نہیں تھا۔ پھر سوچ کر کہا۔

"میرا خیال ہے آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"یہ خیال کیونکر آیا آپ کو......؟" اس کی اشتیاق بھری نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے میں مزید نروس ہوگئی تھی۔ تب وہ خود ہی سمجھ کر مجھے اصل بات کی طرف لانے کی غرض سے بولا تھا۔

"چلیے...... گولی ماریں پرابلم کو...... یہ بتائیں آپ کہاں سے آرہی ہیں......؟"

"میں یہاں سامنے کالج کے ہاسٹل میں مقیم ہوں۔" میں نے پہلے اسی قدر کہا تھا لیکن پھر اسی سے بات آگے بڑھ گئی تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے اپنی دوست کے ساتھ مارکیٹ جانے کے لئے نکلی تھی لیکن ہوا یہ کہ وہ تو بس میں سوار ہوگئی لیکن میں...... اصل میں بس میں جگہ نہیں تھی پھر بھی شرمین زبردستی میری چادر کھینچ کر بس میں چڑھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اتنے میں بس چل پڑی اور......"

"اور آپ کی چادر ساتھ چلی گئی۔" اس کی بے ساختہ مسکراہٹ نے مجھے پانی پانی کر دیا۔ ہتھیلیوں تک میں پسینہ اتر آیا تھا۔ اس کی طرف دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا ورنہ کچھ کہا گیا۔ تب وہ اُٹھ کر ایک کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ہلکے آسمانی رنگ کی مردانہ شال تھی۔ میری طرف بڑھا کر بولا۔

"آئی ایم سوری...... ! اس وقت میرے پاس یہی ہے۔"

اور میں نے ذرا تکلف نہیں کیا۔ پتا نہیں کہاں سے اتنی پھرتی آگئی تھی کہ فوراً شال لے کر اپنے گرد لپیٹ لی۔ پل میں دھیمی دھیمی مہک نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا اور میں بمشکل کہہ پائی۔

"شکریہ......!"

"ویلکم......!" وہ بیٹھا اور میں کھڑی ہوگئی۔

"میں کل کسی وقت یہ آپ کو واپس کر جاؤں گی۔" میں نے کہا تو اس نے غالباً "نہیں" کہنے کے لئے ہونٹ کھولے تھے لیکن پھر جانے کیا سوچ کر خاموش ہو رہا تھا اور میں ایک بار پھر "شکریہ" کہہ کر جلدی سے باہر نکل آئی تھی اور کتنی ہی اس سے دور چلی آتی۔ اس کی مہک میرے ساتھ ساتھ تھی۔ ہاسٹل آئی تو شرمین بھی راہداری میں ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دبی آواز میں دانت پیس کر بولی تھی۔

"اُلو کی پٹھی...... ! کہاں چلی گئی تھی......؟"

"کیوں......؟ کیا ہوا......؟" میں سہم گئی کہ کہیں میرے گھر سے تو کوئی نہیں آگیا۔

"اندر چل بتاتی ہوں۔" وہ مجھے کھینچتی ہوئی کمرے میں لائی۔ تب چادر پر نظر پڑی بلکہ احساس ہوا۔

"یہ چادر کس کی ہے......؟"

"مجھے نہیں پتا۔" میں روہانسی ہوگئی۔

"میری چادر تمہارے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں مجبوراً وہیں ایک گھر میں داخل ہو گئی اور یہ چادر مستعار لے کر آئی ہوں...... کیا کرتی......؟ اس کے بغیر واپس یہاں نہیں آ سکتی تھی۔"

"بغیر جان پہچان کے انہوں نے تمہیں چادر دے دی......؟"

"کل واپس کرا آؤں گی۔"

"مجھے پتا ہے تم یہی کرو گی۔ شکل ہی سے احمق لگتی ہو۔" پھر خود ہی ہنسنے لگی۔

"چادر کے ساتھ چار دیواری بھی مانگتی تو وہ بھی مل جاتی۔"

"بکواس اور سن لو...... آئندہ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"میری جان......! میں خود اس وقت سے سو بار توبہ کر چکی ہوں۔ دماغ خراب ہو گیا تھا میرا جو تمہیں ساتھ لے گئی تھی۔" وہ باقاعدہ مجھ پر بگڑنے لگی۔

"پتا ہے اگلے ہی اسٹاپ پر اتر گئی تھی۔ بھاگی بھاگی واپس آئی تو تمہارا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ یہی خیال آیا کہ واپس یہاں آ گئی ہو گی اور جب یہاں بھی نہیں ملیں تو سچ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ایمان سے اگر تم کچھ دیر اور نہ آتیں تو میں پولیس میں رپورٹ درج کرانے پہنچ چکی ہوتی کیونکہ اب مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ تمہیں کوئی ٹی ٹی دکھا کر لے گیا ہے۔"

"ہائے نہیں......! ایسی خوفناک باتیں تو نہیں کرو۔" کم بخت کو مجھ پر ذرا رحم نہیں آتا تھا۔ مزے لے کر بولی۔

"مجھے لگتا ہے کسی دن تمہارے ساتھ یہی ہو گا۔" میں رونے لگی جبکہ وہ ہنستی چلی گئی تھی۔

○○○

اگلے روز ثمرین دوسری لڑکیوں کے ساتھ بازار چلی گئی اور میں اس انتظار میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسی وقت اس کی شال واپس کرا آؤں کیونکہ کل اس نے مروتاً بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے میں قدرے لاپروا ہو جاتی اور سوچتی کہ کسی بھی دن واپس کر دوں گی۔ لہٰذا اسی وقت میں نے شال تہہ کر کے شاپنگ بیگ میں ڈالی اور چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ اس کا گھر روڈ کے دوسری طرف ہی تو تھا۔ اس لئے میں بڑے آرام سے چوکیدار سے کچھ دیر میں آنے کا کہہ کر روڈ کراس کر آئی لیکن یہاں آ کر احساس ہوا کہ جس کام کو میں اتنا آسان سمجھ رہی تھی وہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ کل میں بنا سوچے سمجھے اس گیٹ میں داخل ہو گئی تھی اور آج اپنے سارے حوصلے یکجا کرنے کے باوجود میں اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ کتنی دیر سوچنے کے بعد بالآخر میں نے بیل کا بٹن پش کر دیا۔ کل والا ملازم آیا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"آئیے بی بی......! صاحب صبح سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کیا......؟" میرے صرف ہونٹ نیم وا ہوئے جبکہ دل بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"کتنی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔ آئیے......!" ملازم نے دوبارہ اندر آنے کو کہا تو میں خاصے گم صم انداز میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ فون پر بات کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو بات مختصر کر کے ریسیور رکھ دیا اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہو کر گرمجوشی سے مسکرایا تو میں نے جلدی سے شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ آپ کی امانت۔"

"پلیز تشریف رکھیں۔" اس نے میرا بڑھا ہوا ہاتھ یکسر نظرانداز کر دیا اور مجھے بیٹھنے کا کہہ کر خود ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو میں شش و پنج میں کھڑی تھی۔

"ارے......! آپ ابھی تک کھڑی ہیں۔" اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

"میں یہ شال لوٹانے آئی تھی۔"

"اچھا......!" وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

"لیکن میں تو دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔"

"جی......؟" مجھے اپنا آپ عجیب سا لگا اور یہ کہ میں نے آنے میں جلدی کیوں کی۔ فوراً شاپنگ بیگ صوفے پر رکھا اور واپس پلٹی ہی تھی کہ وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اس طرح تو آپ نہیں جا سکتیں۔" میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ تب وہ میری کیفیت محسوس کر کے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

"پلیز......! تشریف رکھیں۔ آپ میری مہمان ہیں۔ کل بھی یونہی چلی گئی تھیں۔ آپ کے جانے کے بعد خیال آیا تو بے حد پشیمانی ہوئی تھی کہ میں نے آپ سے چائے تک کا نہیں پوچھا تھا۔"

"نیور مائنڈ......! آپ نے چادر دے کر جو مہربانی بلکہ احسان کیا وہ......"

"پلیز......!" اس نے فوراً ٹوک دیا۔

"اتنی سی بات کے لئے اتنے بڑے بڑے الفاظ استعمال نہ کریں اور پلیز بیٹھ جائیں۔ دیکھیں چائے بھی آ گئی۔"

میں نے ملازم کو چائے لاتے ہوئے دیکھا اور پھر پلٹ کر صوفے کے کنارے پر قدرے تکلف سے بیٹھ گئی کیونکہ میں جان گئی تھی کہ وہ کبھی بھی مجھے اس طرح نہیں جانے دے گا اور اگر میں چلی گئی تو اسے بے حد دکھ ہو گا۔

"کیا آپ اپنا نام بتانا پسند کریں گی......؟" ٹرے میں کپ سیدھے کرتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا۔

"شمع......!"

"شمع......!" دہراتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی نظر مجھ پر ڈالی پھر مسکرا کر بولا۔

"مجھے جہانگیر کہتے ہیں۔ آرکیٹیکٹ ہوں۔ میرے والدین آج کل لاہور گئے ہوئے ہیں۔ وہاں میری سسٹر رہتی ہیں اسی کے پاس گئے ہیں۔ آپ کہاں رہتی ہیں......؟"

"ہاسٹل میں۔" میں بے خیالی میں کہہ گئی۔

"میرا مطلب ہے آپ کے گھر والے......؟" اس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے وضاحت کی اور میں نے جواب دینے کے بجائے اس کے ہاتھ سے کپ لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ بس یونہی خیال آیا تھا کہ اسے اپنے بارے میں کیوں بتاؤں۔ حالانکہ گزری شب کے کتنے پل اس کے نام کر چکی تھی۔ اس

کی دلفریب مسکراہٹ کو سوچا تھا۔ کبھی دھیمے لہجے میں اُلجھی تھی اور کبھی بھنورا آنکھوں کی گرفت میں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر میرے جواب کا منتظر رہا پھر شاید سمجھ گیا کہ میں بتانا نہیں چاہتی۔ تبھی کہنے لگا۔

"اچھا یہ اچھی بات ہے۔ بہر حال مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی اور میں یہ رسماً نہیں کہہ رہا بلکہ رسماً میں نے کبھی خوشی کا اظہار کیا ہی نہیں۔ میری زندگی میں بہت کم لوگ ایسے آئے جن سے مل کر میں واقعی خوش ہوا ہوں اور اُن میں آپ بھی شامل ہیں۔"

(میرے خدا.....!)۔ میرے دل کی راہداریوں میں مضبوط قدموں کی مدہم مدہم چاپ گونجنے لگی تو میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلوں گی۔"

"پھر آئیں گی ناں.....؟" اُس نے بڑی آس سے پوچھا لیکن میں فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکی۔ تب وہ کہنے لگا۔

"میری بی بی جان اور بابا جان آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ آپ ضرور آیئے گا۔"

"جی.....!" میں اسی قدر کہہ سکی اور جانے لگی کہ اُس نے پکار لیا۔

"سنیے.....!" میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس نے شاپنگ بیگ اُٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ آپ کے لئے ہے۔ میں کل بھی یہ بات کہہ سکتا تھا لیکن اس طرح آپ کی دوبارہ آمد کی اُمید ختم ہو جاتی۔"

"تو کیا میں اسے دوبارہ لوٹانے آؤں.....؟" میرے سادگی سے پوچھنے پر وہ بے ساختہ مسکراہٹ نہیں روک سکا۔ ذرا آگے بڑھ کر شاپنگ بیگ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اُس کی دلفریب مسکراہٹ اور پھر قربت مجھے نروس کر رہی تھی۔ جبھی میں جلدی سے باہر نکل آئی۔

شرمین ٹھیک کہتی تھی کہ زندگی میں اور بھی بہت رنگ ہیں۔ حسین اور دلفریب۔ میں گھٹے ماحول کی پروردہ بھلا کہاں ان رنگوں کو پا سکتی تھی۔ کبھی گمان میں بھی ایسی باتیں نہیں تھیں اور اب جب اچانک یہ نیا احساس ملا تو میں سچ مچ بوکھلا گئی تھی۔ مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں کوئی میرے تصورات تک رسائی حاصل نہ کر لے۔ جہاں ایک چادر کے عوض اُس نے اپنا مستقل ٹھکانا کر لیا تھا۔

یوں بھی میں سب سے الگ تھلگ تھی اور اب تو شرمین سے بھی کترانے لگی تھی کیونکہ میرا اندر سے بے حد خوفزدہ تھی اور جہانگیر کے خیال نے مجھے حد درجہ بزدل بھی بنا دیا تھا۔ کالج آف ہوتے ہی میں کھانا کھا کر منہ سر لپیٹ کر پڑ جاتی۔ محض شرمین سے بچنے کی خاطر۔ کیونکہ وہ جتنی باتونی تھی اتنی ہی ذہین بھی۔ مجھے یقین تھا وہ منٹوں میں میرے اندر کا حال اگلوا سکتی ہے جبکہ میں خود اپنے آپ سے اعتراف کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ جبھی دوپہر میں یوں اُس سے دامن بچا جاتی۔ بس شام میں تھوڑی دیر کے لئے اُس کے ساتھ گراؤنڈ میں چلی جاتی۔ وہ بھی اس لئے کہ وہ مجھے چھوڑ کر بیڈمنٹن کھیلنے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ پھر رات کے کھانے کے بعد میں فوراً کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔ گو کہ میری آنکھوں کے سامنے لفظ کبھی دھبوں کی شکل اختیار کر جاتے اور کبھی مفہوم بدل بدل جاتے۔ پھر بھی میں یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی جیسے بڑی سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف ہوں۔

"کیا تمہارا ٹاپ کرنے کا ارادہ ہے.....؟" محض میری توجہ ہٹانے کی خاطر شرمین نے خود کو میرے سامنے زور سے گرایا اور پوچھنے لگی۔

"کیا کروں گی ٹاپ کر کے.....؟"

"اور لوگ کیا کرتے ہیں.....؟" اُس کے گرنے سے جو صفحات اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے میں نے انہیں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"اور لوگوں کی بات نہیں کرو۔ ان کا تو کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اپنے آئندہ کے بارے میں وہ پلان کر چکے ہوتے ہیں اور اگر تمہارا بھی کوئی مقصد ہے تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتیں۔"

"کیوں.....؟" میرے استفسار پر وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

"کیوں کا جواب بعد میں دوں گی پہلے مقصد بتاؤ۔ ٹاپ کرنے کے بعد کیا کرو گی.....؟"

"کچھ نہیں.....!" میرے منہ سے بلا ارادہ ہی نکل گیا تو اُس نے ہنستے ہوئے میرے سامنے کھلی کتاب بند کر دی۔

"پھر کیا ضرورت ہے اتنا سر کھپانے کی.....؟ جب ہر صورت ہانڈی چولہا ہی کرنا ہے تو آرام سے فیل ہو جاؤ اور تمہارے کیوں کا جواب یہ ہے کہ تم جیسی احمق لڑکیاں صرف شوہروں کی سختیاں جھیلنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔"

"جی نہیں.....!" مجھے سخت برا لگا۔

"جی ہاں.....!" اُس نے میرے انداز میں منہ بگاڑ کر میرا مذاق اُڑایا پھر کتابیں اُٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

"بس.....! اب تم مجھے مزید بور نہیں کرو۔"

"میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں.....؟" وہی میری بیچارگی اور اُسے ذرا رحم نہیں آتا تھا۔ دانت پیس کر بولی۔

"کم بخت.....! ایسی شکلیں مت بنایا کرو۔ اگر صنف مخالف کی نظر پڑ گئی تو پل میں جان سے جائے گا۔ ویسے اب تک کتنوں کو گھائل کر چکی ہو.....؟"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو.....؟" میں قصداً انجان بنی رہی اور اُکتاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرو تم برابر میں رضوانہ کے پاس چلی جاؤ۔ تمہاری طرح وہ بھی باتیں کرنے کی بہت شوقین ہے۔"

"ہے نہیں تھی، کم بخت کو جب سے عشق ہوا ہے بس اُسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔"

رضوانہ کے نام پر اُس نے برا سا منہ بنایا اور میرے سامنے مزید پھیل کر لیٹ گئی۔ گویا اب اُس سے جان چھڑانی مشکل تھی۔ ناچار اس کی باتوں میں دلچسپی لینی پڑی۔

"ہاں.....! کیا ہوا ہے رضوانہ کو.....؟"

"بتایا تو ہے عشق اور وہ بھی ایک فضول بندے سے۔ شکل ایسی ہے کہ....."

"بس بس.....!" میں نے فوراً ٹوک دیا۔

"کسی کی شکل کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ ویسے تمہیں کیسے پتا چلا......؟"

"لو...... میں تو اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔ یہاں موجود ایک ایک لڑکی کے بارے میں بتا سکتی ہوں۔ کوئی لاکھ خود کو سات پردوں میں چھپائے مجھ سے نہیں چھپ سکتا۔"

"اچھا......!" میں خواہ مخواہ ہنسی۔ عجیب خجالت بھری ہنسی تھی۔ دل میں چور ہو تو یونہی دوسروں کی بات بھی اپنی بات لگتی ہے اور اچھا ہوا وہ میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی ورنہ اسی وقت میرا پوسٹ مارٹم کر دیتی۔ پھر جیسے اچانک خیال کے تحت مجھے دیکھ کر بولی۔

"سنو...... ! تم نے کیوں اپنے دل کو اتنا سنبھال کر رکھا ہے۔ لگتا ہے کسی گلفام کے انتظار میں ہو...... ہے ناں......؟"

"نہیں تو......!" میرے چہرے پر یقیناً کوئی رنگ اترا ہوگا جبھی تو وہ ٹھٹھک سی گئی پھر میرا ہاتھ دبا کر بولی۔

"سچ بولو...... ! اتنا تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں چاہنے والے ہزاروں ہوں گے کیونکہ تمہیں دیکھ کر اس کلی کا خیال آتا ہے جسے نسیم سحر چپکے سے چھو کر گزری ہو۔"

"تم مجھے نروس کر رہی ہو......؟" میں سچ مچ رو دینے کو ہو گئی تو وہ ہنس پڑی۔

"پاگل لڑکی...... ! میں تمہاری تعریف کر رہی ہوں۔ ایمان سے اگر کوئی مجھے اس طرح کہے تو میں اس کا منہ چوم لوں۔ اچھا ادھر دیکھو۔"

میں نے ایک لمحے کو پلکیں اٹھا کر دوبارہ گرا لیں تو وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

"تمہارے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔" میں نے دل ہی دل میں شکر کیا اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔

○ ○ ○

کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ میرے اندر عجیب سی بے کلی آ سمائی تھی۔ نہ پڑھنے پر طبیعت مائل ہوتی نہ کسی اور کام میں دل لگتا۔ بس ہر پل اُسی کا خیال اور یہ کہ وہ میرا منتظر ہوگا۔ روزانہ رات میں یہ سوچ کر سوتی کہ کل کسی بھی بہانے اس کے گھر جاؤں گی۔ لیکن صبح ہوتے ہی میری ہمتیں پست ہو جاتیں۔ کسی کسی وقت تو اپنے آپ پر بہت غصہ آتا کہ آخر میں اتنی بزدل کیوں ہوں اور بھی تو لڑکیاں ہیں کتنے مزے سے وارڈن کی نظر بچا کر اور چوکیدار کو پیسے دے کر نکل جاتی ہیں۔ میں اگر ایسا نہیں کر سکتی تو وارڈن سے اجازت لے کر تو جا سکتی ہوں۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کر سکی۔ کیونکہ جہاں اپنے اندر تھوڑی بہت ہمت پیدا کرتی وہیں اباجی کا خیال آ جاتا کہ وارڈن سے تو میں کسی عزیز سے ملنے کا بہانا کر سکتی تھی۔ اگر واپسی میں اباجی موجود ہوئے تو ان سے کیا کہوں گی۔ بس یہی خوف میرے قدم روکے رکھتا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں کبھی اس خوف سے نہیں نکل سکوں گی تو اس وقت بے حد آزردہ ہو کر میں خود کو سمجھانے بیٹھ گئی۔

(بہت دن ہو گئے۔ وہ یقیناً بھول بھال گیا ہوگا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھلا کون یاد رکھتا ہے)۔

"شمع بی بی...... ! آپ کی ملاقات ہے۔" چوکیدار کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور اباجی کا خیال آتے ہی میں فوراً کھڑی ہو گئی۔ جلدی جلدی پاؤں میں چپلیں ڈال رہی تھی کہ ثمرین کہنے لگی۔

"توبہ...... ! تمہاری تو روح فنا ہو جاتی ہے اباجی کی آمد پر۔ چلو آج میں بھی اُن کا دیدار کر لوں بلکہ اُن سے کہوں گی لڑکی پر رحم کریں۔ اتنا رعب بھی اچھا نہیں ہوتا۔"

"نہیں ثمرین...... ! پلیز...... ! تم نہیں آنا۔" میں نے بڑی منت سے اُسے روکا اور جلدی سے باہر نکل آئی۔ طویل راہداری منٹوں میں عبور کی اور سیڑھیاں اتر کر ویٹنگ روم میں داخل ہوئی تو جہانگیر کو دیکھ کر ایک لمحے کو میرا پورا وجود سُن ہو گیا۔ پھر اچانک دل اتنی زور سے دھڑکا کہ میں گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"شاید آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا......؟" وہ پتا نہیں کیا سمجھا اور میں ایک لفظ نہیں بول سکی۔

"آئی ایم سوری......!" شاید میری خاموشی نے اس کے خیال کو تقویت بخشی جو معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں آپ کا انتظار کرتے کرتے تھکا تو نہیں تھا بس اچانک یہ خیال آیا کہ کہیں آپ کے ساتھ کوئی پرابلم نہ ہو جب ہی چلا آیا۔ کیسی ہیں آپ......؟"

"جی......!" میں نے اسی قدر کہا جبکہ "ٹھیک ہوں" کا اشارہ سر ہلا کر کیا۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں......؟"

"پلیز......!" میں اس کے سامنے بیٹھی تو کہنے لگا۔

"آپ کو میری طرف آنے کا خیال ہی نہیں آیا......"

"بارہا خیال آیا۔" میری بے اختیاری پر اس کی بے قراری سبقت لے گئی۔

"پھر......؟" پھر میں سوچتی رہ گئی۔ کوئی جواب نہیں سوجھا تو موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا۔

"آپ کیا لیں گے......؟ چائے یا کولڈ ڈرنک......؟"

"نہ چائے نہ کولڈ ڈرنک۔ بس...... ! ایک وعدہ۔"

"جی......؟" میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"جی بس...... ! یہی وعدہ چاہیے کہ آئندہ خیال آنے پر خود کو روکیں گی نہیں بلکہ اسی وقت چلی آئیں گی۔" اور میں عجیب مشکل میں پڑ گئی۔ وعدہ کر بھی لیتی تو نبھانا بہت مشکل تھا۔

"چلیے...... آپ نہیں آ سکتیں تو مجھے آنے کی اجازت دیجئے۔"

"نہیں پلیز......!" میرے فوراً منع کرنے پر وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ غالباً خود ہی قیاس کر رہا تھا کہ میں کیوں منع کر رہی ہوں۔ پھر سمجھ کر کہنے لگا۔

"آپ کی احتیاط پسندی اوّل روز ہی مجھے اچھی لگی تھی پھر بھی میں خواہش کرنے لگا ہوں کہ میرے لئے آپ ہر دیوار توڑ دیں۔ خواہ روایات کی ہوں، سماج کی یا خود ساختہ کھڑی کی گئی ہوں۔ میری اس خواہش کو آپ خود غرضی سے منسوب کریں یا کوئی اور نام دیں لیکن میرے خلوص اور میری نیت پر کبھی شبہ نہیں کرنا شمع...... ! کہ میں اپنے سارے جذبے پوری ایمانداری کے ساتھ تمہارے نام لکھ چکا ہوں۔"

(میرے خدا......!)۔ میں نے خود کو بے بسی کی آخری حدوں پر محسوس کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ اسی وقت ثمرین چلی آئی۔ غالباً اباجی سے ملنے آئی تھی لیکن اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

"سوری......! میں بھی......" وہ کہتے ہوئے پلٹنے لگی کہ میں نے پکار لیا۔

"زکو شرمین......! یہ جہانگیر ہیں۔" اُس کا تعارف میں میں اسی قدر کہہ سکی۔ پھر وہ بول پڑی۔

"اور میں شرمین ہوں۔ اس کی روم میٹ اور دوست بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ اس کے کون سے والے زاد ہیں۔ میرا مطلب ہے چچازاد، ماموں زاد یا......"

وہ بے ساختہ مسکرایا اور اُس کے جھکے ہوئے سر پر نظریں جما کر بولا۔

"میرا ان سے دل کا ناطہ ہے۔"

"واؤ......! پھر تو میں گل ہوئی ہوں۔"

"نہیں......! میں چلتا ہوں۔" وہ اُٹھ کر میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ میں اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔

تب اُس نے اپنے بھاری جوتے سے میرے پیر کو ہلکے سے دبایا اور آہستہ آواز میں بولا۔

"او کے......! میں انتظار کروں گا۔" پھر وہ باہر نکل گیا تو شرمین میرے سامنے گھٹنے ٹیک کر یوں بیٹھی کہ اپنی کہنیاں میرے گھٹنوں پر رکھ کر ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکایا اور براہِ راست مجھے دیکھنے لگی۔ میں سمجھ گئی اب یہ پوری داستان سننا چاہے گی اور کوئی اتنی طویل داستان تو نہیں تھی۔ چند لفظوں میں کہی جا سکتی تھی اور میں نے کہہ دی۔ ساتھ ہی آنسو بھی چھلک پڑے تو وہ بری طرح جھنجھلا گئی۔

"پاگل ہو گئی ہو......؟ روتی کیوں ہو......؟"

"اور کیا کروں......؟ تمہیں کیا پتا میں خود کو کتنی مشکل میں محسوس کر رہی ہوں۔ میرے گھر میں اگر کسی کو خبر ہو گئی تو یقیناً مجھے جان سے مار دیں گے۔ بڑے بھیا تو پہلے ہی مجھے یہاں بھیجنے کے خلاف تھے۔ ابا جی نے بھی بس دوست کی بات رکھ لی اور ان سے کوئی بعید نہیں کہ کسی بھی وقت مجھے واپس بلا لیں۔ ایسے میں تم ہی بتاؤ کیا اس راستے پر چلنا مناسب ہے......؟ جس کی کوئی منزل ہی نہیں۔" ہمیشہ کی طرح میرے رونے کا اس پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ بڑے اطمینان سے بولی۔

"اور کیسی ہوتی ہے منزل......؟ منزل تو خود چل کر تمہارے پاس آئی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟"

"مطلب بھی سمجھا دوں گی۔ یہاں سے تو نکلو۔" وہ مجھے اٹھا کر باہر لے آئی۔ کچھ دیر تک ہم لان میں ٹہلتے رہے۔ اس دوران وہ مسلسل جہانگیر کی تعریف میں زمین آسمان ایک کرتی رہی۔ پھر جب ہم اپنے کمرے میں آئے تب وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

"تم اپنے حالات سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہو۔ تمہارے والدین خواہ کتنے سخت گیر سہی پھر بھی اولاد کے لئے نرم گوشہ ضرور رکھتے ہوں گے۔ تم اگر خود ان سے بات نہیں کر سکتیں تو کسی کے ذریعے کہلوا دو کہ تم جہانگیر کو پسند کرتی ہو۔"

"کیا......؟" میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ مار نہیں ڈالیں گے وہ تمہیں۔ بس تھوڑی سی سختی کریں گے اور اگر تم نے ہتھیار نہیں ڈالے تو تمہاری بات ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"تم اتنے آرام سے یہ بات اس لئے کہہ رہی ہو کہ تمہیں میرے جیسا ماحول نہیں ملا ورنہ اس تصور سے ہی تمہاری روح فنا ہو جاتی۔ بہرحال اس موضوع کو ختم کرو۔" میرا ذہن پہلے ہی پریشان تھا۔ اس کی باتیں مزید پریشان کر رہی تھیں اس لئے موضوع ختم کرنے کے لئے کہا لیکن وہ بگڑ گئی۔

"میں تمہارے ساتھ بھلائی کر رہی ہوں اور تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے۔ میری بلا سے جہنم میں جاؤ۔"

"مجھے تمہارے خلوص پر شبہ نہیں ہے شرمین......! اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں......؟" میں نے بے بسی سے اُسے دیکھا تو وہ دانت پیس کر بولی۔

"زہر لگتی ہو مجھے یوں بے بسی سے آنسو بہاتی ہوئی۔ مجھے تم سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے البتہ اس الو کے پٹھے پر رحم آ رہا ہے جو چادر کے بعد بڑی محبت سے چار دیواری کی پیش کش کر رہا ہے۔" میرے آنسو اور شدت سے بہنے لگے۔

"اُسے دُکھ دے کر بھی سکون سے نہیں رہ سکو گی۔"

"میں جانتی ہوں۔" میں نے روتے روتے اعتراف کرنے کے ساتھ کہا۔

"لیکن میں کیا کر سکتی ہوں......؟ اپنی روایات سے بغاوت کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"پاگل لڑکی......! تمہیں بغاوت کرنے کو کون کہہ رہا ہے......؟" اس کی جھنجھلاہٹ عروج پر تھی۔

"پھر......؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو اس بار اُسے مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ میرے پاس بیٹھتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں کہنے لگی۔

"آخر کہیں نہ کہیں تو تمہاری شادی ہونی ہے ناں......؟ اور میرا خیال ہے تم اکیلی بھی نہیں ہو پھر تمہاری ماں ہی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر تم نے کیوں ایسی باتیں فرض کر لی ہیں جو تمہیں خوفزدہ کرتی ہیں......؟ تم اس کے برعکس بھی تو سوچ سکتی ہو......؟ میرا مطلب ہے اب جہانگیر سے ملو تو صاف کہہ دینا کہ اس کے والدین تمہارے والدین سے ملیں۔ اس طرح تم پر کوئی آنچ بھی نہیں آئے گی اور ہو سکتا ہے فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں......؟"

میرے چپ چاپ دیکھنے پر وہ زور دے کر بولی تو میں نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا اور کیا کرتی۔ اس وقت اُسے خاموش کرانے کا یہی ایک طریقہ تھا اور وہ تو خاموش ہو گئی لیکن میرے اندر کی بے کلی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی گئی تھی۔

شرمین کی نظر میں میں لاکھ احمق سہی۔ اپنے گھر والوں کے مزاج کو کافی حد تک سمجھتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے ہاں لڑکیوں کی اپنی کوئی سوچ کوئی مرضی نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو اسے اہمیت نہیں دی جاتی۔ مجھے یاد ہے جب فرزانہ باجی کے لئے دانش بھائی کا پروپوزل آیا تھا۔ ابا جی نے پوری چھان بین کی تھی اس کے بعد جب ہامی بھرنے کا مرحلہ آیا تو پتا نہیں کس نے کہا تھا پہلے لڑکی سے پوچھ لیں۔ اس پر ابا جی غضب ناک ہو گئے تھے۔ یوں جیسے انہیں گالی دی گئی ہو۔ جبکہ ابا جی سب سے زیادہ فرزانہ باجی کو چاہتے ہیں اور جب انہوں نے اُن کا خیال نہیں کیا تو میری بھلا کیا اہمیت ہوگی۔

بہرحال یہ ساری باتیں شرمین نہیں جانتی تھی۔ جبھی ہر روز میرے سامنے ایک نیا مشورہ لے کر بیٹھ جاتی

تھی۔ ساتھ ساتھ مجھے جہانگیر سے ملنے پر بھی اُکساتی۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاتی کہ میرا تو اپنا دل سودائی ہے۔ کس کس طرح نہیں پچھتا اور میں ہر رات اسے یہ کہہ کر بہلاتی ہوں کہ کل ضرور جہانگیر کے پاس جاؤں گی۔ پھر دن میں کتنی بار یہ مجھے یاددہانی کراتا ہے لیکن میری ہمت نہیں ہوتی۔ میں کیا کروں۔ اپنی بے بسی اور بے اختیاری پر بھی چپکے سے رولیتی ہوں اور کبھی اُس وقت کو کوستی ہوں جب شرمین کے ساتھ باہر جانے کی ہامی بھری تھی۔

زندگی بری بھلی جیسی بھی تھی سکون سے تو گزر رہی تھی اور اب تو کسی پل چین نہیں تھا۔ اُس شخص میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو پہلی نظر میں ہی نہ صرف اچھا لگا بلکہ میرے ہر خیال پر قابض ہو گیا تھا۔ کتنے دن گزر گئے تھے پھر بھی میرے دل کی راہداریوں میں اُس کے قدموں کی چاپ اُسی طرح گونج رہی تھی اور میں لاشعوری طور پر اُس کی منتظر بھی تھی کہ میری طرف سے مایوس ہو کر وہ پھر خود ہی آجائے گا اور اُس روز جب چوکیدار نے میری ملاقات کا بتایا تو بالکل غیر ارادی طور پر میں نے چونک کر شرمین کو دیکھا اور عاقب وہ میری مسلسل خاموشی سے تنگ آ چکی تھی جبھی منہ بنا کر بولی۔

"کیا ضرورت ہے جانے کی......؟ منع کروا بھیجو۔"

"کسے......؟" میں قصداً انجان بنی۔

"اُسی کو جو تمہاری راہ تکتے تکتے خود چلا آیا ہے۔ کہو تو میں منع کر آؤں کہ آئندہ کبھی یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا......؟"

"نہیں......!" میری بے اختیاری پر وہ ٹھٹک کر کوئی سخت بات کہنے جا رہی تھی کہ اس سے پہلے میں کمرے سے نکل آئی۔ سیڑھیاں اُتر رہی تھی کہ اباجی پر نظر پڑی۔ وہ لان کے آخری گوشے میں کھڑے تھے۔

میرے قدموں کی رفتار آپ ہی آپ سست ہو گئی اور ان تک آتے آتے میں نے کافی حد تک خود پر قابو پا لیا۔

"السلام علیکم اباجی......!"

"جیتی رہو......! ٹھیک تو ہو ناں......؟" انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور جواب سنے بغیر کہنے لگے۔

"بہت کمزور لگ رہی ہو۔ کیا بیمار تھیں......؟"

"نہیں تو......!"

"پھر پڑھتی زیادہ ہو......؟ کیا ضرورت ہے اتنی محنت کرنے کی......؟ بس......! پاس ہو جاؤ۔"

"اماں کیسی ہیں......؟" میں نے اپنی طرف سے اُن کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

"بڑے بھیا اور فرزانہ باجی......؟"

"ہاں......! سب ٹھیک ہیں۔ فرزانہ آئی ہوئی ہے۔ بیٹا ہوا ہے اس کا۔"

"اچھا......!" جتنی مجھے خوشی ہوئی تھی اس حساب سے اباجی کے سامنے اظہار نہیں کر سکی۔

"میں بہت جلدی میں آیا ہوں۔ اس لئے تمہارے لئے کوئی چیز نہیں لا سکا۔" اباجی اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے بولے۔ پھر پانچ سو نکال کر میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"تمہاری اماں کہہ رہی تھیں تمہیں کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ لے لینا اپنے لئے ایک دو سوٹ۔"

"جی میں......؟" میری حیرت فطری تھی۔ یعنی اباجی مجھے کہہ رہے تھے کہ میں خود اپنے لئے سوٹ لے

آؤں۔

"ہاں......! میں نے دیکھا ہے یہاں ہر جگہ لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ تم بھی اپنی کسی سہیلی کے ساتھ چلی جانا۔ اچھا ہے کچھ اس شہر کے طور طریقے سمجھو آخر کو......" وہ جانے کیا کہتے کہتے رُک گئے۔

"آپ کے لئے چائے لاؤں اباجی......؟"

"نہیں......! ابھی مجھے کہیں اور جانا ہے۔ وہیں پی لوں گا۔ اب چلتا ہوں۔" وہ بات کرتے کرتے کھڑے ہو گئے۔

"تم اپنا خیال رکھا کرو۔ بہت کمزور لگ رہی ہو اور پیسے چاہئیں تو لے لو۔"

"نہیں......! بس کافی ہیں۔"

"رکھ لو......!" انہوں نے مزید پانچ سو نکال کر دیئے پھر سوچنے لگے۔

"اور کتنے دن یہاں رہنا ہے......؟"

"ابھی تو پورا ایک سال ہے۔"

"ایک سال......؟ اچھا خیر......! دیکھیں گے۔" انہوں نے جانے کیا سوچ کر کہا۔ میں بالکل نہیں سمجھی پھر ان کے ساتھ چلتی ہوئی گیٹ تک آئی تو انہوں نے جاتے جاتے بھی مجھے احساس دلایا کہ میں بہت کمزور ہو گئی ہوں پھر اپنا خیال رکھنے کی تاکید بھی کی۔

میرے لئے اباجی کا یہ لب ولہجہ اور انداز بالکل نیا تھا جس پر میں حیران ہونے کے ساتھ خوشی بھی محسوس کر رہی تھی کہ کسی بھی طرح سہی اُن کی سوچ میں لچک تو پیدا ہوئی۔ ورنہ تو وہ خصوصاً میرے اور فرزانہ باجی کے معاملے میں بہت سخت گیر رہے تھے۔ واپس اپنے کمرے میں آئی تو شرمین شدت سے میری منتظر تھی اور میں کیونکہ اس وقت اباجی کے بدلتے رویے پر خوش اور مگن سی تھی اس لئے کسی اور طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ جبکہ وہ اپنی سمجھ کے مطابق چھوٹتے ہی بولی۔

"مل آئیں......؟"

"ہاں......!" میں نے بڑے آرام سے کہا اور پرس اُٹھا کر اُس میں اباجی کے دیئے ہوئے پیسے رکھنے لگی۔

"ایسی کیا چیز دی ہے اُس نے جو مجھ سے بھی چھپائی جا رہی ہے......؟" اُس کے مشکوک انداز پر میں چونک گئی۔

"ہائیں......؟ کس کی بات کر رہی ہو......؟"

"اُسی کی جس سے مل کر آ رہی ہو۔" وہ چیخ کر بولی اور میں سلگ گئی۔

"تمیز سے بات کرو......! میرے اباجی آئے تھے۔"

"لاحول ولا......!"

"کیا مطلب......؟ کیا تم میرے اباجی پر 'لاحول' پڑھ رہی ہو......؟" مجھے بے حد غصہ آیا اور وہ ہنسنے لگی۔ پھر اسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔

"تم بھی ایک چیز ہو۔ جانے نہیں کتنے احمق مرے تھے تو تم پیدا ہوئی تھیں۔"

میں نے زور شور سے منہ پھلا لیا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے پاس آگئی اور میرے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر کہنے لگی۔

"کم آن یار...... ! غلطی میری ہے نہ تمہاری۔ میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ جہانگیر آئے ہیں۔ مجھے کیا پتا کہ تم اباجی سے مل کر آ رہی ہو۔ خیر...... ! یہ بتاؤ تمہارے گھر میں سب ٹھیک ہیں ناں......؟"

"ہوں......؟" میں نے پہلے روٹھے پن کا مظاہرہ کیا لیکن پھر اچانک خیال آنے پر چہک کر بولی۔

"پتا ہے فرزانہ باجی کا بیٹا ہوا ہے۔ ایمان سے میں اتنی خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔ دل چاہ رہا ہے اُڑ کر پہنچ جاؤں۔"

"مٹھائی کھلاؤ......!"

"ارے...... ! بہت مٹھائی کھلاؤں گی۔ اباجی بھی آج بہت مہربان تھے۔ پورے ایک ہزار روپے دے گئے ہیں اور پتا ہے یہ بھی کہا ہے کہ اپنے لئے خود خریداری کر لوں۔" میں بڑے جوش میں کہتے کہتے سوچ میں پڑ گئی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا شرمین...... ! کہ اباجی اچانک کیسے بدل گئے......؟"

"وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ ویسے تمہارے حق میں بہتری ہوا۔ اب خدا کے لئے تم بھی اپنے خول سے باہر نکل آؤ۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی تو میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے اور اس کے طویل لیکچر سے بچنے کے لئے میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

○ ○ ○

پھر یہ اباجی کے نرم رویے کا اعجاز تھا کہ اگلے ہی روز میں نے دل کا کہا مان لیا اور جب شرمین کو بتایا تو اُس نے مجھے مزید اُکسایا۔ یوں شام سے کچھ دیر پہلے میں بہت ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر جہانگیر کے گھر تک چلی آئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے والدین آ چکے ہیں یا نہیں۔ بلکہ مجھے سرے سے اُن کا خیال ہی نہیں آیا۔ بس اُسی کا خیال تھا جو اتنے دن گزرنے کے باوجود ایک پل کو بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ بہر حال یہاں تک میں تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئی تھی۔ اس لئے گیٹ کے سامنے رُک کر اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔ پھر بیل پُش کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ گیٹ کھلنے کی آواز پر اُدھر متوجہ ہو گئی۔ اگلے پل جہانگیر باہر نکلا اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایسی چمک لہرائی جیسے مایوسیوں کے گھور اندھیاروں میں اچانک اُمید کی شمعیں جل اُٹھی ہوں۔

"شمع......!" بے اختیاری سی بے اختیاری تھی۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر اندر لے آیا اور اسی بے اختیاری سے میرے کندھے تھام کر بولا۔

"ابھی ابھی میں خود سے یہ عہد کر رہا تھا کہ اگر آج بھی تم نہ آئیں تو میں تمہارا خیال چھوڑ دوں گا۔ تم نے مجھے بڑی آزمائش سے بچا لیا ہے شمع...... ! میں خود سے کیا عہد کبھی نہیں نبھا سکتا تھا۔"

اُس کے جذبوں کی سچائیاں میرے دل کی زمین پر نرم نرم پھوار کی مانند برسنے لگی تھیں۔ بہت آہستگی سے

اپنے کندھوں پر سے اُس کے ہاتھ ہٹا کر غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹتے ہوئے میں بس اسی قدر کہہ سکی۔

"میں آنا چاہتی تھی لیکن......"

"میں تم سے شکوہ نہیں کروں گا۔ میرے لئے یہی بہت ہے کہ تم آ گئی ہو۔ پلیز...... ! بیٹھو ناں......؟"

میں بیٹھی تو خیال آنے پر پوچھا۔

"آپ کے گھر والے نہیں آئے......؟"

"ابھی تک تو نہیں آئے۔ اصل میں بابا کو لاہور بہت پسند ہے اور وہ وہیں سیٹل ہونے کا سوچ رہے ہیں اور بی بی جان روبی کی وجہ سے وہاں رہنا چاہتی ہیں۔ روبی میری بہن ہے۔" میں اس کی بات سن کر خاموش رہی تو اُس نے ملازم کو پکار کر چائے کے لئے کہا پھر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک تو ہو ناں......؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُسی وقت ملازم آ کر اُسے کسی کی آمد کا بتانے لگا اور جب اُس نے اُسے اندر لانے کے لئے کہا تو میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں چلوں گی۔"

"کیوں......؟" وہ حیران ہوا۔

"تم بیٹھو......!" اپنائیت بھرا اصرار تھا۔

میں بیٹھ تو گئی لیکن جانے کیوں میرا دل لرزنے لگا تھا۔ مجھے اپنی ساری احتیاطوں پر پانی پھرتا نظر آیا۔ یوں لگا جیسے آنے والا خاص اسی مقصد سے آیا ہو اور اب سارے زمانے میں منادی کرتا پھرے گا۔

(کیا کروں......؟) اباجی کے خوف سے نکلی تھی کہ یہ نیا خوف۔ حالانکہ وہ جو کوئی بھی تھا میں اُسے جاننا تو دور کی بات کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے یہ صورت حال بہت عجیب سی لگی۔ ایک پل میں میرے ذہن نے جانے کیسی کیسی خوفناک باتیں سوچ لیں اور میں سر جھکا کر خود کو ملامت کرنے لگی جبکہ جہانگیر بڑا پُرجوش تھا۔ اُس سے بغل گیر ہوا پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا اور غالباً بیٹھتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی پھر اس کی شوخ آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"آپ کی تعریف......؟"

"یہ شمع ہیں۔" جہانگیر نے میرے تعارف میں اسی قدر کہا۔

"شمع......!" اس نے جانے کیوں یونہی میرا نام دہرایا پھر مجھے مخاطب کیا۔ میں نے تو کبھی نہ دیکھا بلکہ سر کو کچھ اور جھکا لیا۔ جب اس کی محظوظ آواز سنائی دی۔

"تعارف اُدھورا ہے۔"

"مکمل تعارف وقت آنے پر کراؤں گا۔" جہانگیر نے کہا تو وہ معترض ہوا۔

"نہیں ابھی۔" پھر براہ راست مجھے مخاطب کر کے بولا۔

"چلیں شمع...... ! آپ خود ہی بتا دیں کہ اس نالائق کو کہاں ملیں......؟"

"جی......؟" میں نے بلا ارادہ ذرا سا سر اُونچا کر کے اُسے دیکھا تو جانے کیوں واقعی ایسا تھا یا مجھے محسوس ہوا

کہ اس کی ساری شوخی پل میں رُخصت ہو گئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے میری آنکھوں کی گہرائیوں میں وہ خود کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہا ہو اور ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا.....؟" جہانگیر میری تقلید میں کھڑا ہوا۔

"میں جا رہی ہوں۔" میں نے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل آئی۔ جہانگیر میرے پیچھے بھاگا آیا اور گیٹ پر روک کر پوچھنے لگا۔

"کیا تم خفا ہو کر جا رہی ہو.....؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر کب آؤ گی.....؟"

"میں نہیں..... آپ آئیں گے۔"

"اوہ تھینک یو شیع.....!"

اُس نے طمانیت کا گہرا سانس لیا اور میں اُسے "خدا حافظ" کہہ کر چلی آئی۔ حسب توقع شرمین منتظر تھی۔ دیکھتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن میں نے اُس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اصل میں میرے اپنے حواس ٹھکانے نہیں تھے اور وہ چپ نہیں کیا گئی۔ بے حد ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

"اب کہاں ہمیں لفٹ کراؤ گی.....؟" مجھے افسوس ہوا اور میں اُسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی پھر بھی فوری طور پر اُس کے پیچھے نہیں جا سکی۔ بس بیٹھی کراہتی رہی۔ اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ میں کیوں جہانگیر کے گھر چلی گئی۔ انتظار کر لیتی وہ خود ہی کسی دن آ جاتا۔ گو کہ وہاں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ جیسا وہ خود شائستہ اور مہذب تھا ویسا ہی اس کا دوست بھی تھا۔ پھر بھی اس کی اچانک آمد سے مجھے اپنی پوزیشن آکورڈ سی لگی تھی اور میں اب تک اس بات کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

شام ڈھل کر رات ہو گئی۔ میں بھوک کے باوجود کھانے کے لئے بھی نہیں گئی اور شرمین جانے کہاں رہ گئی تھی۔ مجھ سے کھانے کا پوچھنے تک نہیں آئی۔ یقیناً سنجیدگی سے خفا ہو کر گئی تھی۔ اب مجھے اُس پر غصہ آنے لگا۔ پہلے اس کے پیچھے جانے کا سوچا پھر اپنی سوچ کی نفی کرتے ہوئے منہ سر لپیٹ کر لیٹ گئی۔ کافی دیر غالباً دو گھنٹے کے بعد وہ آئی اور آتے ہی جارحانہ انداز میں میرے سر سے چادر کھینچتے ہوئے بولی۔

"کھانے کے لئے کیوں نہیں آئیں.....؟"

"تم نے بلایا جو نہیں۔" میرے منہ بگلانے پر وہ لال بھبھوکا ہو گئی۔ جیسے ابھی میرا منہ نوچ لے گی۔ ضبط کرتے کرتے بھی میری ٹانگ میں زور سے چٹکی کاٹ کر بولی۔

"کم بخت..... ! صاف کیوں نہیں کہتی کہ اُس کے ہاں سے پیٹ بھر کر آئی تھی.....؟"

"قسم لے لو چائے تک نہیں پی۔"

"ہائیں.....؟ اتنا کنجوس.....؟ لگ تو ایسے رہا تھا جیسے....." غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ جھنجلا کر بولی۔

"آئندہ ایسے کنجوس کے گھر نہیں جانا جو ایک پیالی چائے نہ پوچھے۔"

"کبھی نہیں جاؤں گی۔" میں نے کہا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

"کیوں نہیں جاؤ گی.....؟"

"بس..... ! تم نے منع کر دیا۔ نہیں جاؤں گی۔" میں نے بے نیازی برتنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بھی ایک کائیاں تھی۔ میرے چہرے پر نظریں جما کر بولی۔

"مجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ سچ بتاؤ کیا بات ہوئی ہے.....؟" اور مجھے اُسی سے تو کہنا تھا اور وہ ساری تفصیل سن کر الٹا مجھ پر بگڑنے لگی۔

"تو اس میں اتنا ڈرنے کی کیا بات ہے.....؟ جب آنے والا نہ تو تمہارا چاچا تھا نہ ماما اور نہ سسرالی پھر تم اتنی خائف کیوں ہو۔ بھئی..... ! جہانگیر کا دوست ہی تو تھا اور بقول تمہارے اُسی کی طرح شائستہ اور مہذب پھر خدشہ کس بات کا تھا.....؟"

"پتا نہیں.....!"

"اب میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتی ہوں کہ تم انتہائی ناشکری ہو۔ من آنگن میں چاہتوں کا موسم نرم نرم پھوار لئے اُتر رہا ہے اور تم بجائے اس میں تن من بھگونے کے نامہربان اندیشوں کی آگ میں سلگنا چاہتی ہو.....؟ تمہاری مرضی.....!"

وہ کندھے اچکا کر بولی اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ پر جا لیٹی اور میں نے سوچا وہ ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ میں کیوں ذرا ذرا سی بات کو خود پر اتنا طاری کر لیتی ہوں اور پھر یہ تو کوئی ایسی بات بھی نہیں۔ اگر جہانگیر کے دوست نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا ہے تو میں کیوں پریشان ہو رہی ہوں اور دھیرے دھیرے میں اندیشوں سے نکلی تو من آنگن میں اُترے چاہتوں کے موسم کی جولانیاں عروج پر تھیں۔

زندگی اچانک ہی بہت خوبصورت لگنے لگی تھی۔ جیسا کہ شرمین نے کہا تھا کہ یہ جو وقت ہماری دسترس میں ہے اسے ہم اپنی مرضی سے گزار لیں تو میں بھی ایسا ہی سوچنے لگی تھی۔ اگر کبھی بھولے سے بھی کوئی اندیشہ سر اُبھارتا تو میں فوراً سر جھٹک دیتی۔ یوں میں خاصی مطمئن اور مگن سی رہنے لگی۔ گو کہ میں جہانگیر کے گھر نہ جانے کا تہیہ کر چکی تھی اور یہ بات میں نے جہانگیر سے بھی کہہ دی تھی اور اُس نے برا نہیں مانا بلکہ اُسے بھی میری احتیاط پسندی پر محمول کر کے قائل ہو گیا اور خود ہی کسی شام چلا آتا۔ اس کے آنے کا کوئی دن مقرر نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایسا فارغ تھا کہ روز روز چلا آتا۔ اس روز جب میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ پھر کب آئیں گے تو وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"یہ نہیں بتاؤں گا۔"

"کیوں.....؟" میں نے روٹھنے والے انداز میں استفسار کیا تو اس نے کہا تھا۔

"مجھے اچانک سامنے پا کر تمہاری آنکھوں میں جو قندیلیں ایک پل کو جگمگاتی ہیں۔ میں اس ایک پل کو کھونا نہیں چاہتا۔" اور میں نے اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں نے بس یونہی پوچھ لیا ورنہ میں خود انتظار کے ان کیف آگیں لمحات کو کھونا نہیں چاہتی جن میں ہر پل اُس کے آنے کا گمان رہتا ہے۔

○ ○ ○

اُن دنوں موسم عجیب سا ہو رہا تھا۔ دوپہر میں گرمی اور حبس رہتا شام میں البتہ ہوا چلنے لگتی تھی۔ اُس وقت

میں آخری کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد ہاسٹل کی طرف آ رہی تھی۔ تیز دھوپ سے بچنے کی خاطر میں بہت تیز تیز چل رہی تھی تاکہ جلد از جلد سائے میں پہنچ سکوں۔ برآمدے تک آئی ہی تھی کہ گیٹ کے پاس کھڑے جہانگیر پر نظر پڑ گئی۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ اس وقت تو وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ میں نے وہیں سے اُسے ویٹنگ روم میں جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی اُسی طرف آ گئی۔

''خیریت......؟''

''میں سامنے موجود ہوں پھر کس کی خیریت پوچھ رہی ہو......؟'' اس نے مسکراہٹ ہونٹوں پر دبا کر کہا تو میں نے قدرے سٹپٹا کر وضاحت کی۔

''میرا مطلب ہے آپ اس وقت کیسے آئے......؟''

''تم سے ملنے۔'' وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا اور جب مجھے اُلجھتے دیکھا تو کہنے لگا۔

''میں آج شام لاہور جا رہا ہوں بی بی جان کو لینے۔ بابا کا فی الحال آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لئے میں نے سوچا بی بی جان کو ہی لے آؤں۔ وہ آئیں گی تب ہی تو میری نیّا پار لگے گی۔''

میں بے دھیانی میں اُسی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ یوں بھی اس کی سن رہی تھی اور وہ آخر میں میری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

''اب تم جلدی سے یہ بتا دو کہ بی بی جان کو تمہارے ہاں کب بھیجوں......؟''

میں نے جلدی سے نظروں کا زاویہ بدل لیا اور آہستہ سے بولی۔

''مجھے نہیں پتا۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں انہیں لاہور سے سیدھا تمہارے گھر لے جاؤں گا۔''

''نہیں......!'' میں نے سٹپٹا کر اُسے دیکھا۔ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ مزید شوخ ہو کر بولا۔

''کیا نہیں......؟''

''آپ مجھے کنفیوز کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس پڑا۔ قدرے توقف سے سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

''اچھا ٹھیک ہے......! میں بی بی جان کو لے آؤں پھر طے کریں گے اور تم سن لو میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔ یوں بھی تمہارے امتحانوں میں تین چار مہینے ہیں۔ بات بننے میں اتنا عرصہ لگ ہی جائے گا۔ میں چاہتا ہوں امتحانوں کے فوراً بعد تمہیں اپنے گھر لے آؤں۔'' اس کی بے باک صاف گوئی مجھے بری طرح نروس کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد وہ مجھ ہی سے پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ناں......؟'' میں خاموش رہی۔ کپ رکھتے ہوئے بولا۔

''او کے......؟ چلتا ہوں۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا کہ شام میں لاہور جا رہا ہوں۔ گو کہ میرا ارادہ تین چار روز سے زیادہ رکنے کا نہیں ہے لیکن کوئی کام بھی نکل سکتا ہے اور ایسی صورت میں اتنے ہی دن مزید لگ سکتے ہیں لہٰذا تم نہ تو پریشان ہونا اور نہ میری طرف سے بدگمان۔ سمجھیں......؟'' میں نے بمشکل ذرا سی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ مجھے محبتوں کے راستوں سے آشنائی دے کر اب منزل قریب ہونے کی نوید دے کر جا رہا تھا۔ میری نظروں نے اوجھل ہونے تک اس کا تعاقب کیا پھر میں اوپر چلی آئی۔

شرمین پنکھا فل اسپیڈ میں کھولے بڑے فری اسٹائل میں دونوں بازو اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے بہانہ چاہئے تھا۔ ہنسی میرے اندر پھوٹ رہی تھی اُسے دیکھ کر قہقہے کی صورت ہونٹوں سے آزاد ہوئی تو وہ گھور کر بولی۔

''پسینہ سکھا رہی ہوں اور تم یہ کہاں رہ گئی تھیں......؟''

''جہانگیر آئے تھے۔ اُن سے بات کر رہی تھی۔''

''کیا......؟'' وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اتنی گرمی میں بھی اُسے چین نہیں ہے......؟ شام کا انتظار کر لیتا......؟''

''شام میں وہ لاہور جا رہے ہیں اور یہی بتانے آئے تھے۔''

''چلو...... چھٹی ہوئی۔'' وہ دوبارہ لیٹ گئی اور میں ''کیا مطلب'' کہتے کہتے رہ گئی۔ محض اس خیال سے کہ کہیں وہ بے سروپا باتیں نہ شروع کر دے اور میں اس وقت بہت خوش گوار موڈ میں تھی۔ اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر آئی۔ اُس سے کھانے کا پوچھا اور اس کے منع کرنے پر میں بھی ڈائننگ ہال جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے لیٹ گئی۔

''اگر تم میری وجہ سے کھانا چھوڑ رہی ہو تو چلو چلتی ہوں۔'' وہ مجھے لیٹتے دیکھ کر بولی۔

''نہیں......! بھوک نہیں ہے۔''

''اچھا سنو......! شام میں بازار چلو گی......؟''

''آں...... ہاں......!'' میں نے سوچ کر ہامی بھری اور اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ پھر ہم دونوں بس دو گھنٹے ہی سوئے اور اُٹھتے ہی بازار جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ گو کہ ابھی صرف چار بجے تھے۔ دھوپ میں بھی شدت باقی تھی لیکن شرمین کو کیونکہ ایک ایک دُکان کھنگالنے کی عادت تھی اس لئے وہ اسی وقت چلنے پر بضد تھی تاکہ شام تک واپسی ہو سکے۔ ورنہ دوسری صورت میں رات ہونے کا اندیشہ تھا اور اتنی دیر تک ہمیں باہر رہنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ بہرحال اس معاملے میں میں ایک طرح سے اس کی بات ماننے کی پابند تھی۔ لہٰذا بغیر چوں چرا کے اس کے ساتھ چل پڑی۔ ایک تو قریبی مارکیٹ بھی کافی دور تھی جانے آنے میں بھی وقت لگتا تھا۔

حسب عادت اس نے ایک کے بعد ایک دُکان میں جھانکنا شروع کر دیا اور میں چونکہ پہلے بھی ایک دو بار اس کے ساتھ آ چکی تھی اور اس کی عادت سے واقف تھی اس لئے جہاں وہ دُکاندار سے بات شروع کرتی میں اطمینان سے کنارے کھڑی ہو جاتی۔ پہلے مرحلے پر تو اس نے اپنی مطلوبہ اشیاء کو ہر دُکان پر پرکھا جبکہ اس دوران میں نے دو سوٹ، چپل اور دوسری چھوٹی موٹی اشیاء خرید لیں۔ اس کے بعد اس کے خریدنے کا مرحلہ آیا جو میں نے بڑے صبر اور سکون سے طے کیا۔ غالباً صبر اور سکون کا مظاہرہ میری مجبوری تھی ورنہ اگر میں اس کی طرح اتنی بولڈ ہوتی تو اپنی خریداری چھوڑ کر چلی آتی۔ خیر خدا خدا کر کے اس کی خریداری مکمل ہوئی تو لوگوں کے ہجوم سے نکل کر میں نے صحیح سکون کا سانس لیا۔

''رکشہ کر لیتے ہیں...... بس میں کہاں یہ چیزیں سنبھالیں گے۔'' میں نے کہا تو وہ پہلے دن کا واقعہ یاد کر کے ہنستے ہوئے بولی۔

"تمہارے ساتھ واقعی مسئلہ ہے۔ چادر تک تو سنبھالی نہیں جاتی تم سے..... ویسے میرا خیال ہے چادر کو چاردیواری تک جانے کا شارٹ کٹ کہنا چاہئے۔"

"بکومت.....!" مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔

"کل سے میں بھی چادر اوڑھوں گی بلکہ غلطی ہو گئی ابھی اوڑھ کر آنی چاہئے تھی۔ کیا پتا آج میرا نصیب جاگ جاتا۔" کم بخت کو سرِ راہ کھڑے ہونے کا بھی خیال نہیں تھا۔ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

"وہ کہتا آپ کی چادر... میں کہتی ہوا میں اُڑ گئی۔ وہ کہتا میرے ساتھ چلو، چادر ہی نہیں چاردیواری بھی دوں گا۔ میں کہتی شکل دیکھی ہے لنگور.....؟"

میرا ہنستے ہنستے برا حال تھا اور وہ باقاعدہ ڈائیلاگ بول رہی تھی۔

"وہ کہتا لنگور سہی پہلو میں حور کی خواہش رکھتا ہوں۔ میں کہتی....."

اُسی وقت وائٹ کرولا ہمارے بالکل قریب آن رکی اور وہ شیشے سے اندر جھانک کر غالباً صلواتیں سنانا چاہتی تھی لیکن پھر فوراً میری طرف پلٹ کر بولی۔

"تمہارے جہانگیر صاحب ہیں آجاؤ.....!" اور اگر صرف جہانگیر ہوتا تو شاید میں منع نہ کرتی لیکن اس کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا وہی دوست تھا جسے میں نے اس کے گھر میں دیکھا تھا۔ جب ہی شرمین کو اشارے سے منع کیا۔ اسی اثناء میں جہانگیر نے پچھلا دروازہ کھول دیا اور وہ میرا اشارہ سمجھ گئی تھی پھر بھی میری ماننے کے بجائے اپنے شاپنگ بیگز گاڑی میں رکھتے ہوئے بولی۔

"آجاؤ.....! یہ اُسی طرف تو جا رہے ہیں۔ ہمیں بھی چھوڑ دیں گے۔" میں اندر ہی اندر جھنجھلائی اور اسے گالیاں دیتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"آپ تو غالباً لاہور جا رہے تھے.....؟" وہ ہرگز خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کے ساتھ ہی اس کی زبان بھی اسٹارٹ ہو گئی۔

"بالکل جا رہا ہوں۔" جواب دیتے ہوئے جہانگیر نے جس انداز سے پہلو بدلا میں سمجھ گئی وہ ہماری طرف رُخ موڑے گا اور میں جو پوری جان سے اس کی طرف متوجہ اُسے ہی دیکھ رہی تھی، خود کو قدرے لاتعلق ظاہر کرنے کی خاطر جیسے ہی نظروں کا زاویہ بدلا وہ یو مرر سے جھانکتی آنکھوں نے لمحہ بھر کو مجھے سُن کر دیا۔ پہلی بار بھی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ خود کو میری آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنے سے بچانے کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہا ہو اور اب بھی خود پر ضبط کی ناکام سی کوشش تھی۔ میں نے اندر ہی اندر سہم کر سر کو جھکا لیا اور چادر پیشانی سے آگے تک کھینچ کر گویا اس سے چھپنے کی کوشش کی۔ جانے کیوں مجھے کھوجتی ہوئی نظروں سے ڈر لگتا تھا۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا.....؟" شرمین اب براہِ راست اس سے مخاطب تھی۔

"خاکسار کو معظم جاہ کہتے ہیں۔" اس کی آواز کا بوجھل پن پتا نہیں کسی اور کو کیوں نہیں محسوس ہوا۔

"صرف نام بتا دینے سے تعارف مکمل نہیں ہو جاتا۔" شرمین نے کہا تو جواب میں جہانگیر بول پڑا۔

"اس کا بقیہ تعارف میں اپنے حوالے سے کرواتا ہوں۔ ہماری دوستی کالج کے زمانے سے ہے۔ اسی

وقت سے یہ بہت آرٹسٹک مائنڈ تھا۔ یونیورسٹی جانے تک اس نے ایک خیالی پیکر تراش لیا اس کے بعد اب تک اسی کی تلاش میں ہے۔"

"ہوں نہیں، تھا۔" موڑ کاٹتے ہوئے اس نے تصحیح کی تو جہانگیر اُچھل پڑا۔

"یعنی تمہیں آئیڈیل مل گیا اور تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ مجھے آئیڈیل مل گیا۔" اس کا لہجہ شاکی تھا۔

"پھر.....؟"

"بس.....! پاپا کے اصرار سے مجبور ہو کر میں نے تلاش چھوڑ دی۔ ابھی کچھ روز پہلے ہی تو پاپا نے اپنے دوست کی بیٹی سے میری نسبت طے کی ہے۔" اپنے بارے میں وہ خود ہی بتانے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے صرف جہانگیر سے بات کر رہا ہو۔ میری اور شرمین کی موجودگی کا اگر اسے احساس تھا بھی تو بھی بظاہر نظر انداز کر رہا تھا اور میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھی نہ ہی مجھے اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی تھی لیکن کیونکہ صرف وہ بول رہا تھا اس لئے مجبوراً سننا پڑ رہا تھا۔

"چ چ.....!" اس کی ساری بات سن کر شرمین نے پہلے تاسف کا اظہار کیا پھر غالباً اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی۔

"ویسے آپ نے اچھا کیا جو اپنے پاپا کی بات مان لی کیونکہ آئیڈیل کبھی نہیں ملتے۔"

"ہا..... آں.....! لیکن زندگی کے کسی موڑ پر نظر ضرور آ جاتے ہیں اور اس وقت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ جیسے میری نظروں نے اب اس مقام پر اسے کھوجا جب میں اس کی تلاش سے دستبردار ہو کر پاپا کو سارے اختیار سونپ چکا ہوں اور وہ میری زندگی کا ساتھی منتخب بھی کر چکے ہیں۔ گو کہ میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ عجیب بات بلکہ ایسے کہنا چاہئے یہ ہے کہ جب تک میری نظروں نے اُسے نہیں دیکھا تھا میں مایوس نہیں ہوا اور جب دیکھ لیا تو مایوسی ہی مایوسی۔" اس کے ٹوٹتے لہجے پر ایک لمحہ کو مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی لیکن پھر فوراً سر جھٹک دیا۔

"اس کا مطلب ہے تم نے اُسے کسی اور کے ساتھ دیکھا ہے.....؟" جہانگیر نے بجھ کر پوچھا تو اس نے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلا دیا اور مجھے جانے کیوں اس موضوع سے اُلجھن ہونے لگی اور محض کوئی دوسرا موضوع چھیڑنے کی خاطر میں نے بولنے کا ارادہ کیا اور جب بولی تو جانے کیسے اُسے ہی مخاطب کر کے پوچھ گئی۔

"آپ نے اُسے دیکھا ہے.....؟"

"کسے.....؟" اس نے چونک کر مرر میں مجھے دیکھا تو میں نے شپٹا کر دوبارہ سر جھکا لیا۔ تب وہ خود ہی کہنے لگا۔

"غالباً آپ اس لڑکی کی بات کر رہی ہیں جس سے پاپا میری نسبت ٹھہرا آئے ہیں۔ جی نہیں.....! میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ ویسے وہ آپ کی ہم نام ہے۔" میں نے بے ساختہ بتایا جبکہ جہانگیر نے خوشگوار حیرت میں گھر کر غیر یقینی کا اظہار بھی کیا۔

"واقعی.....! کیا نام ہے.....؟"

"شمع.....! شمع علی احمد۔"

کاش......! وہ صرف شمع کہنے پر اکتفا کرتا۔ علی احمد کا اضافہ کر کے تو اس نے مجھے بیچ چوراہے پر لا پٹخا تھا۔

اچانک گم صم ہو کر میں نے شرمین کو دیکھا وہ بھی کچھ ٹھٹکا گئی تھی۔ پھر بھی اس نے آنکھوں سے مجھے حوصلہ دینے کی کوشش کی لیکن میں کسی طرح بھی خود کو نہیں سنبھال پائی۔ میرے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے جبکہ ہاتھ پیر سن اور آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے ناچنے لگے اور یقیناً میری رنگت پیلی پڑ گئی تھی جب ہی شرمین نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر زور سے دبائے اور کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

"کہاں رہتی ہے وہ......؟"

"خان پور......!"

اب کہاں کسی شک اور شبے کی گنجائش رہ گئی تھی یعنی میں "شمع علی احمد" اس شخص کے ساتھ منسوب کر دی گئی تھی اور مجھے خبر ہی نہیں تھی اور بے خبر تو وہ دونوں بھی تھے جب ہی تو وہ ابا جی کے بارے میں بتا رہا تھا اور جہانگیر بڑے سکون سے سن رہا تھا۔ بس ایک نظر میں نے ان دونوں پر ایک ساتھ ڈالی اس کے بعد آنسو میری آنکھوں سے اس روانی سے اتر کر چھلکے کہ مجھے بند باندھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اچھا ہوا کہ ہاسٹل آ گیا اور میں نے جہانگیر کا خیال بھی نہیں کیا فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتری اور تیز قدموں سے گیٹ پار کر آئی۔

"شمع......! سنو شمع......!" جہانگیر پکار رہا تھا لیکن اس وقت میرے لئے رکنا ممکن نہیں تھا۔ کمرے میں آتے ہی میں بیڈ پر گری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد شرمین آئی تو بہت خاموشی سے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ غالباً میری زندگی کے اس موڑ نے اسے بھی ششدر کر دیا تھا۔ جب ہی تو ایک دم خاموش ہو گئی تھی ورنہ آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں کبھی ڈانٹ کر کبھی پیار سے اور آخر میں دھونس جما کر مجھے چپ کراتی اور پھر بیٹھے بیٹھے ایک سو ایک مشورے دے ڈالتی۔ لیکن معاملہ کچھ اتنا پیچیدہ تھا کہ اس کا ذہن بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ میں رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ کتنی دیر بعد شرمین گلاس میں پانی لے کر آئی اور آہستگی سے میرا کندھا ہلا کر بولی۔

"بس کرو شمع......! مجھے سچ مچ تمہارے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ لو پانی پیو......!" پھر اس نے زبردستی مجھے اٹھا کر گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا تو ایک گھونٹ لے کر میں نے منہ موڑ لیا۔

"اب رونا نہیں ورنہ میں تم سے زیادہ روؤں گی۔ چلو اٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤ میں کینٹین سے چائے لے کر آتی ہوں۔"

اس نے اپنے ساتھ مجھے بھی کھڑا کیا غالباً اس خیال سے کہ کہیں میں دوبارہ نہ لیٹ جاؤں اور جاتے جاتے مجھے واش روم میں دھکیل گئی۔ میرا پورا وجود سلگ رہا تھا۔ آنکھوں میں تو جیسے کسی نے انگارے بھر دیئے تھے۔ مسلسل ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے کے باوجود جلن کم نہیں ہو رہی تھی۔ شرمین چائے لے کر آ گئی اور مجھے پکارا تو میں تولیے سے منہ صاف کئے بغیر آ گئی۔ اس نے ایک نظر میرے بھیگے چہرے پر ڈالی پھر ایک مگ مجھے تھما کر اپنی جگہ پر جا بیٹھی اور بہت خاموشی سے چائے پینے لگی۔ مجھے اس کی خاموشی کھلنے لگی لیکن میں نے ٹوکا نہیں۔ وقفے وقفے سے کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ پھر چائے ختم کر کے کھڑی ہوئی تو مجھے دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی۔ میں بالکل نہیں ہنسی تب گہری سانس لے کر بولی۔

"اب میرا ذہن بیدار ہونے لگا ہے۔ آؤ کچھ دیر کھلی ہوا میں ٹہلتے ہیں فریش ہو جائیں گے تو پھر اطمینان اور سکون سے تمہارے مسئلے کا حل سوچیں گے۔" میری آنکھوں میں پھر پانی اتر آیا تو فوراً ٹوک کر بولی۔

"اب اگر روؤ گی تو میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں گی......سمجھیں تم......؟"

میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں اور اس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ سرمئی شام اپنے جلو میں بے پناہ اداسیاں لئے رخصت ہو رہی تھی۔ ہم دونوں آہستہ روی سے لان کے آخری سرے تک چلے گئے۔ واپسی کے لئے قدم موڑے تو تاریکی پر پھیلا چکی تھی۔ پھر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہم نے کتنے چکر لگا ڈالے۔ اس دوران وہ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی۔ پہلے میں نے مجبوراً اس کی باتیں سنیں پھر آپ ہی آپ میرا دھیان بٹ گیا۔

"بس......! اب کمرے میں چلو......! تھک گئی ہوں۔" میں واقعی تھک گئی تھی۔ مزید چلنے سے معذوری ظاہر کی۔

"چلو......! پہلے کھانا کھا لیں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے اور پلیز......! اصرار نہیں کرنا۔" میں نے عاجزی سے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"ٹھیک ہے......! تم اوپر جاؤ......! میں کھانا کھا کر آ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے......!" میں جلدی سے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ آخری سیڑھی پر قدم تھا کہ حرا مجھے دیکھ کر چلائی۔

"شمع......! جلدی جاؤ......! تمہارا فون ہے۔"

"میرا فون......؟" میں بھاگتی ہوئی آئی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے ٹیبل پر رکھا ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا تو دوسری طرف پتا نہیں کون تھا۔

"سوری......! میں نے آپ کو زحمت دی۔" کچھ مانوس کچھ اجنبی سی آواز اور وہ ہرگز بھی کسوٹی کھیلنے کے موڈ میں نہیں تھی جب ہی فوراً پوچھ ڈالا۔

"آپ کون......؟"

"کیا واقعی آپ نے نہیں پہچانا......؟" وہ شاید اپنے آپ پر ہنسا تھا اور میں الجھ کر بولی۔

"نہیں......! میرا خیال ہے آپ نے غلط نمبر رنگ کیا ہے یا شاید میں غلط آ گئی ہوں۔"

"تو کیا آپ شمع نہیں ہیں......؟" گویا نہ اس نے غلط رنگ کیا تھا اور نہ میں غلط آئی تھی جب ہی مجھے کہنا پڑا۔

"جی......! میں ہی شمع علی احمد ہوں......فرمایئے......!"

"شمع......علی......احمد......!" اس نے رک رک کر میرا نام دہرایا اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر کریڈل پر ہاتھ مار کر پوچھا۔

"ہیلو......! آپ کون ہیں......؟"

"سوری......! میں نے آپ کو زحمت دی۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا تو میں جھنجھلا گئی۔

"عجیب بدتمیز آدمی ہے۔" میں نے ریسیور پٹخا اور بڑبڑانے کے انداز میں اُسے مزید گالیاں دیتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ لائٹ اور پنکھے کے بٹن ایک ساتھ آن کئے پھر بیڈ کی چادر ٹھیک کر رہی تھی کہ ثمر میں آ گئی۔

"لو......! یہ برگر کھا لو......! بھوک لگے گی تو کھا لینا۔"

"شکریہ......!" میں نے اس کے ہاتھ سے پیک برگر لے کر رکھ دیا۔ پھر حسب عادت پیر دھو کر آئی اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر تولیے سے اچھی طرح صاف کر رہی تھی کہ وہ کہنے لگی۔

"دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے تمہارے پیر ضرور دُھلیں گے۔"

"اماں کہتی ہیں پیر صاف رکھنے سے ذہن تیز ہوتا ہے۔"

"ہاہا......!" وہ بے ساختہ ہنسی۔

"کیوں......؟ کیا غلط ہے......؟" میں نے بڑی سادگی سے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ ہنسی روک کر بولی۔

"نہیں......! بلکہ میں نے بھی کہیں پڑھا ہے۔"

"پھر تم ہنسیں کیوں......؟"

"ہاہا......! یعنی پیر دھو کر بھی تمہیں میری ہنسی سمجھ میں نہیں آئی......؟"

اب کے اس کی ہنسی میں میری جھینپی جھینپی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔ پھر میں نے تولیہ ایک طرف رکھ دیا اور پیروں پر کولڈ کریم لگانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے لیٹ گئی۔

"کیا سو رہی ہو......؟" اس نے تعجب سے پوچھا اور میرے نفی میں سر ہلانے پر کہنے لگی۔

"ہاں......! ابھی نہیں سونا۔ ابھی تو ہمیں بہت ساری باتیں کرنی ہیں اور سنو......! ذرا اپنے آنسوؤں کو روک کر رکھنا۔ مجھے تمہارے رونے سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ ویسے بھی رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ سمجھ رہی ہو ناں......؟"

"ہوں......!" میں نے یونہی سر ہلا دیا تو اس نے اُٹھ کر پہلے لائٹ آف کی پھر پردے ہٹا کر کھڑکی کھولی تو دور سے آتی روشنی سے اتنا ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو بلکہ کمرے میں ہر شے کو با آسانی دیکھ سکتے تھے۔

"ہاں......! اب بتاؤ......! تم کیا چاہتی ہو......؟" اس نے اپنی جگہ بیٹھتے ہی مجھ سے یوں پوچھا جیسے واقعی جو میں چاہوں گی وہی ہو گا جبکہ میں بے حد مایوس تھی۔

"دیکھو ثمر میں......! میں تمہیں پہلے بھی بارہا بتا چکی ہوں کہ ہمارے ہاں لڑکیوں کی سوچ اور ان کی مرضی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور اب تم نے دیکھ بھی لیا ہے کہ ابا جی نے مجھ سے پوچھنا تو دور کی بات میرے علم تک میں لانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور میری زندگی کا فیصلہ کر دیا۔ اب اس مقام پر تم یہی کہو گی ناں کہ میں ابا جی کے فیصلے کے خلاف احتجاج کروں......؟ تو میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"کیوں......؟ کیوں نہیں کر سکتیں......؟" پہلے ہی مرحلے پر اس کا انداز جارحانہ تھا اور میرے لہجے میں بے پناہ عاجزی سمٹ آئی۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ بس......! اس بحث کو چھوڑ دو اور مجھے کوئی اور راستہ بتاؤ......! میں کیا کروں......؟"

معظم جاہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تب تو میں اپنی محبت کو اندر کہیں دفن کر کے اس کے ساتھ کمپرومائز کر سکتی تھی۔"

"ہاں......! سارا مسئلہ تو یہی ہے کہ معظم جاہ سب جانتے ہیں۔" وہ میری بات سمجھ کر بولی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔

"ویسے یہ بھی اچھا ہوا کہ ابھی معلوم ہو گیا ورنہ فلمی چویشن پیدا ہو جاتی۔ یعنی شادی کی رات جب وہ تمہارا گھونگھٹ اُٹھاتا تو...... خیر چھوڑو اور اب تم میرا مشورہ مانو تو جہانگیر کے آنے سے پہلے پہلے معظم جاہ سے مل لو اور اُسے بتاؤ کہ تم ہی شیخ علی احمد ہو اور یہ کہ تم اس سے شادی نہیں کر سکتیں۔"

"میں......؟ میرا مطلب ہے میں معظم جاہ کے پاس جاؤں......؟"

"نہیں......! اپنے فرشتوں کو بھیج دو......؟" وہ چڑ کر بولی۔

"پاگل لڑکی......! اپنے گھر میں تم احتجاج نہیں کر سکتیں ابھی اگر اس کے پاس نہیں جاؤ گی تو پھر ڈولی میں بیٹھ کر جانا پڑے گا اور یہ بھی سوچ لو وہاں تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

"میں جانتی ہوں لیکن پلیز......! تم اس طرح ڈانٹ کر تو بات نہیں کرو۔" میں روہانسی ہو کر بولی۔

"میری جان......! میں کیا کروں......؟ پیار سے کی ہوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔" اس نے لہجے کو حد درجہ ملائم بنا کر کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔

"میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری جگہ تم معظم جاہ کے پاس چلی جاؤ بلکہ میرا خیال ہے تم ہی جاؤ۔ کیونکہ میں تو بہت جلدی نروس ہو جاتی ہوں جبکہ تم آرام سے بات کر لو گی۔"

"جی نہیں......! تمہیں خود جانا چاہئے۔" اس نے منع کیا پھر سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"زندگی میں تو جانے کیسے کیسے امتحانوں سے واسطہ پڑتا ہے اور میں ہمیشہ تو تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ اس لئے تم خود فیس کرنا سیکھو۔ یوں بھی تمہیں معظم جاہ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی۔ بندہ خاصا جینئس نظر آتا ہے۔ تمہیں صرف اپنا مکمل تعارف کروانا پڑے گا اس کے بعد ساری بات وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔"

"لیکن مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔" مجھے اچانک اس کی آنکھوں کے مختلف رنگ یاد آئے۔

"کم آن یار......! اتنا تو وہ ہینڈسم ہے۔ کم از کم ایسی باتیں کر کے اس کی توہین تو نہ کرو۔ بس......! اب تمہیں ہی جانا ہے۔"

آخر میں اس نے حتمی انداز اختیار کیا اور میں نے ایک نیا عذر تراش لیا۔

"مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں رہتا ہے......؟"

"میں اس کا سارا اتا پتا معلوم کر لوں گی...... فکر نہیں کرو اور اب خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو...... شب بخیر......!"

وہ جلدی سے بات ختم کر کے میری طرف سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور میں کچھ دیر تک یونہی بیٹھی رہی پھر تکیے پر سر رکھا تو ساری باتیں نئے سرے سے سوچنے لگی تھی۔

○○○

پلازہ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بیچ بیچ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔ جبکہ چہرے سے بھاپ نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی بار سوچا سیڑھیوں سے واپس پلٹ جاؤں لیکن اس میں بھی نقصان سراسر میرا ہی تھا۔ کم بخت شرمین بھی دھوکا دے گئی تھی۔ مجھے نیچے ہی چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ کتنی خوشامد کی تھی میں نے کہ کم از کم آفس تک تو پہنچا دو لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ کتنے آرام سے کہہ گئی تھی اب تم جانو تمہارا کام۔ بقیہ سیڑھیاں میں نے شرمین کو گالیاں دیتے ہوئے طے کیں۔ پھر آفس کے سامنے رُک کر اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے جلدی جلدی سوچ ڈالا کہ مجھے معظم جاہ سے کیا کہنا ہے۔

"جی بی بی......!" چوکیدار نے مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر متوجہ کیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"معظم جاہ ہیں......؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے جلدی سے بیگ میں سے کاغذ قلم نکال کر اپنا پورا نام لکھا اور اس کی طرف بڑھا کر کہا کہ اپنے صاحب کو دے آؤ۔ وہ میرے ہاتھ سے کاغذ لے کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد واپس آ کر مجھے اندر جانے کے لئے کہا لیکن میرے قدم جیسے فرش کے ساتھ چپک گئے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر ایک طرح سے خود کو گھسیٹا۔ چوکیدار میرے پیچھے تھا۔ پہلے کمرے سے گزر کر اگلا دروازہ اس نے بڑھ کر کھولا تو سامنے ہی معظم جاہ پر نظر پڑی۔ اول روز بھی میں اسے دیکھ کر کچھ خوفزدہ سی ہو گئی تھی اور اب بھی سہمے جا رہی تھی۔ وہ مصروف نہیں تھا لیکن مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جی......! شیخ علی احمد......!" میری موجودگی کا احساس کر کے اس نے سر اونچا کیا تو نظریں براہ راست میرے چہرے پر پڑیں اور ٹھہرے بنا دھیرے دھیرے میرے پورے سراپے پر پھسلتی چلی گئیں۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میرا خیال بلکہ یقین تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکے گا لیکن وہ نہ چونکا نہ ٹھٹکا بس کچھ سوچتا ہوا سا انداز تھا۔

"تشریف رکھیں......!" اس کے ہاتھ میں پین تھا اسی سے اس نے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں خاصے تکلف سے بیٹھ گئی۔ تب غالباً اس نے رسماً پوچھا۔

"کیسی ہیں آپ......؟" "جی" کہنا تو دور کی بات میں ذرا سا سر تک نہیں ہلا سکی۔ تب اس نے انٹرکام پر پہلے چائے کے لئے کہا پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

"پلیز......! آپ ریلیکس ہو کر بیٹھیں۔ کیا کوئی اور بھی ہے آپ کے ساتھ......؟"

"نہیں......!"

"سوری......! میں بھول گیا تھا۔ جہانگیر تو لاہور گیا ہوا ہے۔" اس نے غالباً میرے اور جہانگیر کے تعلق کو جتایا۔ تب میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"اگر جہانگیر یہاں ہوتے تب بھی میں ان کے ساتھ نہ آتی۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ کتنی دیر گزر گئی۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا وہ چیئر کی بیک سے سر ٹکائے سامنے دیوار کی آخری حدوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ بھنورا آنکھوں میں جانے کن سوچوں کی

پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں جبکہ چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ پتا نہیں وہ واقعی کسی الجھن میں تھا یا محض پوز کر رہا تھا۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جب ہی میں نے سوچا کہ مجھے اس طرح خاموش نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔ جلدی سے اپنی بات کہہ کر چلی جاؤں تو اچھا ہے۔

"معظم جاہ......!" اسے متوجہ کرنے کی خاطر میں نے دھیرے سے پکارا تو اس کی نظریں دیوار سے ہٹ کر مجھ پر آ ٹھہریں۔

"میں آپ کے پاس اس لئے آئی تھی کہ......"

"میں جانتا ہوں۔" کس قدر سپاٹ لہجہ تھا اس کا۔ میں بے خیالی میں اسے دیکھے گئی۔ اسی وقت ملازم چائے لے کر آ گیا تو وہ سیدھا ہو بیٹھا اور ملازم کے جاتے ہی پوری ٹرے میرے سامنے کھسکا دی۔ گویا چائے مجھے بنانی تھی۔ میں نے کپ سیدھے کئے اور چینی کے لئے اس کی طرف دیکھا تو وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولا۔

"جتنی چاہیں ڈال دیں۔"

"جتنی......؟" بے اختیار حیرت کا اظہار کیا لیکن پھر فوراً سنبھل گئی اور جلدی سے چائے بنا کر ایک کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تھینک یو......!" اس نے فوراً کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور دو تین سپ ایک ساتھ لینے کے بعد پوچھنے لگا۔

"آپ کیا کہہ رہی تھیں......؟"

"آپ جانتے ہیں...... میرا مطلب ہے......" میں قصداً خاموش ہو گئی۔

"ہاں......! میں جانتا ہوں اور آپ بھی جان لیں شیخ علی احمد......! کہ برسوں پہلے میرے تصور نے جو پیکر تراشا تھا اسے میری نظروں نے آپ کے روپ میں دیکھا ہے۔"

وہ یہ انکشاف کرتے ہوئے خوش نہیں تھا۔ بے حد آزردہ تھا جبکہ میں سناٹے میں آ چکی تھی۔

"ہر نقش، ہر رنگ، ہر زاویہ۔ کہیں ذرہ برابر بھی تو فرق نہیں ہے۔ برسوں میں نے اس پیکر سے باتیں کی ہیں اور بڑی شدتوں سے خدا سے مانگتا رہا۔ میرے جذبوں میں کہیں کوئی کھوٹ نہیں تھی جب ہی تو میرا یقین بھی ٹوٹا نہیں۔ ابھی کچھ ماہ پہلے جب پاپا کی ضد سے مجبور ہو کر میں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈالے تو یقین کریں سب سے پہلے میں نے خود کو الزام دیا۔ اس کے بعد جب آپ کو جہانگیر کے ساتھ دیکھا تو اوپر والے سے شکوہ کیا۔ حالانکہ مجھے اس سے شاکی ہونے کا حق نہیں تھا کیونکہ وہ تو میرے نصیب میں وہی لکھ چکا تھا جو میں نے مانگا تھا۔ میں ہی بے خبر تھا اور خبر ہونے کے بعد سے اب تک یہی سوچ رہا ہوں کہ اب کسے الزام دوں......؟" اس نے اچانک میری آنکھوں میں دیکھا اور میں کوشش کے باوجود نظروں کا زاویہ بدل سکی نہ پلکیں گرا سکی۔ کچھ پل یونہی بیتے پھر اس نے ریوالونگ چیئر ذرا سی گھما کر اپنا رخ بائیں جانب موڑ لیا اور قدرے توقف سے کہنے لگا۔

"میں خود کو بہت مشکل میں محسوس کر رہا ہوں۔ ایمانداری سے بتائیے......! میری جگہ آپ ہوتیں تو کیا کرتیں......؟"

میں نے ذرا سی حرکت کی لیکن بول پھر بھی نہیں سکی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا پھر کہنے لگا۔

"چلیے...... اتنا تو بتا دیں کہ جب آپ کی جہانگیر کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی تو پھر آپ نے میرے پروپوزل کے لئے ہامی کیوں بھری......؟"

"مجھے نہیں معلوم......!" میں نے کمزور آواز میں کہا۔

"میرا مطلب ہے ہامی نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا بلکہ مجھے سرے سے معلوم ہی نہیں تھا۔ اس روز آپ کی زبانی......"

"تو آپکی آنکھیں اسی انکشاف پر جھکی تھیں۔" وہ افسردگی سے مسکرایا۔

"اور اسی شام میں نے آپ کو فون کر کے یہی معلوم کرنا چاہا تھا کہ آپ اچانک رونے کیوں لگی تھیں......؟"

"آپ......؟" میں اسی قدر کہہ سکی۔ گویا یہ بھی اسی روز جان گیا تھا جب ہی آج مجھے دیکھ کر چونکا نہیں۔

"بہرحال میں زبردستی تو نہیں کر سکتا۔ آپ میرے پروپوزل کو رجیکٹ کرنے کا حق رکھتی ہیں۔"

اس نے جانے کن مرحلوں سے گزر کر یہ بات کی تب میں سوچ کر بولی۔

"میرا المیہ یہ ہے معظم جاہ......! کہ مجھے اپنا حق استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے اور میں اسی لئے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ منع کر دیں۔"

وہ فوراً کچھ نہیں بولا۔ چیئر گھما کر دوبارہ پہلے والی پوزیشن میں آیا اور دراز سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ اتنا سا وقت مجھ پر بے حد گراں گزرا۔ میں پوری جان سے اس کی طرف متوجہ تھی کہ پتا نہیں وہ کیا کہے اور گہرا کش لینے کے بعد پوچھنے لگا۔

"کیا میرے منع کرنے سے آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا......؟"

"جی......؟" میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو کہنے لگا۔

"آپ کو خود سمجھنا چاہئے کہ جب ابھی آپ کے والدین نے آپ سے پوچھے [illegible] رسم میں لائے بغیر آپ کی زندگی کا فیصلہ کر دیا تو ظاہر ہے دوبارہ بھی وہ ایسا ہی کریں گے یا آپ [illegible] مقصد ہے کہ انہیں جہانگیر کے بارے میں بتا سکیں......؟"

"یہ میرا مسئلہ ہے۔" مجھے یہ کہنا مناسب لگا اور وہ کچھ دیر تک مجھ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا پھر گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"او کے......! میں منع کر دوں گا۔ ساتھ ہی آپ سے ایک درخواست ہے کہ پلیز......! جہانگیر کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ میرا مطلب ہے اس سارے قصے میں میرا نام کہیں نہ آئے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا......؟"

"جی......!" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں نے تشکر سے اسے دیکھا پھر جانے کی اجازت چاہی تو وہ پوچھنے لگا۔

"کیسے جائیں گی......؟"

"بس سے......!"

"چلیے......! میں چھوڑ دوں گا۔"

میں منع کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا اور چابی اٹھا کر آگے چل پڑا۔ تمام راستہ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کے بارے میں پتا نہیں لیکن میں بالکل خالی الذہن تھی۔ حالانکہ بہت ساری باتیں سوچنا چاہ رہی تھی لیکن ذہن کسی طرف مائل ہی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ہاسٹل آ گیا۔ میں "شکریہ" کہہ کر اترنے لگی کہ اس نے روک لیا اور میرے گردن موڑ کر دیکھنے پر کہنے لگا۔

"اس وقت میں کہہ رہا تھا کہ اب کسے الزام دوں تو ایسا ہے شیخ علی احمد......! کہ بقیہ تمام عمر میں خود کو ہی الزام دیتا رہوں گا جبکہ آپ کے لئے میرے پاس صرف اور صرف نیک خواہشات ہیں۔"

وہ بظاہر خود کو کتنا نارمل پوز کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں پا کر کھو دینے کا دکھ بے حد نمایاں تھا اور پہلی بار میں نے اس کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کیا لیکن میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس لئے اس کی نیک خواہشات کے جواب میں ایک بار پھر "شکریہ" اس کے بعد "خدا حافظ" کہہ کر چلی آئی۔

"میرا خیال تھا تم راستہ بھول جاؤ گی۔" مجھے دیکھتے ہی شرمین نے کہا۔

"ایسا ممکن تھا اگر اکیلی ہوتی۔" میرے جواب پر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"اس کا مطلب ہے معظم جاہ چھوڑ کر گیا ہے......؟ جلدی بتاؤ......! کیا کہا ہے اس نے......؟"

"وہی جو میں چاہتی ہوں۔ یعنی وہ شادی سے منع کر دے گا۔"

"چلو...... مبارک ہو......! یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا ویسے معظم جاہ تمہیں دیکھ کر حیران تو ہوا ہو گا۔"

میں نے ہونٹوں تک آئی "نہیں" کو فوراً روک لیا اور یونہی اثبات میں سر ہلا کر واش روم کا رخ کیا۔

○ ○ ○

ظاہر ہے جب مجھے معظم جاہ کے پروپوزل کے بارے میں معلوم نہیں تھا تو پھر یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے کیا کہہ کر شادی سے انکار کیا ہو گا اور نہ میں یہ جان سکی تھی کہ اس کی طرف سے انکار کو میرے گھر والے کس انداز سے لیں گے۔ پھر میں گھر سے دور بھی تو تھی۔ گھر میں رہتی ہوتی تب تو باخبر بھی ہوتی بلکہ اس وقت تو حالات یکسر مختلف بلکہ معظم جاہ کے حق میں ہوتے۔ بہرحال اب مجھے آگے کی فکر تھی کہ اماں ابا کہیں اور نہ میری بات چلا دیں۔ جب ہی مجھے شدت سے جہانگیر کا انتظار تھا اور وہ پورے ایک ہفتے بعد آیا۔

"میں بی بی جان کو لے آیا ہوں۔" اس نے آتے ہی بتایا پھر کہنے لگا۔

"اب تم جلدی سے اپنے گھر کا ایڈریس وغیرہ دے دو تا کہ میں انہیں وہاں لے جاؤں۔"

"آپ لے جائیں گے......؟" میں نے برملا حیرت کا اظہار کیا تو وہ شریر مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر میرے ہی انداز میں بولا۔

"تو کیا تم لے جانا چاہتی ہو......؟" میرے سٹپٹانے پر مزید شوخ ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے......! میں بی بی جان سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ چلی جائیں۔"

"اگر آپ ایسی باتیں کریں گے تو آپ کو ایڈریس نہیں دوں گی۔"

"دھمکی......؟" وہ ہنسا۔

"اچھا......! ابھی تو چلو......! بی بی جان تم سے ملنے کو بہت بے چین ہیں۔"

"ابھی......؟" میں کشمکش میں پڑ گئی۔ پتا نہیں مجھے اس طرح جانا چاہیے یا نہیں اور مجھے مناسب نہیں لگا لیکن اس کا اصرار پیار بھری دھمکی اور پھر رُوٹھنے لگا تو مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اسے رُکنے کا کہہ کر اُوپر آئی۔ شرمین کو بتایا اور چادر اُٹھا کر نیچے آئی تو وہ گیٹ تک جا چکا تھا۔ میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

اُس کی بی بی جان میرے تصور سے قدرے برعکس تھیں۔ خاصی جہاندیدہ خاتون۔ مجھ سے ملتے ہوئے نہ تو زیادہ گرم جوشی دکھائی نہ سرد مہری۔ خوشی کے اظہار میں بھی میرے حساب سے کنجوسی کر گئی تھیں۔ بہر حال مجھے وہ اچھی لگیں۔ پاس بٹھا کر مجھ سے میرے سب گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔ پھر گھر کا پتا بھی انہوں نے ہی لیا۔ میں یوں بھی اتنی بولڈ نہیں تھی بس ان کی باتوں کے مختصر جواب ہی دے سکی۔ اس دوران وہ پتا نہیں کہاں غائب رہا۔ میں اور بی بی جان چائے پی چکے تب آیا اور اس کے آتے ہی بی بی جان نے اسے مجھے چھوڑ آنے کے لئے کہا۔

"لگتا ہے آپ کی بی بی جان مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوئیں......؟" میں جو کبھی تھی باہر آتے ہی اس سے وہی کہا تو وہ فوراً ٹوک کر کہنے لگا۔

"غلط نہیں سمجھو......! اصل میں بی بی جان کا مزاج ہی ایسا ہے۔ پتا ہے وہ مجھے بہت چاہتی ہیں کبھی میری کوئی بات رد نہیں کی۔ لیکن وہ کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتیں۔ بس ان کا اپنا انداز ہے۔ رفتہ رفتہ تم بھی سمجھ جاؤ گی۔"

میں خاموش ہو رہی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ میرے امتحانوں میں کم وقت رہ گیا تھا اور میں یکسوئی سے پڑھنا چاہتی تھی لیکن اب میرا دل ہی نہیں لگتا تھا۔ بس یہی سوچتی رہتی کہ میری یہاں موجودگی کے دوران ہی جہانگیر اور بی بی جان میرے گھر سے ہو آئیں تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ اماں اور ابا جی نے کیا جواب دیا۔ اگر معظم جاہ کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہوئی تو وہ میں یہیں رہ کر دور کر سکتی تھی جبکہ گھر جانے کے بعد تو مجھے بالکل پابند ہو جانا تھا۔ اتنے دنوں سے جہانگیر بھی نہیں آیا تھا جو اس سے کچھ معلوم کر سکتی۔ پھر کچھ دن اور گزرے تو مجھے جہانگیر کے نہ آنے پر تشویش ہونے لگی اور جب میں نے شرمین کے سامنے اظہار کیا تو وہ بڑے آرام سے بولی۔

"سامنے ہی تو گھر ہے جا کر معلوم کر آؤ۔"

"نہیں......! اب میں نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اس کی بی بی جان بھی عجیب ہیں اور اُس روز انہوں نے رسماً بھی مجھے دوبارہ آنے کے لئے نہیں کہا تھا۔"

میں نے صاف گوئی سے کہا تو شرمین کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہی پھر کندھے اُچکا کر بولی۔

"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں......؟"

"کم از کم یہ تو بتاؤ کہ میں کیا کروں......؟"

"امتحانوں کی تیاری......!" وہ اطمینان سے بولی تو مجھے غصہ آ گیا۔

"عجیب ہو تم......! پہلے تو بہت جوش و خروش دکھا رہی تھیں اور اب دامن بچا رہی ہو۔"

"میں دامن نہیں بچا رہی میری جان......! تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ خواہ مخواہ کے اندیشوں میں مت

گھبرایا کرو۔ جہانگیر کوئی بیکار اور فضول قسم کا بندہ نہیں ہے۔ اگر نہیں آ رہا تو کسی کام میں اُلجھا ہوا ہوگا۔"

"ایسا بھی کیا کام......؟"

"غصہ تمہیں اس پر ہے نکال مجھ پر رہی ہو۔ یہ خوب ہے۔" وہ رُوٹھ کر بولی۔ پھر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"میں ابھی جا کر معلوم کر آتی ہوں کہ وہ کیوں نہیں آ رہا......؟"

"تم جاؤ گی......؟"

"ہاں......! بتا آتی ہوں اُسے کہ تمہارے انتظار میں شمع پگھل رہی ہے بلکہ آخری دموں پر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور کہلوانا ہو تو وہ بھی بتا دو۔"

اُسے جانے پر کمربستہ دیکھ کر میں شپٹا گئی۔ بڑی منتوں سے ہاتھ جوڑ کر اسے روکا اور وہ رُک تو گئی اس کے بعد گالیوں کے ساتھ اتنی باتیں سنانا شروع کیں کہ میں نے کمرے سے نکل جانے ہی میں عافیت جانی تھی۔

پھر شام میں اس کے ساتھ لان میں ٹہل رہی تھی کہ وہ اچانک مجھے کہنی مار کر بولی۔

"لو......! آ گیا تمہارا پروانہ......!"

"کہاں......؟" میں نے فوراً گیٹ کی سمت دیکھا واقعی جہانگیر تھا۔ اتنے دنوں کی دوری سے مجھ پر اس کی اہمیت بہت اچھی طرح واضح ہو گئی تھی۔ میں نے جان لیا تھا کہ اس کے بنا زندگی ایسی ہی ہے جیسے بن پانی کے مچھلی۔ شرمین کو وہیں چھوڑ کر میں تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور بجائے احوال پوچھنے کے بے اختیار شکوہ کر گئی۔

"کہاں تھے آپ......؟" وہ بہت ذرا سا مسکرایا اور جانے کس خیال کے تحت میرے اطراف نظریں دوڑانے لگا۔ پھر مجھے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کہیں باہر چلو گی......؟"

"باہر......؟" میں نے لحہ بہ لحہ اُترتی شام کو دیکھا پھر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ اندر آ جائیں۔"

"او کے......!" وہ میرے پیچھے چلتا ہوا ویٹنگ روم میں آیا اور جب بیٹھ گیا تب میں نے اپنا وہی سوال دُہرایا۔

"کہاں تھے آپ......؟"

"پہلے کچھ مصروف تھا پھر فراغت ملتے ہی بی بی کو لے کر خان پور چلا گیا۔"

اس نے بتاتے ہوئے نظریں مجھ پر جما دیں اور یقیناً میرے چہرے پر ایک پل میں کتنے رنگ اُترے ہوں گے جبکہ دل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ دوپٹے کے کونے میں گرہ لگاتے ہوئے بظاہر انجان لیکن میرا رواں رواں اس کی طرف متوجہ تھا اور وہ شاید میری کیفیت بھانپ کر محظوظ ہو رہا تھا جب ہی ایک دم خاموش ہو گیا۔ کتنے پل بیت گئے۔ تب میں نے ذرا سی پلکیں اُٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ وہ مجھ پر نظریں جمائے گم صم اور اداس سا بیٹھا تھا۔ میرے اندر بھی ہلچل نے واہموں کا دامن تھام کر اچانک ہی مجھے کسی خطرے کا احساس دلایا اور میں نے سہم کر پوچھا۔

''کیا بات ہے......؟''

''تم نے تو مجھے بہت اُلجھن میں ڈال دیا ہے شمع......!'' وہ یوں بولا جیسے اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کیا
…ے۔ پھر کچھ رُک کر کہنے لگا۔

''گزشتہ دنوں سے قطع نظر ابھی میری آمد پر تمہاری بے قراری اور ابھی میری بات سن کر تمہارے چہرے
…رنگ اُترے ہیں وہ مجھے کوئی اور داستان سنا رہے ہیں جبکہ خان پور سے میں کچھ اور سن کر آ رہا ہوں۔''

''کیا......؟'' میرے صرف ہونٹ نیم وا ہوئے۔

''یہی کہ تم پہلے سے کہیں منسوب ہو۔ اگر ایسا تھا شمع......! تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں......؟ یا پھر اس
…ت کو توڑنے کے بعد مجھے وہاں جانے کا کہتیں۔ کیا تم نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے......؟'' کس قدر شاکی
…ہا تھا وہ اور ''نہیں'' کہتے ہوئے میرے آنسو چھلک پڑے۔

''پھر یہ سب کیا ہے......؟'' پتا نہیں اُسے میرے آنسو نظر نہیں آئے یا قصداً نظر انداز کر گیا اور میری سمجھ
…نہیں آیا کیا کہوں۔ سچ بولنے میں اگر کہیں معظم جاہ کا نام آ جاتا تو اور مشکل ہو جاتی۔

''پلیز شمع......! روؤ نہیں...... میری بات کا جواب دو۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچ کر کہا۔

''میرا مطلب ہے جب میں یہاں آئی تھی تو کسی سے منسوب نہیں تھی۔ ابھی بھی مجھے نہیں معلوم۔ اگر
…رے والدین نے ایسا کوئی فیصلہ کیا ہے تو میرے علم میں نہیں ہے۔''

''واقعی......؟'' اس کے اندر کا دُکھ ایک ہلکی سی تاسف بھری ہنسی کی صورت باہر آیا۔

''میرا یقین کریں......! میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔'' میں نے اُسے دیکھ کر کہا تو وہ ہونٹ بھینچ گیا۔ کتنی دیر
…ب اسی طرح بیٹھا رہا پھر شاید میرا یقین کر کے پوچھنے لگا۔

''کیا تم والدین کے فیصلے پر خاموشی سے سر جھکا دو گی......؟''

میں نے فوراً جواب نہیں دیا بلکہ معظم جاہ کے بارے میں سوچنے لگی کہ اس نے اب تک منع کیوں نہیں کیا۔
…یں اپنی خواہش سے مغلوب ہو کر اس نے ارادہ ترک تو نہیں کر دیا۔ لیکن یہ طے ہے کہ میں اس سے شادی نہیں
…روں گی۔ دل ہی دل میں معظم جاہ سے تنفر محسوس کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

''میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار بہرحال میرے والدین کو ہے لیکن میں چاہوں گی کہ اس میں
…ری مرضی بھی شامل ہو۔''

''ہوں......!'' وہ صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر جانے کیا سوچنے لگا اور میں اچانک خود کو بہت کمزور محسوس
…نے لگی۔ مجھے لگا اب میں مزید اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکوں گی۔ تب میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئی ایم سوری جہانگیر......! میں انجانے میں آپ کو دُکھ دے گئی ہوں۔''

''اس میں تمہارا کیا قصور ہے......؟''

''پھر بھی...... بی بی جان نے پتا نہیں کیا سوچا ہو گا......؟''

''کچھ نہیں سوچا انہوں نے۔ صرف یہی کہا کہ پہلے تمہیں اپنے گھر میں بات کر لینی چاہئے تھی۔ ویسے تم

کب جا رہی ہو......؟'' وہ اُٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بس......! اگلے ہفتے سے امتحان شروع ہیں اور امتحانوں کے فوراً بعد میں چلی جاؤں گی۔''

''پھر میں اسی حساب سے بی بی جان کو لے کر آؤں گا۔ او۔کے......؟''

وہ اچانک طمانیت بھرے احساس میں گھر کر کھل کر مسکرایا لیکن میری ذہنی رو کہیں اور بھٹک گئی تھی۔ بس
خالی خالی نظروں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھا پھر اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے میں معظم جاہ کو سخت سست
کہہ رہی تھی۔

پھر یہ تھوڑا سا وقت ہی میرے پاس تھا۔ وہ بھی اسی تیزی سے پھسلا جا رہا تھا کہ کوئی لمحہ میری گرفت میں
نہیں آ رہا تھا۔ میں صبح شام معظم جاہ کے آفس فون کرتے کرتے تھک گئی۔ وہاں سے بس ایک ہی جواب ملتا
''نہیں ہیں'' اور میرے مزید استفسار پر ''پتا نہیں'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیسے اور کہاں رابطہ
کروں۔ کئی بار خیال آتا کہ ایک بار پھر خود اس کے آفس چلی جاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتی کہ کہیں اس کے
ساتھ ساتھ جہانگیر سے سامنا نہ ہو جائے۔ ثمرین سے کہا تو وہ میری عقل پر ماتم کرتے ہوئے بولی۔

''بے وقوف......! آفس فون کر کے اس کے گھر کا نمبر لے لو اور وہاں بات کرو۔'' مجھے اپنے آپ پر غصہ
آیا کہ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔ بہرحال میں نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا لیکن وہ گھر میں بھی نہیں ملا۔ اس
وقت میں سچ مچ رو پڑی۔

(معظم جاہ......! تم اچھا نہیں کر رہے)۔ میں نے حد درجہ اس سے شاکی ہو کر دُکھ سے سوچا۔

پھر اسی ٹینشن میں امتحان شروع ہو گئے۔ دوسرا پیپر دے کر آئی تو ابا جی موجود تھے۔ بے حد تھکے ہوئے اور
نڈھال سے لگ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر متوحش ہو گئی۔

''ابا جی......! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟''

''ہاں......!'' انہوں نے ''ہاں'' کی صورت سرد آہ کھینچی پھر پوچھنے لگے۔

''تم گھر کب چلو گی......؟''

''ابھی تو امتحان شروع ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا پھر سوچ کر آخری پیپر کی تاریخ بتائی تو کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے......! میں اسی روز تمہیں لینے آ جاؤں گا۔'' میں خاموش رہی اور قدرے توقف سے اُن سے
چائے وغیرہ کا پوچھا لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ پھر کہنے لگے۔

''میں کل سے آیا ہوا ہوں۔ اب واپس جا رہا تھا تو سوچا تم سے ملتا چلوں۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے
تمہیں......؟ لیکن اب تو تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ بس......! میں لینے آ جاؤں گا۔''

وہ خود ہی کہتے خود ہی جواب دیتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جانے کیوں اتنے رنجیدہ سے ہو رہے تھے۔ میں
نے سوچا سبب پوچھوں لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے میری نسبت ٹوٹنے کی بات ہو اور اسی وجہ سے انہیں رنج
ہوا ہو۔ جب ہی میں خاموش رہی۔

اسی شام میں نے پھر معظم جاہ کے گھر فون کیا۔ دوسری طرف [illegible] وہی تھا۔ میں نے بمشکل خود پر قابو پا کر سلام
کیا تو وہ جواب [illegible] کر خاموش ہو گیا جس سے میرا ضبط جواب دینے لگا پھر بھی میں نے سوچا شاید اس نے پہچانا

نہیں۔ اپنا نام بتاتے ہوئے میرے لہجے میں طنز سمٹ آیا۔

"میں ہوں شیخ علی احمد......!"

"جی......!" پھر وہی خاموشی اور میں چیخ پڑی۔

"معظم جاہ......! آخر آپ میرے ضبط کا امتحان کیوں لے رہے ہیں......؟ پتا ہے میں کتنے دنوں سے مسلسل صبح شام آپ کو رنگ کر رہی ہوں۔ نہ آپ آفس میں ملتے ہیں نہ گھر میں۔"

"جی......!"

"کیا جی......؟ میری بات کا جواب دیں۔" میں زچ ہو کر بولی اور اس کا وہی سپاٹ لہجہ۔

"کون سی بات......؟"

"آخر آپ کا مقصد کیا ہے......؟ بہت ساری باتیں تو نہیں ہیں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب تک آپ نے اس نسبت کو توڑا کیوں نہیں......؟"

"سوری......! میں اس وقت جواب نہیں دے سکتا۔"

"کیوں......؟ کیوں نہیں دے سکتے......؟" میں نے تڑخ کر پوچھا اور اس نے سلسلہ ہی منقطع کر دیا۔

میں بے حد جھنجلائی۔ سوچا دوبارہ رنگ کر کے اُسے خوب گالیاں دوں لیکن پھر ریسیور پٹخ کر چلی آئی۔

اس رات بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ کتنے وہم کتنے اندیشے تھے اور سب کو تو نہیں جھٹلایا جا سکتا تھا۔

پتا نہیں شرمین کیسے میرے اندیشوں کو بے بنیاد قرار دیتی تھی۔ جبکہ میں کسی ایک بات پر بھی سر نہیں جھٹک سکی۔ بلکہ پورے یقین سے اس نتیجے پر پہنچی کہ معظم جاہ میرے ساتھ فاؤل کھیل رہا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اپنی محبت یا آئیڈیل کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچ کر مجھے اس سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔

ساتھ ہی زندگی میں پہلی بار میں اپنے گھر کے خالص روایتی قسم کے ماحول سے شاکی ہوئی جہاں لڑکیوں کی اپنی کوئی سوچ کوئی مرضی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اہمیت نہیں دی جاتی۔ بہر حال میرے اختیار میں اتنا ہی تھا اس کے بعد اب میں بالکل بے بس تھی اور بے بسی میں آنسو تو چھلکتے ہی ہیں۔

○○○

میرا خیال تھا جہانگیر سے آخری ملاقات کو میں یادگار بنا دوں گی لیکن میں اتنی مایوس ہو چکی تھی کہ اس کی آمد پر مسکرا بھی نہیں سکی۔

"کیا بات ہے......؟ اُداس ہو......؟" اس نے محسوس کر کے پوچھا اور میں نے اثبات میں سر ہلایا تو آنکھوں میں بھی نمی اُتر آئی۔

"بے وقوف......! گھر جانے کے خیال سے تو تمہیں خوشی ہونی چاہئے اور پھر چند روز بعد میں بھی بی بی جان کو لے کر آ جاؤں گا۔ تم جاتے ہی بات کر لینا۔ سمجھیں......؟"

میں خاموش رہی۔ اب اسے کیسے بتاتی کہ گھر میں بات کرنا تو میرے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ البتہ یہاں ایک آخری کوشش ضرور کروں گی۔

"کچھ بولو ناں......؟ اس طرح خاموش بیٹھو گی تو میں چلا جاؤں گا۔"

"بی بی جان کیسی ہیں......؟" میں نے فوراً پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

"ٹھیک ہیں......! ابھی کل ہی پوچھ رہی تھیں کہ دوبارہ خان پور کب جانا ہے......؟ اور سنو......! میں کل صبح اسلام آباد جا رہا ہوں۔ تم کب تک یہاں ہو......؟"

"پرسوں میرا آخری پیپر ہے اور ابا جی بھی پرسوں ہی آ جائیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے دوبارہ تم سے یہاں ملاقات نہیں ہو گی کیونکہ مجھے اسلام آباد میں کچھ زیادہ دن لگ جائیں گے۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا پھر مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"کہیں باہر چلو گی......؟"

"نہیں......! یہیں ٹھیک ہے۔"

"کم آن یار......! تم بہت ڈل ہو رہی ہو۔ اپنے چہرے سے افسردگی دور کرو۔ بالکل اچھی نہیں لگ رہیں۔" اس نے نرمی سے ڈانٹا۔ پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کوئی اور پرابلم تو نہیں ہے......؟"

"نہیں......!"

"او کے......! پھر میں چلتا ہوں۔ تم بور کر رہی ہو۔" وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگا۔

"ذرا سا مسکرا دو تا کہ تم سے دوری کا یہ موسم آسانی سے بتا سکوں۔"

"کیا یہ موسم بیت جائے گا......؟" میرے بے اختیار پوچھنے پر اس نے چونک کر دیکھا پھر پلٹ کر میرے قریب چلا آیا۔

"تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں یا......؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے پتا نہیں کسے دھوکا دیا اُسے یا اپنے آپ کو۔ پھر قصداً مسکرائی تو اس نے ایک لمحہ کو بغور میری آنکھوں میں دیکھا پھر "خدا حافظ" کہہ کر چلا گیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے اس کا ہر اٹھتا قدم اس کے اور میرے درمیان نہ مٹنے والے فاصلے حائل کرتا جا رہا ہے۔ پھر اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے میں نے ایک آخری کوشش کے طور پر معظم جاہ کو فون کیا لیکن وہ گھر پر نہیں تھا تب اپنی خرماں نصیبی پر آنسو بہاتے ہوئے اپنے کمرے میں آ کر چپ چاپ لیٹ گئی۔ شرمین مجھے دیکھ چکی تھی۔ کچھ دیر تک تو نظر انداز کر کے پڑھنے میں مصروف رہی لیکن شاید میری خاموشی بھی اُسے ڈسٹرب کر رہی تھی جب ہی ایک دم کتاب پٹخ کر بولی۔

"مجھے یقین ہے تم اسی طرح آنسو بہاتے بہاتے مر جاؤ گی۔"

"میں رو تو نہیں رہی۔" مجھے اپنے بہتے آنسوؤں کا احساس نہیں تھا۔

"اور کیسے روتے ہیں......؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھی اور میرے گیلے رخسار چھو کر کہنے لگی۔

"اس طرح گھٹ گھٹ کر رونے سے بہتر ہے چھت پر چڑھ کر نیچے کود جاؤ۔ پاگل لڑکی......! تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو جہانگیر پر لعنت بھیج کر بڑے آرام سے معظم جاہ سے شادی کر لیتی۔ پوچھو کیوں......؟"

"کیوں......؟"

"اس لئے کہ ایک تو وہ جہانگیر سے زیادہ ہینڈسم ہے ہر لحاظ سے۔ دوسرے اس کی محبت برسوں پر محیط ہے۔ تیسرے میں اس شخص کو کبھی دکھ نہیں دے سکتی تھی جو برسوں سے مجھے کھوجتا اور خدا سے مانگتا آ رہا ہے لیکن ہائے میرے ایسے نصیب کہاں......؟ ایمان سے تم بہت ناشکری ہو۔" اس نے ایک ہی سانس میں معظم جاہ کی خوبیاں گنوانے کے ساتھ مجھے ناشکری قرار دے دیا۔ تو مجھے کہنا پڑا۔

"تم میری جگہ نہیں ہو اس لئے یہ سب کہہ رہی ہو۔" اسی وقت رضوانہ نے جھانک کر میرے فون کا بتایا تو میں نے شرمین کو یوں دیکھا جیسے میری سمجھ میں نہ آیا ہو کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔

"تمہارا فون ہے......؟" شرمین زور دے کر بولی تو میں "کون ہوگا" سوچتی ہوئی اٹھ کر آ گئی۔ اتفاق سے فون کے پاس وارڈن موجود تھی۔ گو کہ اپنے کام میں مصروف پھر بھی میں نے بہت محتاط انداز میں ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف معظم جاہ تھا غالباً میری آواز سنتے ہی رسماً پوچھ بیٹھا۔

"کیسی ہیں آپ......؟"

"جی......!" میرے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ یقیناً اس شخص کی قسمت اچھی تھی جو وارڈن کی موجودگی کے باعث مجھے ضبط کرنا پڑا ورنہ میں چھوٹتے ہی اُسے بے بھاؤ کی سناتی اور وہ معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"آئی ایم سوری......! اُس روز میں ٹھیک طرح سے بات نہیں کر سکا۔ اینڈ سوری اگین کہ ابھی بھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"کیا یہی بتانے کے لئے فون کیا ہے......؟" میں نے دھیرے سے طنز کا نشتر چبھویا۔

"نہیں......! بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں باہر جا رہا ہوں۔"

"کتنے عرصے کے لئے......؟"

"شاید ہمیشہ کے لئے......!"

"خدا حافظ......!" میں بے اختیار فوراً کہہ گئی۔

"پلیز شمع......! میری بات سنیں۔" اس نے مجھے فون بند کرنے سے روکا لیکن اب میں اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔ ریسیور رکھ کر چلی آئی۔ اپنے تئیں میں اُس سے بدلہ لے آئی تھی اور میرا خیال تھا اگر اُسے واقعی کوئی ضروری بات کہنی ہوگی تو پھر فون کرے گا لیکن پھر اُس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔

اگلا سارا دن میں لاشعوری طور پر ہی کسی کی منتظر رہی۔ رات میں جب اپنا سامان پیک کر رہی تھی اس وقت شدت سے احساس ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔

"کیا تم کل ہی چلی جاؤ گی......؟" شرمین میری پیکنگ دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ہاں......! میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔ ابا جی یہی کہہ رہے تھے کہ وہ کل ہی لینے آ جائیں گے۔ ویسے بھی اب یہاں رہ کر کیا کروں گی......؟"

"بڑی بے مروت ہو۔ کم از کم میرے لئے ہی رُک جاتیں۔ کل آخری پیپر ہے۔ اس کے بعد کچھ شاپنگ وغیرہ کر لیتے۔" شرمین کے ٹوکنے پر مجھے احساس ہوا کہ کچھ غلط کہہ گئی ہوں۔ بمشکل بات بنا سکی۔

"میں کیا کروں......؟ ابا جی نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں تھا۔ بس......! خود ہی کہہ دیا کہ آخری پیپر والے

روز لینے آ جاؤں گا۔ میں کیا کہتی......؟ خاموش ہو رہی۔"

"ہاں بس......! تم ایسے ہی خاموش ہو رہا کرو۔ پاگل لڑکی......! ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جب اپنی سوچ اور اپنی مرضی ظاہر کر کے دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔" اُس نے مجھے سمجھانے کا آخری موقع بھی نہیں گنوایا۔

"ورنہ خاموشی کا مطلب تو یہی ہوتا ہے کہ تمہیں دوسرے کی بات سے سرے سے اختلاف ہے ہی نہیں۔"

"اچھی بات ہے...... آئندہ خاموش نہیں رہوں گی۔" میں نے محض اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے کہہ دیا۔

پھر اس رات پیپر کی تیاری کے ساتھ ساتھ میں نے اور شرمین نے بہت باتیں کیں۔ گزشتہ دو سالوں کو جو ہم نے ساتھ گزارے تھے اور آئندہ زندگی کی جس میں شاید ہی کبھی ہماری اتفاقاً ملاقات ہو جائے۔ البتہ ہم نے ایڈریس کا تبادلہ کرنے کے ساتھ ایک دوسرے کو خط لکھتے رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

پھر اگلے روز میں پیپر دے کر آئی تو ابا جی موجود تھے اور میں وہ سارے حسین لمحات جو میں نے اپنی مرضی سے گزارے تھے، بہت احتیاط سے سمیٹ لائی تھی۔

○○○

ہمارے گھر میں زیادہ افراد نہیں تھے۔ اماں، ابا جی اور ہم تین بہن بھائی۔ بڑے بھیا جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ فرزانہ باجی کی شادی ہو چکی تھی اور میری آمد کا سن کر وہ پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اپنے گھر آ کر وقتی طور پر ایک گونہ خوشی کا احساس ہوا اور سب سے زیادہ میں فرزانہ باجی کے بیٹے یاسر کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ چھ ماہ کا گول مٹول سا یاسر سب کا چہیتا تھا۔ مجھے لگا اس گھر میں اُتری یہ رونقیں اس ننھے سے وجود کی مرہونِ منت ہیں۔ اُسے دیکھ کر ابا جی کے چہرے کا تناؤ بھی آپ ہی آپ رُخصت ہو جاتا اور میں جو گزشتہ کئی روز سے ٹینشن کا شکار تھی اُس کی معصوم اداؤں اور شرارتوں میں بہل گئی۔ فرزانہ باجی مجھ سے ہاسٹل کے قصے سننا چاہتی تھیں۔ اماں کی اپنی باتیں تھیں۔ لیکن مجھے ننھے یاسر کے ساتھ مزہ آ رہا تھا یا شاید میں اُس میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر رات کے کھانے کے فوراً بعد شاہد بھائی فرزانہ باجی سے گھر چلنے کی بات کرنے لگے۔ میں نے کہا بھی کچھ دن رہنے دیں لیکن اُن کا ہمیشہ والا جواب تھا کہ صبح پھر آ جائے گی۔ یوں وہ باجی اور یاسر کو لے کر چلے گئے۔ میں نے کچھ دیر اماں کے پاس بیٹھ کر سب کا حال احوال پوچھا۔ پھر سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ آج ہی امتحانوں کا بوجھ سر سے اُترا تھا پھر سفر کی تھکان بھی تھی اس لئے لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

پھر اگلے دن سے ہی میرے دو سال پہلے والے معمولات شروع ہو گئے۔ صبح جب اماں بوا کے ساتھ مل کر ناشتہ بنا رہی تھیں میں نے اوپری چیزیں سمیٹ لیں۔ ناشتہ سب نے مل کر کیا۔ پھر ابا جی اور بڑے بھیا کام پر چلے گئے تو اماں بوا کے ساتھ "کیا پکنا چاہئے" کا مرحلہ طے کرنے میں لگ گئیں۔ ایسے موقع پر میں ہمیشہ کسی اور کام میں مصروف ہو جاتی۔ اس وقت بھی میں نے یہی کیا۔ اپنے کمرے میں آ کر سوٹ کیس میں سے کپڑے اور دوسری اشیاء نکال کر الماری میں رکھنے لگی پھر صفائی کرنے والی ماسی آ گئی تو اس کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا۔ پہلے بھی میرا یہی کام تھا اور اب بھی۔ کسی کسی وقت تو میں یونہی ٹھٹک کر رُک گئی اور خود کو باور کرانے لگی کہ دو سال میں اس

گھر سے دور رہی ہوں ورنہ صبح اُٹھنے کے ساتھ ہی یوں لگا تھا جیسے میں کبھی کہیں گئی ہی نہیں۔ کیونکہ اس عرصے میں اس گھر کی کوئی ایک چیز کوئی ایک بات نہیں بدلی تھی۔ حتیٰ کہ سامنے کی دیوار پر پرندوں کے کھانے کے لئے باجرا بھر کر جو مٹی کا پیالہ میں نے رکھا تھا وہ بھی اسی طرح موجود تھا اور اُسے دیکھ کر ہی مجھے خیال آیا کہ جب موسموں کی شدتیں اس کچے کٹورے پر اثر انداز نہیں ہو سکیں تو پھر انسان اور اس کی سوچیں کہاں بدلی ہوں گی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری ذہنی رو بھٹک گئی اور میں ماسی کو اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ اماں میرے پیچھے چلی آئیں۔

"تم نے دیکھا نہیں ماسی اپنی مرضی سے کام کر کے چلی گئی۔"

"تو کیا ہوا اماں......؟ وہ برسوں سے یہاں کام کر رہی ہے اور اُسے پتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ پھر میں کیوں خواہ مخواہ اس کے سر پر کھڑی رہتی......؟" میں نے رسان سے کہا لیکن اماں کو میرا اُسے اس کی مرضی پر چھوڑ دینا پسند نہیں آیا۔ برا مان کر بولیں۔

"تم اگر کھڑی نہیں رہ سکتی تھیں تو مجھ سے کہتیں۔ میں دیکھ لیتی اُسے۔"

"بس کریں اماں......! اگر وہ کوئی کام اُدھورا چھوڑ گئی ہے تو مجھے بتائیں میں کر دیتی ہوں۔"

"ہاں......! تم کرو گی۔" اماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں تو مجھ پر عجیب طرح کی جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی۔ پھر میں کھانے کے وقت بوا کے بلانے پر ہی کمرے سے نکلی اور کھانے کے بعد اماں کے پیچھے پیچھے اُن کے کمرے میں چلی آئی۔

"سوئی نہیں کیا......؟" وہ مجھے اپنے پیچھے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"عادت نہیں رہی۔" میں اطمینان سے ابا جی کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ جب اماں پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گئیں تب میں نے اُن سے پوچھا۔

"اماں......! بڑے بھیا کی شادی کب کر رہی ہیں......؟ چار سال تو ہو گئے ہیں اُن کی منگنی کو۔"

"کیا کروں......؟ تمہارے ابا جی نہیں مان رہے۔ کہتے ہیں تمہاری اور اس کی ایک ساتھ کریں گے۔"

اماں کو غالباً اپنا من پسند موضوع مل گیا تھا۔ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"اُدھر رضیہ کے گھر والے اتنا اصرار کر رہے ہیں۔ آخر کب تک لڑکی کو بٹھائیں گے......؟"

"ٹھیک تو ہے......ابا جی کو سوچنا چاہئے۔"

"ہاں......! اب تم آ گئی ہو تو سوچیں گے۔" پھر قدرے مایوسی سے بولیں۔

"لیکن معظم تو بتا رہے تھے باہر چلا گیا ہے۔"

"کون معظم......؟" میں نے اچانک سناٹوں میں گھر کر انجان بنتے ہوئے پوچھا تو اماں نے پُرسوچ انداز میں یوں مجھے دیکھا جیسے معظم کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں یا نہیں۔ قدرے توقف سے کہنے لگیں۔

"جس سے تمہاری نسبت ٹھہری ہے۔ دیکھو وہ کب واپس آتا ہے......؟"

"وہ تو اب کبھی نہیں آئے گا۔" میں نے بے دھیانی میں کہہ دیا اور اماں پہلے تو بری طرح چونکیں پھر تڑخ کر پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتا......؟" میں ٹھٹک گئی۔

"مجھے کیا پتا......؟ میں نے تو سنا ہے باہر جانے والے واپس نہیں آتے۔ وہیں بس جاتے ہیں۔"

"ایسا اندھیر نہیں پتا...... اور وہ کوئی پہلی بار باہر نہیں گیا۔ تمہارے ابا جی بتا رہے تھے باہر سے پڑھ کر آیا ہے اب کسی کام سے گیا ہوگا۔"

میں اندر ہی اندر کٹ کر رہ گئی۔ شرمین ٹھیک تو کہتی تھی کہ جانے کتنے احمقوں کے مرنے پر میں پیدا ہوئی تھی اب بھلا اماں کے سامنے ایسی جاہلانہ بات کرنے کی کیا تُک تھی کہ الٹا وہ مجھے سمجھا رہی تھیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"میں نے دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ......! خوبصورت جوان ہے پھر اللہ بخشے اس کے باپ سے تمہارے ابا جی کی برسوں پرانی دوستی تھی۔"

"ہیں......؟ کیا ہوا اُس کے باپ کو......؟" میں نے چونک کر پوچھا تو اماں افسوس سے بولیں۔

"بیچارے انتقال کر گئے۔ ابھی کچھ دن پہلے بلکہ مہینہ بھر ہوا ہوگا۔" اس کے بعد اماں مرحوم کی خوبیاں گنوانے میں لگ گئیں جبکہ میرے ذہن سے پردے سرکنے لگے۔ کوئی مہینہ بھر پہلے ابا جی میرے پاس آئے تھے۔ بے حد تھکے ہوئے اور نڈھال سے۔ پھر اُسی روز میں نے معظم جاہ کو فون کیا تھا اور اُس نے میری بات کا جواب دینے سے معذوری ظاہر کی تھی۔

(تو کیا اُس روز...... اُف میرے خدا......!)۔ میں بے حد ندامتوں میں گھر کر خود کو ملامت کرنے لگی۔ پھر اگلے کئی روز تک میں ایک مجرمانہ سے احساس میں گھری رہی۔ یعنی اُس شخص پر تو غموں کا پہاڑ ٹوٹا تھا اور مجھے اپنی پڑی تھی۔ پھر ابھی میں پوری طرح اس احساس سے نہیں نکلی تھی کہ بی بی جان آ گئیں۔ یقیناً اُن کے ساتھ جہانگیر بھی ہوگا۔ لیکن میں کہاں اُسے دیکھ سکتی تھی۔ بی بی جان کو دیکھ کر ہی میں اپنے کمرے میں جا چھپی۔ کیونکہ ہمارے ہاں اجنبی خواتین کے سامنے بھی زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بہر حال اپنے کمرے میں بے قراری سے ٹہلتی رہی۔ مجھے خدشہ تھا کہیں اماں انہیں صاف انکار نہ کر دیں۔ کیونکہ معظم جاہ کی طرف سے اب مجھے اطمینان تھا کہ وہ اگر باہر بھی چلا گیا ہے تو کسی کے ذریعے سے انکار کہلوا بھیجے گا یا ہو سکتا ہے ابا جی کو خط ہی لکھ دے۔ میرا دل چاہا اماں کو بلا کر کہوں ابھی کوئی جواب نہ دیں۔ لیکن میں اتنی بولڈ نہیں تھی۔ ہزار چاہنے کے باوجود خود میں اتنی جرأت پیدا نہیں کر سکی۔ پھر جب بی بی جان چلی گئیں تب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک اور غلطی کر گئی ہوں۔ کم از کم مجھے فرزانہ باجی کو تو بتا دینا چاہئے تھا۔ وہی اماں سے بات کر لیتیں کہ معظم جاہ کسی بھی وقت اس نسبت کو توڑ دے گا۔ پھر یقیناً اماں بی بی جان کو آئندہ پر ٹال دیتیں۔ اب پتا نہیں انہوں نے کیا کہا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی لیکن کس سے پوچھتی۔ رات تک خواہ مخواہ برآمدے، آنگن اور کچن کے چکر لگاتی رہی کہ شاید اماں اور ابا جی بی بی جان کے بارے میں بات کر رہے ہوں اور میں کچھ جان سکوں۔ لیکن کہیں کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ تب مایوسی اور کھو دینے کا احساس جس نے مجھے بے حد پژمردہ کر دیا اور اُس رات میں چپکے چپکے روتی رہی۔ جہانگیر کا خیال آیا۔ پتا نہیں اُسے بالکل مایوس لوٹا دیا گیا ہے یا کوئی آس باقی ہے جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا کہ میں نے اُس کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ کاش میں اُسے ہی اصل صورت حال بتا دیتی۔ یہاں بھی میں غلطی کر گئی تھی جو معظم جاہ کا یقین کر کے اُس سے کہہ دیا کہ والدین کے فیصلے میں میری مرضی بھی شامل ہوگی اور معظم جاہ۔

میرے اندر اس شخص کے خلاف تنفر بڑھتا چلا گیا۔ وہ جو کہہ رہا تھا کہ اس سارے قصے میں میرا نام کہیں نہ آئے، تو جانے اس کا مقصد کیا تھا۔ بہر حال کل تک مجھے اُس سے ہمدردی تھی اور اب وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت تھا۔ جو میری مجبوری سمجھتے ہوئے بھی اطمینان سے کہیں دُور جا بیٹھا تھا۔ اگلے روز میں نے یونہی باتوں کے دوران بظاہر بے حد سرسری انداز میں اماں سے بی بی جان کے بارے میں پوچھ لیا۔

"اماں...... ! وہ کل کون خاتون تھیں...... ؟ کہاں سے آئی تھیں...... ؟" میں نے ہرگز اپنی شناسائی ظاہر نہیں ہونے دی اور اماں بھی اسی طرح سرسری انداز میں کہنے لگیں۔

"ایک بار پہلے بھی آ چکی ہیں۔ اُس وقت تم یہاں نہیں تھیں۔ حالانکہ میں نے تو اُسی وقت جواب دے دیا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا سوچ کر دوبارہ آ گئیں...... ؟" پھر ایک نظر مجھ پر ڈال کر بولیں۔

"تمہارا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میرا خیال ہے وہیں کراچی میں کہیں تمہیں دیکھا ہوگا۔"

"آپ نے کیا کہا اُن سے...... ؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"یہی کہ تمہاری بات طے ہو چکی ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی ہم بالکل انجان لوگوں میں رشتہ جوڑنے کے حق میں نہیں ہیں۔"

اماں نے ساتھ ہی اپنی رائے بھی دے ڈالی اور میں اُن سے کیسے کہتی کہ جسے آپ انجان کہہ رہی ہیں اس کی محبت کی جڑیں میرے اندر بہت دُور تک پھیل گئی ہیں۔ بہر حال اماں نے بی بی جان کو بالکل مایوس لوٹا کر مجھے نارسائیوں کا کرب بخش دیا تھا اور میں چپ چاپ ایک اَن دیکھی آگ میں سلگنے لگی تھی۔

○ ○ ○

ابا جی کا ارادہ بڑے بھیا کی اور میری شادی ایک ساتھ کرنے کا تھا لیکن اب مجبوراً انہیں صرف بڑے بھیا کی شادی کرنی پڑی۔ کیونکہ معظم جاہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے ابا جی کو معلوم ہو۔ اُس روز پھوپھی جان کے استفسار پر تو یہی کہہ رہے تھے کہ معظم کو آنے میں ابھی دیر ہے۔ اب پتا نہیں اُنہوں نے یونہی کہہ دیا تھا یا اس کے بارے میں جانتے تھے۔ بہر حال مجھے اُس سے کوئی غرض نہیں تھی اور نہ ہی اُس کی واپسی سے دلچسپی۔

بڑے بھیا کی شادی میں گھر میں کافی رونق ہو گئی۔ فرزانہ باجی بھی ہفتہ بھر پہلے سے آ گئی تھیں۔ دن بھر قریبی عزیزوں کا آنا جانا لگا رہتا اور اُن کی خاطر مدارت میں میں نے خود کو مصروف کر لیا۔ زیادہ تر کچن میں ہی رہتی۔ حالانکہ اماں نے بار بار منع کیا لیکن مجھے کزنز کی شوخیوں اور وہ جو بار بار معظم کا نام لے کر مجھے چھیڑتیں اس سے وحشت ہوتی تھی۔ اس لئے میں خود کو الگ تھلگ رکھتی۔ پھر شادی سے دو روز پہلے فرزانہ باجی اپنی شاپنگ کے سلسلے میں کراچی جانے لگیں تو میں بے قرار ہو گئی۔ اچانک جانے کیا کچھ یاد آیا اور دل مچل مچل کر اُن راہوں پر چلنے کی ترغیب دینے لگا جن پر قدم رکھتے ہوئے میں قصداً اپنی روایات سے نظریں چرا گئی تھی۔

"میں بھی چلوں...... ؟" میں نے بڑی آس سے فرزانہ باجی کو دیکھا۔

"ہاں چلو ناں...... ! میں بھی تو اس وقت سے تم سے یہی کہہ رہی ہوں۔ جلدی کرو باہر شاہد انتظار کر رہے ہیں۔" وہ یاسر کی فیڈر بیگ میں ڈالتی ہوئی عجلت میں بولیں تو میں نے اماں سے اجازت لینے کے لئے کہا۔

"اماں سے میں کہہ چکی ہوں تم چلو۔" وہ یاسر کو میری گود میں ڈال کر باہر نکل گئیں تو میں نے اپنا پرس

اُٹھانے سے پہلے اماں سے پوچھا پھر اُن کے پیچھے آ گئی۔

شرمین کہتی تھی کہ یہ جو وقت ہماری دسترس میں ہے اسے تو ہم مرضی سے گزار لیں۔ آگے جانے کیا ہو اور میں نے اس کی بات مان کر زندگی کے کتنے حسین اور دلفریب رنگوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ جن میں سب سے نمایاں رنگ اس محبت کا تھا جس نے پہلے میرے ہونٹوں کو مسکراہٹیں بخشی تھیں اور اب ایک روگ بن گئی تھی۔

فرزانہ باجی اپنی مطلوبہ چیزیں خریدنے میں مصروف ہو گئیں۔ شاہد بھائی بھی اُن کے ساتھ ساتھ تھے اور میں جو یہاں آنے کے لئے اچانک اتنی بے قرار ہو گئی تھی، مانوس راستوں پر قدم رکھتے ہی گم صم ہو گئی۔ کوئی غیر مرئی طاقت ہی تھی جو مجھے گھسیٹ رہی تھی۔ جہاں باجی رُکتیں اُن کے پیچھے میرے قدم بھی ٹھہر جاتے۔ وہ چلتیں تو میں بھی چل پڑتی۔ حالانکہ مجھے بھی خریداری کرنی تھی لیکن کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ جب باجی نے کوئی تیسری بار مجھے ٹوکا تب میں نے پیسے اُنہیں تھما دیئے کہ وہی اپنی پسند سے میرے لئے کپڑے وغیرہ خرید لیں اور میں خود یاسر کو لے کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میرا خیال تھا ان مانوس فضاؤں میں آ کر میری بے قراریوں کو قرار ملے گا لیکن اس کے برعکس میرے اندر کسک بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ تب مجھے اپنے آپ پر افسوس ہوا کہ میں یہاں کیوں آئی۔ کتنی دقتوں سے اب جبکہ میں اپنے تڑپتے مچلتے دل کو رام کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی تو اسے پھر انہی رنگوں کی جھب دکھلا کر دوبارہ اسی مقام پر آ کھڑی ہوئی تھی جہاں سے چلی تھی۔

"بس کرو بھئی...... ! شمع تھک گئی ہے۔" شاہد بھائی نے میری خاموشی اور لاتعلقی محسوس کر کے فرزانہ باجی سے کہا تو وہ پہلے مجھ سے بولیں۔

"تھک گئی ہو...... ؟" پھر شاہد بھائی سے کہنے لگیں۔

"یاسر کو آپ لے لیں ناں...... ! بس تھوڑی سی چیزیں رہ گئی ہیں، لے لوں...... دوبارہ کہاں آنا ہوگا۔"

"میری فکر نہیں کریں۔ آپ اطمینان سے خریدیں اور یاسر بھی میرے پاس ٹھیک ہے۔" میں نے قصداً مسکرا کر انہیں اپنی طرف سے اطمینان دلایا پھر بھی شاہد بھائی کہنے لگے۔

"ایسا کرو تم یاسر کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

"ہاں...... ! یہ ٹھیک ہے۔" فرزانہ باجی نے فوراً اُن کی تائید کی تو میں شاہد بھائی سے چابی لے کر لوگوں کی بھیڑ سے نکل آئی۔ پہلے کارنر سے یاسر کے لئے بسکٹ لے پھر گاڑی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی کہ وہ سامنے آ گیا۔

"جہانگیر...... !" میرے اندر باہر دُور تک سناٹوں کا راج ہو گیا اور دل ہولے ہولے لرزنے لگا کہ ابھی وہ مجھے پکارے گا۔ بے وفا، دھوکے باز اور فریبی جیسے ناموں سے مخاطب کرے گا لیکن وہ میرے سے ہنس کر بولا۔

"کیسی ہو نادان لڑکی...... ؟" اس کے تخاطب پر میری پلکیں بھیگ گئیں۔

"اوں ہوں...... ! رونا نہیں ورنہ یہ ساری گردشیں تھم جائیں گی۔" اُس نے اپنے اطراف نظریں دوڑائیں پھر کہنے لگا۔

"چلو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"نہیں......!" میں نے قدرے خوفزدہ ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں فرزانہ باجی اور شاہد بھائی تو نہیں آ رہے اور اُس نے مجھ کر پوچھا۔

"کون ہے تمہارے ساتھ......؟"

"میری بہن اور بہنوئی۔" میں نے بتایا پھر عاجزی سے بولی۔

"پلیز......! آپ چلے جائیں۔"

"جانا تو ہے اور جانے سے پہلے ایک شکوہ ضرور کروں گا شمع......! کہ تمہیں مجھے بتانا چاہئے تھا۔" میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کچھ دیر رُک کر بولا۔

"یہی کہ تم معظم جاہ کی منگیتر ہو۔" بظاہر اس کا لہجہ اور ہر انداز بے حد نارمل تھا جیسے کوئی عام سی بات ہو۔ میں کوشش کے باوجود خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ نظریں چراتے ہوئے میری آواز بوجھل ہو گئی۔

"مجھے خود معلوم نہیں تھا۔"

"میں جانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ساتھ معظم جاہ بھی بے خبر تھا لیکن شمع......! یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں معلوم ہو چکا تھا پھر تم نے مجھ سے کیوں چھپایا......؟" میرے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہا۔ مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم نے غلط قدم اُٹھایا...... میرا مطلب ہے تمہیں معظم جاہ کے پاس نہیں جانا چاہئے تھا۔"

"میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"کیا میں نے کبھی تمہارے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی تھی جو تم نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا......؟" اس نے تاسف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے آواز دبا کر گویا مجھے جھنجھوڑا اور میں نے خود کو بے حد تنہا اور بے بس محسوس کیا۔ تب وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"بہرحال اب میں تم سے یہی کہوں گا کہ مزید حماقت نہیں کرنا۔ معظم جاہ بہت اچھا انسان ہے۔ تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔"

"نہیں......!" میں اُس کی رفاقت کے خیال سے ہی خوفزدہ ہو گئی۔ وہ شخص کتنا اچھا سہی میرے دل میں اُس کی کوئی جگہ نہیں تھی اور میں نے اس سے بھی کہہ دیا۔

"نہیں جہانگیر......! میں کبھی اُن کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکوں گی۔ اگر کبھی وہ آپ کو ملیں تو ...... کہہ دیجئے گا اُن سے کہ میرا خیال چھوڑ دیں۔"

"کم آن شمع......! ابھی میں نے تمہیں مزید حماقت کرنے سے منع کیا ہے۔" اس نے ٹوکتے ہوئے ......

"جہاں اتنی حماقتیں کیں وہاں ایک اور سہی...... اور پلیز......! اب آپ جائیں یہاں سے ...... آنے والی ہوں گی۔" میں نے منت سے کہتے ہوئے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"ایسے نہیں جاؤں گا۔ پہلے ایک وعدہ کرو۔"

"نہیں......! میں کوئی وعدہ نہیں کروں گی۔ آپ بے شک کھڑے رہیں میں جا رہی ہوں۔" میں نے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے لگا۔

"پلیز......!" میں روہانسی ہو گئی۔

"پہلے وعدہ......!"

"نہیں......! میں معظم جاہ کے سلسلے میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی اور آپ کو اتنی پروا کیوں ہے......؟ انہوں نے تو آپ کا خیال نہیں کیا......؟"

"میرا خیال کر کے ہی تو کہیں دور نکل گیا ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتی۔" میں اچانک ہی بہت کٹھور بن گئی۔ گاڑی کا لاک کھول کر یاسر کو اندر بٹھایا پھر پلٹ کر اس سے بولی۔

"میرے اندر کھو دینے کا ملال نہیں ہے۔ جہانگیر......! دُکھ اس بات کا ہے کہ معظم جاہ جانتے بوجھتے بھی اپنی خواہش سے دستبردار نہیں ہوئے۔ آپ انہیں لاکھ اچھا انسان کہیں میرے نزدیک انتہائی دو غلے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ شادی سے منع کر دیں گے اور آپ سے......"

"نہیں! مجھ سے تو......" وہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی بات سنی ہی نہیں، اپنی کہے گئی۔

"مت اُن کی طرفداری کریں۔ مجھے نفرت ہے اُن سے۔ اگر کبھی میری زندگی میں آ بھی گئے تو منہ کی کھائیں گے۔" اُس نے غالباً پہلی بار مجھے غصے میں دیکھا تھا۔ جبھی سناٹے میں آ گیا اور میں ابھی اور بھی بہت کچھ کہتی لیکن فرزانہ باجی اور شاہد بھائی کو آتے دیکھ کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تب وہ چونک کر بولا۔

"سنو شمع......! تم غلط بھی ہو......؟"

"ہاں! میں غلط بھی تھی۔" میں نے "تھی" پر زور دے کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ تبھی فرزانہ باجی قریب آ گئیں اور مجھ سے چابی لے کر گاڑی کھولنے لگیں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ اُلٹے پیر چلتا ہوا پیچھے کھڑی گاڑی سے جا لگا تھا اور اُس کی آنکھوں میں مجھے مزید کسی حماقت سے باز رکھنے کی التجائیں رقص کر رہی تھیں۔



...... بھیا کی شادی میں ہر کوئی اماں سے معظم جاہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور میں جو مرے سے یہ نام سننا ہی نہیں چاہتی تھی، ہر دوسرے قدم پر سماعتوں سے یہی نام ٹکراتا۔

"معظم جاہ نہیں آئے......؟"

"معظم جاہ باہر گئے ہوئے ہیں......؟"

"معظم جاہ کب آئیں گے......؟"

(اُف......!)۔ میرا تو دماغ گھوم گیا۔ آخر سب لوگ اس کے بارے میں اتنے متجسس کیوں ہیں۔ دل چاہا چیخ چیخ کر سب کو بتاؤں کہ وہ کبھی نہیں آئے گا لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ بس اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔ پھر شادی کے ہنگاموں سے نکل کر ہی سکون کا سانس لینا نصیب ہوا تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ گو کہ رضیہ بھابی کی آمد سے گھر کی خاموش فضاؤں میں کچھ ہلچل سی مچ گئی تھی۔ کبھی اُن کی چوڑیاں کھنکتیں، کبھی پائل بولتی اور اُن کی ہنسی میں تو ایسا جادو تھا کہ بے اختیار لب مسکرا اُٹھتے تھے پھر بھی جانے کیوں میرے اندر کا سناٹا نہیں ٹوٹتا تھا۔ بس کبھی کبھی اس سناٹے میں اچانک ایسا شور اُٹھتا کہ

میں پریشان ہو جاتی۔ پھر آپ ہی آپ شور مدھم ہو کر بالکل ہی دم توڑ دیتا اور میں سوچتی رہ جاتی کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں خود سے نہیں سمجھ پائی۔ بلکہ شرمین کا خط پڑھتے ہوئے ادراک ہوا کہ میرے اندر احساسات کروٹیں بدل چکے ہیں۔ پہلے محبتوں کی اجارہ داری تھی جس میں کہیں کہیں اندیشوں کا خوف بھی شامل تھا۔ پھر ان کی جگہ کھو دینے کا دُکھ آن بسا جس نے مجھے بہت رُلایا تھا۔ اس کے بعد دُکھ کی شدت کم ہوتے ہوتے صرف ملال رہ گیا اور اب وہ بھی نہیں تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ گئے دنوں سے ناطہ ٹوٹ چکا ہے اور آنے والے وقت کا خیال میرے اندر محشر بپا کر دیتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح شرمین نے خط کے آخر میں لکھا تھا۔

"ابھی بھی میں تم سے یہی کہوں گی شمع ......! کہ معظم جاہ سے شادی کر لو۔ وہ اتنا ہینڈسم بندہ تم سے بڑی شدید محبت کرتا ہے۔"

"اور میں اتنی ہی شدید نفرت کرتی ہوں۔" خط تہہ کرتے ہوئے میں دانت پیس کر بڑبڑائی۔ واقعی میری نفرت بڑی شدید اور اتنی زور آور تھی کہ میرے اندر سے گزشتہ تمام موسم اور مدھم سے جذبوں کو نکال باہر کر کے فقط اپنی اجارہ داری قائم کر چکی تھی۔

پھر میں نے ہر قدم پر اپنا محاسبہ شروع کر دیا۔ میں کب کیا سوچتی ہوں اور میں جب بھی سوچتی بہت تنفر کے ساتھ معظم جاہ کو سوچتی تھی اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ محبت نے مجھے بزدل بنا دیا تھا جبکہ اب اس کے برعکس جذبات مجھے باغی بنا رہے تھے۔ پہلے اگر مجھے اپنا ماحول اور اپنی روایات بہت عزیز نہیں بھی تھیں، تب بھی میں ان سے متنفر نہیں تھی۔ شاید اس لئے کہ مجھے کسی جبر کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور اب مجھ پر جبر ہو چکا تھا۔ پہلا اس گھر کی طرف سے جو مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا فیصلہ کر دیا گیا اور دوسرا اُس شخص کی طرف سے جو میری مرضی کے خلاف ابھی تک مجھے اپنا پابند رکھے ہوئے تھا۔ اب جو میرے اندر شور اُٹھا تو تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا اور اُس روز شرمین کو جواب لکھتے ہوئے میں نے اس کی آخری بات کا جواب بھی لکھ دیا۔

"تمہارے فضول سے مشورے کا بہت شکریہ شرمین ......! تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اپنی زندگی کے انتہائی اہم موڑ پر ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی روز ابا جی کے مقابل کھڑی ہو جاؤں اور جس روز ایسا ہوا سب سے پہلی بات یہی کہوں گی کہ میں معظم جاہ سے شادی نہیں کروں گی۔"

اس کے بعد بہت دنوں تک شرمین کا خط نہیں آیا اور میں اس سلسلے میں اُس سے شاکی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہ خاصی مصروف رہتی ہے اور فراغت تو صرف میرے پاس تھی جس نے اب مجھے حد درجہ بیزار کر دیا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ کھانا، پینا، سونا، وقت بھی جیسے ٹھہر ٹھہر کر گزر رہا تھا۔

اماں میرے لئے خاصی فکرمند تھیں۔ ظاہر ہے وہ میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ دو سال ہو گئے تھے مجھے بی۔ اے کئے ہوئے اور اتنا ہی عرصہ معظم جاہ کو گئے ہوئے۔ مجھ سے تو وہ بہرحال یہ کہہ گیا تھا کہ ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے پتا نہیں ابا جی سے کیا کہا تھا جو وہ ابھی تک اُس کے انتظار میں تھے اور مایوس تو اماں بھی نہیں تھیں تبھی تو کسی کے بھی پوچھنے پر بڑے یقین سے کہتی تھیں بس آنے والا ہے۔ اُس روز یہی بات سن کر رضیہ بھابی نے ٹوک دیا۔

"اماں ......! سال بھر سے تو میں سن رہی ہوں کہ بس آنے والا ہے ...... آخر کب آئیں گے معظم بھائی ......؟" اور غالباً پہلی بار اماں کو احساس ہوا کہ اُسے گئے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔ تبھی بھابی کے ٹوکنے پر

چپ سی ہو گئیں اور بھابی انہیں مزید احساس دلاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"آپ ابا جی سے کہیں کہ اس طرح خاموش نہ بیٹھے رہیں بلکہ معلوم کریں کہ معظم بھائی کا کیا ارادہ ہے ......؟ آخر وہ اس طرح باہر جا کر کیوں بیٹھ گئے ہیں ......؟ ہم پر لڑکی بھاری نہیں ہے لیکن شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔ شمع نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب ہمیں اس کا گھر بسانا ہے۔"

"میں کئی بار تمہارے ابا سے کہہ چکی ہوں۔ وہ کہتے ہیں میں کیا کروں ......؟ معظم یہاں ہو تو بات کروں۔ اس کا تو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔" اماں نے کہا تو میں چونک گئی۔ یعنی ابا جی کو بھی معلوم نہیں ہے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔

"یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔ انہیں بتا کر جانا چاہئے تھا۔ اگر جلدی میں بھی گئے ہیں تو بعد میں خط وغیرہ تو لکھ سکتے تھے ......؟" بھابی تشویش ظاہر کرتے ہوئے بولیں اور قدرے توقف سے سوچ کر کہنے لگیں۔

"میرا تو خیال ہے اماں ......! اُن کے انتظار میں شمع کو بٹھائے رکھنا حماقت ہے۔ پتا نہیں اُن کا کیا ارادہ ہے؟" بھابی نے اماں کو ہولا کر رکھ دیا اور میں چپ چاپ وہاں سے اُٹھ آئی۔ کیونکہ مجھے بھابی کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا بلکہ اُن کی باتوں کو سوچتے ہوئے ہی مجھے خیال آیا کہ وہ شخص میری طرف سے مایوس ہو کر اب انتقاماً مجھے انتظار کی دہلیز پر بٹھائے رکھنا چاہتا ہے۔ جبھی تو اتنی خاموشی سے کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ ادھر ابا جی تھے کہ اس کے خلاف کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اماں کے بار بار ٹوکنے پر اُس روز ایکدم غصے میں آ گئے۔

"میں زبان دے چکا ہوں۔ شمع کی شادی ہو گی تو معظم سے اور بس۔"

میں نے ابا جی کا حتمی لہجہ اور حاکمانہ آواز اپنے کمرے میں سنی تھی اور ہمیشہ کی طرح سہم کر رہ گئی۔ پتا نہیں کیسے گزشتہ دنوں میں یہ سوچنے لگی تھی کہ کسی روز ابا جی کے مقابل کھڑی ہو جاؤں گی۔ اُن کے مقابل تو کیا میں تو کبھی اُن کے سامنے سر بھی نہیں اُٹھا سکی۔ خواہ جبر پہ جبر ہوتے رہیں۔ بہرحال اس کے بعد اماں کو ایکدم چپ لگ گئی اور بھابی نے بھی دوبارہ کبھی اس موضوع کو چھیڑنے کی غلطی نہیں کی۔ پھر میں نے کچھ وقت خاموشی سے گزارنے کے بعد اماں سے کہنا شروع کر دیا کہ وہ مجھے ابا جی سے اسکول میں جاب کی اجازت دلوا دیں کیونکہ بیکار بیٹھے بیٹھے میں ذہنی طور پر بالکل مفلوج ہوتی جا رہی تھی۔ اماں اس کے حق میں تو نہیں تھیں لیکن میری مسلسل ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے ابا جی سے بات کر لی۔

"کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کی ......؟" ابا جی مجھے بلا کر کہنے لگے۔

"کس چیز کی کمی ہے تمہارے پاس ......؟ کھانے کو نہیں مل رہا یا پہننے کو نہیں ہے ......؟"

"جی ......؟" میں کچھ ٹپٹا گئی۔ پھر سوچ کر دھیمی آواز میں کہا۔

"کمی تو کوئی نہیں ہے۔ بس فارغ بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ......"

"نہیں ......!" انہوں نے پوری بات سنے بغیر صاف منع کر دیا۔

"ہمارے ہاں لڑکیاں نوکری نہیں کرتیں۔ تم بھی کبھی ایسا خیال دل میں نہیں لانا۔ سمجھیں تم ......؟"

"جی ......!" میں نے سر جھکا لیا۔

"تمہیں اگر میں نے چار جماعتیں زیادہ پڑھائی ہیں تو یہ تمہارے مرحوم سسر کی خواہش تھی ورنہ میں کبھی

تمہیں گھر سے دور نہ بھیجتا۔'' انہوں نے یہ بات کہہ کر جانے مجھے کیا باور کرانے کی کوشش کی اور میں مزید اُن کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکی۔ اپنے کمرے تک آتے آتے میرے اندر محشر برپا ہو چکا تھا۔

(معظم جاہ......!) میں اب خود پر گزرنے والے ہر موسم کو اسی سے منسوب کرتی تھی۔ خواہ تکلیف ہو، دُکھ یا بے بسی، میرے ہونٹوں پر اسی کا نام آتا۔ کیونکہ میرے اندر یہ خواہش شدت اختیار کر گئی تھی کہ ایک بار میرا اُس سے سامنا ضرور ہو تا کہ میں سارے حساب بے باق کر دوں۔ اس وقت بھی میں نے اسی خواہش کے زیر اثر اُسے پکارا تھا اور جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ محبت کے مقابلے میں میری نفرت زیادہ زور آور ہے۔ دو روز بعد ہی ابا جی اماں کو اس کی آمد کا بتا رہے تھے۔



میری سوچوں کے بالکل برعکس میری ازدواجی زندگی کا آغاز بے حد خاموشی سے ہوا۔ یعنی میں جو یہ سوچ رہی تھی کہ معظم جاہ پا لینے کے نشے میں سرشار ہو کر پہلے مرحلے پر ہی مجھے اپنے جذبوں کی زور آوری اور صداقت پر ایمان لانے کو کہیں گے پھر اپنی بے پایاں محبت کا اظہار اور بدلے میں میں اپنی ساری نفرتیں ان کے جھولی میں ڈال کر انہیں ایسی گہری چوٹ لگاؤں گی جس کی شدت سے وہ بقیہ ساری زندگی سنبھلتے رہیں گے۔ ان کی یہی سزا تھی کیونکہ انہوں نے میرے ساتھ فاؤل کھیلا تھا۔ مجھ سے کہا وہ شادی سے منع کر دیں گے ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی تھی کہ میں جہانگیر کے سامنے ان کا نام نہ لوں اور خود جاتے جاتے اُسے بتا گئے تھے کہ میں ان کی منگیتر ہوں۔ میرے نزدیک یہ انتہائی چھچھوری بلکہ گھٹیا حرکت تھی جس سے مجھے شدید دھچکا لگا تھا اور اسی روز سے میں نے سوچ لیا تھا کہ معظم جاہ مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو میں انہیں ایک پل خوشی نہیں دوں گی۔

جس وقت وہ حجلۂ عروسی میں آئے میں اپنے اندر ایسا آتش فشاں لئے بیٹھی تھی جسے پھٹنے کے لئے ان کے چہرے پر پا لینے کی خوشی کا ایک ہلکا سا عکس ہی کافی تھا۔ کچھ دیر تک میں نے قصداً ان کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور خاصی لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کلائی میں پڑی چوڑیوں سے کھیلتی رہی۔ پھر اس کے بولنے کی منتظر بھی تھی اور وہ بہت دیر بعد بولا تو اس کے لہجے میں نہ پا لینے کی کھنک تھی نہ بے قراری اور نہ تسخیر کر لینے کا زعم۔ ٹھہرا ہوا سپاٹ لہجہ جیسے میری طرح وہ بھی مجبور ہوا یا مجبور کیا گیا ہو۔

''میرا خیال ہے ہمیں گزشتہ ساری باتیں بھلا دینی چاہئیں۔ یاد رہے میں نے باتیں کہا ہے جذبات پر ہمارا اختیار نہیں۔''

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہ گئی اور وہ اپنا حق استعمال کر کے بڑی خوبصورتی سے میرے سارے منفی جذبوں کے سامنے بند باندھ گیا۔ کسی بھی طرح کی وہ پہلے ہی مقام پر مجھے مغلوب کر گیا تھا۔ اس کے بعد قطعی انجان بن گیا۔ گویا میرے جذبوں پر بند باندھ کر وہ مطمئن ہو گیا تھا لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ لہروں کے سامنے بند باندھ دینے سے ان کا زور ٹوٹ نہیں جاتا بلکہ وہ سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ میرے اندر بھی تلاطم برپا تھا لیکن یہاں مجھ سے نادانی سرزد نہیں ہوئی۔ یعنی فوری طور پر رد عمل ظاہر کرنے کے بجائے میں نے خاموشی اختیار کر لی اور پھر یوں لگتا تھا جیسے ہمارے درمیان خاموش معاہدہ طے پا گیا ہے۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر ناشتہ کرتے ہوئے ان کی نظریں مسلسل اخبار کی سرخیوں پر بھٹکتی رہتیں۔ پھر آفس

جاتے ہوئے روزانہ ایک ہی جملہ بولتے۔

''اگر آپ کو کوئی ضرورت ہو یا کہیں جانا ہو تو مجھے رنگ کر لیجئے گا۔''

اس کے بعد سارا دن میں اور میری تنہائیاں۔ وہ شام میں آتے۔ شاور لینے کے بعد ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھتے تو میں خاموشی سے اُن کے سامنے چائے رکھ دیتی۔ اس کے بعد رات تک قصداً خود کو اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف رکھتی۔ پھر جب کمرے میں آتی تو وہ میرے منتظر ہوتے۔ دیکھتے ہی پوچھتے۔

''فارغ ہو گئیں آپ......؟'' میں بھی ''جی'' کہتی کبھی صرف سر ہلانے پر اکتفا کرتی۔

''او کے......! لائٹ آف کر دیں۔'' وہ کہتے ہوئے لیٹ جاتے اور جب میں لائٹ آف کر کے اپنی جگہ پر آتی تو وہ میرے تکیے پر اپنا بازو پھیلا دیتے۔ میں جیسے ہی سر رکھتی میری گردن میں اُن کے بازو کا حلقہ بن جاتا۔ مجھے اُن کی یہ حرکت سخت ناگوار گزرتی اور میں احتجاجاً اپنا سانس تک روک لیتی۔ ٹھیک کہا تھا انہوں نے کہ جذبات پر ہمارا اختیار نہیں۔ شب کی اس خاموشی میں دو متضاد جذبے ایک ساتھ انگڑائیاں لیتے تھے۔

وقت یونہی دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ ہماری شادی کو ابھی مہینہ بھر ہی ہوا تھا کہ اس شام جہانگیر آ گیا۔ اس کی آمد غیر متوقع نہیں تھی بلکہ میرے خیال میں تو اُسے شادی ہی میں آنا چاہئے تھا۔ بہر حال میں اس وقت معظم جاہ کے لئے چائے لے کر آ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر نظر انداز کر گئی اور چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر واپس پلٹنے لگی کہ انہوں نے پکار لیا۔

''شمع......!'' میں نے رُک کر دیکھا تو وہ جہانگیر سے کہنے لگے۔

''تم انہیں دیکھ کر حیران ہو گئے......؟''

''نہیں......!'' وہ بڑے آرام سے بولا۔

''مجھے بہت پہلے ان کی دوست شرمین نے بتایا تھا کہ یہ تم سے منسوب ہیں۔''

''شرمین......!'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ میں نے چونک کر معظم جاہ کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جانے کیوں مجھے عجیب سا لگا۔ پلٹ کر جانے لگی کہ وہ پھر پکار کر بولے۔

''شمع......! جہانگیر کے لئے چائے......!'' میں دوبارہ کچن میں آ گئی اور چائے بناتے ہوئے میری ذہنی رو جانے کہاں سے کہاں بھٹک گئی۔ شرمین کا خیال آنے پر غصہ آنے لگا کہ اگر اس نے جہانگیر کو میری اور معظم جاہ کی نسبت کا بتا دیا تھا تو پھر اُسے مجھے بھی آگاہ کرنا چاہئے تھا۔ کم از کم میں معظم جاہ کو تو الزام نہ دیتی۔ میرے اندر اُن کے خلاف کتنی کدورتیں تھیں۔ میں دل ہی دل میں شرمین کو گالیاں دیتی ہوئی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سے سجی ٹرے اُٹھا کر دوبارہ لاؤنج کی طرف آ رہی تھی کہ معظم جاہ کے منہ سے اپنا نام سن کر میرے قدم آپ ہی آپ رُک گئے۔ وہ بے حد آزردگی میں گھر کر کہہ رہے تھے۔

''میں شمع سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یقین کرو اس سے شادی کر کے میں ایک مجرمانہ احساس میں گھر گیا ہوں لیکن میں کیا کرتا؟ پاپا سے نسبت توڑنے کی بات کی تو انہیں صدمے سے ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ آخری وقت تک مجھ سے یہی کہتے رہے کہ میں زبان دے چکا ہوں۔ پھر انہوں نے مجھ سے نہ صرف وعدہ لیا بلکہ اپنی قسم بھی دی کہ میں اُن کی طے کی ہوئی نسبت توڑوں گا نہیں۔ میرا خیال تھا پاپا ٹھیک ہو جائیں گے پھر میں انہیں کسی

بھی طرح منالوں گا لیکن وہ مجھے وعدے اور قسم کی زنجیر میں جکڑ کر چلے گئے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"میں اس وقت بہت ڈسٹرب تھا۔ بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں......؟ تب میں نے شمع کو فون کیا تا کہ اُسے اپنی مجبوری بتا کر سمجھا سکوں کہ وہی اپنے اندر حوصلہ پیدا کرے لیکن اس نے میری بات ہی نہیں سنی۔ تب میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں چُپ چاپ یہاں سے کہیں دُور چلا جاؤں۔ تین سال کم نہیں ہوتے خصوصاً ایسی صورت میں کہ میرا کوئی اتا پتا، کوئی نشان ہی نہیں تھا اور میرا خیال تھا میری طرف سے مایوس ہو کر اس کے گھر والے اس کی کہیں اور شادی کر دیں گے۔ تب میری بات بھی رہ جائے گی اور اس کی بھی لیکن......"

وہ خاموش ہو گئے اور میں، میرے اندر شور مچاتی لہریں سرکشی کی آخری حدوں کو چھو کر دم توڑ رہی تھیں۔

(معظم جاہ......!)۔ میرے اندر اچانک کتنی آزردگی سمٹ آئی تھی اور گزشتہ کئی برسوں سے میں خود پر گزرنے والے ہر موسم کو انہی سے منسوب کر رہی تھی۔ خواہ تکلیف ہو، دُکھ یا بے بسی، میرے ہونٹوں پر انہی کا نام آتا تھا۔ اب بھی اُن ہی کا نام تھا لیکن مجھ پر گزرنے والے دُکھ بھرے موسم کی نوعیت یکسر مختلف تھی۔

جانے کیسی ہوا چلی تھی جو نفرتوں اور کدورتوں کو اپنے ساتھ اُڑائے جا رہی تھی۔ باقی ندامتیں تھیں تو انہیں دھونے کے لئے آنکھوں میں برسات بہت تھی۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں جہانگیر......!" کتنی دیر بعد معظم جاہ کی آواز سنائی دی۔ جواب میں جہانگیر نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"مجھ سے کیوں......؟" پھر خود ہی سمجھ کر کہنے لگا۔

"کم آن یار......! مجھے تو پہلے مرحلے پر ہی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تم سے منسوب ہے تم ناحق پریشان ہو بلکہ مجھے لگتا ہے تم نے اس لڑکی کو بھی پریشان کر رکھا ہے کیونکہ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔"

"مجھ سے......؟" معظم جاہ حیران ہوئے۔

"ہاں......! تم سے میرے نادان دوست......! تم اتنا بھی نہیں جان سکے کہ یہ محبت نہیں تو اور کیا ہے جو وہ تمہاری طرف سے مایوس ہونے کے بجائے تمہارا انتظار کرتی رہی ورنہ اس کے لئے کیا کمی تھی......؟" وہ معظم جاہ کو یقین دلا رہا تھا اور میری پُرنم آنکھوں میں وہ منظر جھلملانے لگا جب دُھند کے اس پار میری چادر ہوا میں لہرا رہی تھی جب اُس نے اپنی چادر مجھے تھمائی تھی اور اب وہ میری چادر دیواری کو میرے لئے مضبوط کر رہا تھا۔

میں نے گہری سانس لی اور ہونٹوں کے اندر روک کر ہاتھوں میں پکڑی ٹرے قریب ہی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی۔

پھر پردے کی اوٹ سے ذرا سا جھانک کر دیکھا سامنے معظم جاہ تھے آنکھوں میں پا لینے کا خمار جس نے انہیں بے حد جاذب نظر بنا دیا تھا۔ میں بس ایک پل کو انہیں دیکھ سکی اور اس ایک پل نے میری دُنیا ہی بدل ڈالی۔ سمجھ میں نہیں آرہا سب سے پہلے کسے بتاؤں کہ وہ جو برسوں مجھے کھوجتا اور خدا سے مانگتا رہا ہے وہ ابھی ابھی میرے دل میں گھر کر گیا ہے اور اس گھر کی پاسبانی پر کھڑے شخص کو میں بھولنے کے باوجود اپنی دُعاؤں میں یاد رکھوں گی۔

⊖ ⊖ ⊖

نئے موسموں کی نوید

آج ایک مہینہ ہو گیا تھا یعنی پورے تیس دن سے وہ اسے اپنے راستے میں کھڑا دیکھ رہی تھی۔ جس وقت وہ کالج جانے کے لئے گھر سے اسٹاپ تک جاتی اس وقت تو وہ اسے کہیں یعنی آس پاس کہیں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ ایک مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر بس کو دیکھنے کے لئے گردن موڑتی تو پہلی نظر اس پر پڑتی تھی۔ ابتدائی دنوں میں تو اس نے کوئی خیال نہیں کیا۔ ظاہر ہے بس اسٹاپ تھا وہاں کوئی بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔

لیکن ہفتہ دس دن کے بعد ہی اس کی چھٹی حس نے الارم بجانا شروع کر دیا تھا کہ جو کوئی بھی ہے اور کہیں بھی جا رہا ہے یہ کوشش ضرور کرتا ہے کہ اس سے سامنا ہو۔ پھر وہ لاکھ پہلو بدلتی یا ماتھے پر لکیریں کھینچتی وہ ایک خاص انداز سے اس کی طرف دیکھے چلا جاتا۔ وہ چھچھورا نہیں تھا نہ ہی غیر مہذب نظر آتا تھا پھر بھی یوں سرِ عام اس کا دیکھنا اچھا نہیں لگتا تھا خواہ مخواہ اپنی پوزیشن خراب ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

اور اب تو ایسا ہونے لگا تھا کہ جس بس میں وہ سوار ہوتی وہ بھی اسی بس میں سوار ہوتا۔ پھر اس کے بعد وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ پہلے اُترتی ہے یا وہ۔ اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر اُترتے ہی وہ سر جھکا کر جو چلتی تو کالج گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد ہی سر اُٹھاتی تھی۔ ویسے بھی وہ خاصی ڈرپوک اور بزدل واقع ہوئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی اسے ٹوک بھی سکتی ہے۔

ادھر ایک ہفتے سے تو ایسا ہو رہا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکتا اور پھر جہاں وہ کھڑی ہوتی اس سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو جاتا تھا اور پھر جس طرح اس کے ساتھ ہی بس میں سوار ہوتا۔ اس طرح دیکھنے والے یہی سمجھتے ہوں گے کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ گو کہ کسی کو ان کی طرف دیکھنے کی فرصت تو نہیں ہوتی تھی بہرحال اسے ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ سب اسے دیکھ رہے ہیں اور اس صورتِ حال نے اسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ وہ خود تو مر کر بھی اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اور یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے۔

(آخر کس سے کہوں......؟) اس نے بے حد پریشان ہو کر سوچا اور آخر میں فیصلہ کیا کہ اسے ابا میاں سے کہہ دینا چاہئے کہ صبح کالج جاتے ہوئے اسے کچھ پریشانی کا سامنا ہے۔ ایک ابا میاں ہی تو تھے اور کون تھا بھلا اس کا۔ اس کی پیدائش پر ہی اماں کا انتقال ہو گیا تھا اور کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ اس کے دُنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جو ابا میاں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹا تھا تو وہ اب جیسے اسی میں کھو گئی ہوئی تھی۔ گو کہ دادی بھی تھیں مگر تین سال پہلے جب وہ میٹرک میں تھی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ پھر بھی جتنی مانوس وہ ابا میاں سے تھی اتنی کسی

سے نہیں ہوئی۔ دادی سے بھی نہیں اور اب تو وہ تھیں ہی نہیں اس لئے اسے یہ بات بھی ابا میاں ہی سے کہنی تھی۔

ابا میاں اس کی نظروں میں دُنیا میں سب سے زیادہ معتبر شخص تھے اور اب تک اس کی ساری سوچیں انہی کے گرد گھومتی تھیں۔ وہ تھے بھی ایسے نرم خو، متقی، پرہیزگار اور راضی بہ رضا رہنے والے، نہایت مخلص اور ایماندار۔ اوّل دن جس فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ کی کرسی پر بیٹھے تو اب تک اسی کرسی پر تھے۔ لاکھوں روپیہ ان کے ہاتھوں سے ڈیل ہوتا مگر مجال ہے جو اپنی تنگی یا کبھی تنخواہ میں کوئی کمی محسوس ہوئی ہو۔ جو ملا اسی پر قناعت کیا۔ مالک نے اپنی خوشی سے تنخواہ بڑھا دی تو ٹھیک، ورنہ کبھی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔ ایک زمانہ ان کی شرافت اور ایمانداری کی قسمیں کھا سکتا تھا اور وہ تو آنکھ بند کر کے یقین کرتی تھی۔

(ابا میاں جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا)۔ اس کا ایمان تھا اور ابا میاں نے اس کی تربیت ایک خاص انداز سے کی تھی۔ اُٹھنے بیٹھنے اور بولنے چالنے میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ آواز میں نرمی کہ جب ہونٹ جنبش کرتے تو مقابل کو اپنی پوری توجہ مبذول کرنی پڑتی تھی اور گھر کی چار دیواری سے نکل کر وہ صرف اسکول اور پھر کالج تک ہی محدود تھی اس لئے زمانے کے چلن کو بالکل بھی نہیں سمجھتی تھی۔ ایک طرح سے اپنے خول میں بند ایک بزدل لڑکی تھی۔

اب جو اسے یہ صورت حال درپیش آئی تو وہ بہت پریشان ہو گئی۔

پہلا خیال یہی آیا کہ کہیں ابا میاں کی عزت پر کوئی حرف نہ آئے اور اس سے پہلے کہ کسی اور ذریعے سے ابا میاں تک یہ بات پہنچے اسے خود ہی ان سے بات کر لینی چاہئے۔ یہی سوچ کر وہ ان کے پاس بیٹھی تھی لیکن جب ان کے چہرے پر نظر پڑی تو بھول گئی کہ اسے کیا کہنا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ اسے اپنی بات کہنے کے لئے کوئی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کیونکہ وہ تو شروع ہی سے اپنی ہر بات ابا میاں سے کہنے کی عادی تھی۔

اس وقت کوئی چیز رُکاوٹ بنی تو وہ ابا میاں کی اپنی پریشانی تھی۔ اس نے دیکھا ان کے چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال بنا تھا۔ آنکھیں گہری سوچ میں اور ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے میں اُلجھی ہونے کے باوجود ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

''ابا میاں......!'' اس نے آہستہ سے پکارا۔ جواب میں ان کی پُرسوچ نظریں اس پر آ ٹھہریں۔ انداز ایسا تھا جیسے دیکھ تو اسے رہے ہیں لیکن ذہن اب بھی کہیں اُلجھا ہوا ہے۔

''ابا میاں......!'' اس نے دوبارہ پکارا۔

''کہو بیٹا......! کیا بات ہے......؟'' ابا میاں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''آپ کچھ پریشان ہیں......؟'' وہ ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ابا میاں نے طویل سانس لیا پھر نفی میں سر ہلانے لگے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ ایک وہی تو تھے جنہیں وہ سمجھتی تھی۔ ان کا ہر انداز خوشی، غم، دُکھ، پریشانی سب وہ ایک پل میں محسوس کر لیتی۔ وہ خوش ہوتے تو وہ ان سے زیادہ سرشار...... وہ افسردہ دکھائی دیتے تو وہ ان سے زیادہ آزردہ دکھائی دیتی۔ وہ پریشان تو اس پر نیندیں حرام ہو جاتیں۔

اب بھی وہ اپنی پریشانی بھول گئی۔ گو کہ ابا میاں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ پریشان نہیں ہیں اور ان کے سامنے اس نے اپنے آپ کو مطمئن ظاہر بھی کر دیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ بے حد پریشان تھی۔

اسے یقین تھا کہ کوئی بات ضرور ہے جو ابا میاں کے لئے پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے اور وہ اسے بتا نہیں رہے۔

نصف شب اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے دیکھا ابا میاں جاءنماز پر بیٹھے ہیں۔ ہتھیلیاں آسمان کی طرف بلند کئے بہت ہلکی آواز میں مناجات پڑھ رہے تھے۔

''گناہوں کا بوجھ مجھ پہ ہے بارِ الم
تجھی کو ہے پیدا کئے کی شرم
یہی التجا ہے میری دم بہ دم
میری بار کیوں دیر اتنی کری؟''

ان کی آواز کا بھیگا پن بتا رہا تھا کہ آنکھیں اشکوں کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہو گئی ہیں۔ ابا میاں رو رہے ہیں اور وہ چین سے سوئے، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ بے قراری سے اُٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے اب ایک ہی مصرعہ کو بار بار دہرا رہے تھے۔

''نہ دُنیا میں ہو میری پردہ دری''

بند آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر چہرے اور داڑھی کو بھگو رہے تھے۔ حرکت کرتے ہونٹوں میں الفاظ ٹوٹنے لگے اور وہ اسی طرح سجدے میں گر گئے۔ کتنی دیر تک وہ ان کے ہلتے وجود کو دیکھتی رہی۔ پھر صبر اور ضبط کا یارا نہ رہا تو ان کے کندھوں کو تھام لیا۔

''ابا میاں......!'' اس نے پکارا اور پھر جھنجھوڑ ڈالا۔ انہوں نے سجدے سے سر اُٹھایا۔ پہلے بھیگے چہرے کو ہتھیلیوں سے صاف کیا پھر نرمی سے کہنے لگے۔

''تم کیوں اُٹھ گئیں بیٹا......؟''

''آپ کیوں رو رہے ہیں ابا میاں......؟ مجھے بتائیں ناں......!''

''بس یونہی بیٹا......! اپنے رب کے حضور جھکا تو دل بھر آیا۔''

''نہیں......! آپ پریشان ہیں...... مجھے بتاتے کیوں نہیں......؟''

''ارے......!'' انہوں نے اپنے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

''جس کی تمہارے جیسی بیٹی ہو اسے کیا پریشانی ہو سکتی ہے......؟''

''آپ مجھے بہلا رہے ہیں......؟'' اس کی بات پر وہ ہلکے سے مسکرائے۔

''گویا اب تم اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ تمہیں بہلایا نہیں جا سکتا......؟''

''اور آپ مجھے بہلانا کیوں چاہتے ہیں......؟ اصل بات کیوں نہیں بتاتے......؟''

''اصل بات......؟'' لمحہ بھر کو ابا میاں سوچ میں پڑ گئے۔ پھر جاءنماز لپیٹنے کے بہانے اُٹھ کھڑے ہوئے جبکہ وہ نہ صرف وہیں بیٹھی رہی بلکہ انہیں اپنی سوالیہ نظروں کی گرفت میں بھی لے رکھا۔

''بیٹا......! کوئی بات نہیں ہے...... جاؤ سو جاؤ۔'' اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ابا میاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پھر اُٹھنے کے لئے کہا۔

''سب ٹھیک ہے...... چلو یوں پیچھے مت بیٹھو۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تو ابا میاں اسے سونے کو کہہ کر خود اپنی

جھک لیتے۔

پھر اگلے تین چار دن تک اس نے ہر بات معمول کے خلاف ہوتے دیکھی۔ ابا میاں جو صبح سات بجے ہی آفس کے لئے گھر سے نکل جاتے تھے اب جب وہ کالج کے لئے نکلتی تو اس وقت تک گھر ہی میں ہوتے تھے اور ان کی واپسی بھی بہت جلدی ہوتی۔ ان تین دنوں میں اس نے محسوس کیا جیسے ہر گزرتا پل ان کی پریشانی میں اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ اتنے بوڑھے تو وہ نہیں تھے جتنے اب نظر آنے لگے تھے۔

"یہ سب آزمائشیں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اب نہیں تو کبھی نہ کبھی ضرور میری بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔" وہ ابا میاں کے لئے چائے لے کر آئی تھی جب ان کی بڑبڑاہٹ اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"ابا میاں.....!" اس نے سامنے آکر چائے کا پیالہ ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ "آپ کچھ کہہ رہے تھے۔"

"نہیں.....!" اس کے ساتھ انہوں نے چائے کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہی پھر اسی خاموشی سے وہاں سے پلٹ آئی۔ کالج کو دیر ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی شوز پہنے پھر بیگ اُٹھا کر ابا میاں کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔

(پتا نہیں ابا میاں کیا کہہ رہے تھے.....؟ آزمائشیں.....؟ بے گناہی.....؟)۔ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کا ذہن انہی باتوں میں اُلجھتا جا رہا تھا اور جب اسٹاپ پر وہ اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی ہوئی تب بھی وہ مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی۔ جبھی تو بس سامنے آکر رکی اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔

"سنیں.....! آپ کی بس.....!" اسے اپنے قریب آواز سنائی دی تو چونک کر سر اُٹھایا۔ وہی تھا جو گزشتہ ڈیڑھ مہینے سے صرف دیکھنے پر اکتفا کرتا تھا اور آج مخاطب کرنے کی جسارت بھی کر گیا تھا۔

وہ بزدل تھی۔ اس کی بہت عام سی بات سے بھی ڈر گئی اور پلٹ کر تقریباً بھاگتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی۔ پھر نہ صرف بقیہ تمام راستہ بلکہ کالج میں بھی سارا وقت وہ اسی کے خیال سے پریشان رہی اور یہی سوچتی رہی کہ (پہلے صرف دور سے دیکھتا تھا پھر پاس آکر کھڑا ہونے لگا اور آج تو بات بھی کر لی۔ پتا نہیں کل کیا ہو.....؟ اس سے پہلے کہ مزید پیش قدمی کرے مجھے ابا میاں کو بتا دینا چاہئے۔ ویسے بھی آج کل ابا میاں دیر سے آفس جاتے ہیں۔ میں کہوں گی میرے ساتھ ہی نکلا کریں)۔ آخر میں وہ یہی سوچ کر مطمئن ہوئی تھی۔

دوپہر میں، جب وہ کالج سے لوٹی تو گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ آنگن پار کر کے جب وہ کمرے میں آئی تو کتنی دیر تک حیران پریشان کھڑی چاروں طرف نظریں دوڑاتی رہی۔ ساری چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بہت عجلت میں کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ پہلے اسے ابا میاں کا خیال آیا۔

(لیکن وہ تو ایسا نہیں کر سکتے)۔ اس نے سوچا اور پھر فوراً ہی ایک نئے خیال نے اسے خوفزدہ کر دیا۔

"تو کیا کوئی چور.....؟" وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔ کندھے سے بیگ اُتار کر وہیں کھڑے کھڑے پلنگ پر پھینکا اور جیسے ہی واپس پلٹی دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"شاید ابا میاں.....؟" خوفزدہ تو تھی ہی اس لئے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی اور بغیر تصدیق کئے

دروازہ کھول دیا۔ ایک اور شاک..... سامنے وہ کھڑا تھا جس کی وجہ سے وہ گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے پریشان تھی اور اندر ہی اندر خوفزدہ بھی۔ اب جو اپنے دروازے پہ دیکھا تو رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ "تم.....!" کہنے کی کوشش میں ہونٹ نیم وا ہو کر رہ گئے اور اندر کا خوف پورے چہرے اور خاص کر آنکھوں میں سمٹ آیا تھا اور اس کی کیفیت قدرے مختلف تھی۔ جیسے اسے یقین تو تھا کہ اسے اسی دروازے پر آنا تھا لیکن اس دروازے پر اس کی موجودگی باعث حیرت بھی تھی..... تشویش بھی اور اُلجھن بھی۔

"آپ.....؟" غیر یقینی سے لہجے میں وہ پہلے اسی قدر کہہ سکا۔ وہ دروازہ بند کرنا چاہتی تھی کہ اس نے درمیان میں ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ ثوبیہ ہیں.....؟" وہ یقین چاہتا تھا۔

(میرے خدا.....! یہ تو نام بھی جانتا ہے)۔ وہ جھٹلانا چاہتی تھی لیکن اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ اس کا چہرہ لمحہ بھر کو تاریک ہوا لیکن دوسرے ہی پل وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا اور اس کی کلائی تھام لی۔

"میرے ساتھ چلو.....!" اس کا لہجہ اور انداز یکسر بدل گیا۔

اس نے بمشکل تمام اپنی ساری ہمتیں مجتمع کیں اور جیسے مدد کے لئے چیخنا چاہا لیکن ایک سفید رومال پہلے اس کی ناک اور پھر پورے چہرے کو ڈھانپ گیا۔

○ ○ ○

اسے ہوش آیا تو وہ ایک بالکل اجنبی جگہ پر تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ کبھی کبھی نظروں سے کبھی چھت اور کبھی دیواروں کو دیکھتی رہی۔ پھر نظریں بھٹکتی ہوئی کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ کمرہ نہ بڑا تھا اور نہ بہت زیادہ چھوٹا۔ درمیان میں ایک مسہری جس پر وہ لیٹی تھی۔ بائیں طرف دیوار کے ساتھ ایک الماری رکھی تھی۔ اس کے ساتھ پردے لٹک رہے تھے جن کے پیچھے یقیناً کھڑکی ہوگی۔ پھر سامنے جگہ خالی تھی۔ دائیں کونے میں جگہ خالی تھی۔ فقط ایک کرسی اور اس پر بیٹھی بوڑھی عورت نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ وہ عورت اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اب جو اسے اپنی طرف دیکھتے پایا تو چپ چاپ اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی اور وہ ابھی کچھ سوچنا ہی چاہتی تھی کہ وہ دروازے سے داخل ہوتا نظر آیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے.....؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ آنکھوں میں البتہ بے شمار سوال مچلنے لگے تھے جنہیں سمجھنے کے باوجود وہ نظر انداز کر گیا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ کتنے لمحے یوں ہی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر اسی نے ہمت باندھی کہنے لگی۔

"مجھے اول روز ہی شبہ ہوا تھا کہ تم اچھے آدمی نہیں ہو۔"

"اور اب میری اس حرکت سے تو آپ کو یقین ہو گیا ہوگا۔" وہ اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے بول پڑا۔

"ہاں.....!" اس کے ساتھ ہی وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر رو پڑی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ خیال تھا وہ خود ہی چپ بھی ہو جائے گی لیکن کتنی دیر گزر گئی۔ چپ ہونا تو دور کی بات اس کی سسکیوں میں اضافہ

ہی ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر اسے مداخلت کرنا پڑی۔

"پلیز...... ! بند کریں رونا۔" پہلے نرمی سے کہا وہ نہیں مانی تو اونچی آواز میں چیخا۔ بزدل تو تھی ہی اس کے چیخنے پر فوراً چپ ہو گئی اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو لمحہ بھر کو تو وہ بھی ڈگمگا گیا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

"دیکھیں...... ! میں آپ کو یہاں کسی غلط مقصد سے نہیں لایا۔"

"تمہارا مقصد خواہ کچھ بھی ہو لیکن خدا کے لئے مجھے فوراً گھر واپس چھوڑ آؤ۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابا میاں کے آنے سے پہلے اگر میں گھر پہنچ جاؤں تو......"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"کیوں ممکن نہیں ہے......؟ اگر تمہارا مقصد میرے ابا میاں سے رقم وصول کرنا ہے تو تمہیں سخت مایوسی ہوگی کیونکہ ہم سفید پوشوں کے پاس نہ تو اتنی بڑی رقم ہوتی ہے اور نہ ہی ہم اس کا بندوبست کر سکتے ہیں۔"

"میرا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔" وہ دوسرا سگریٹ جلاتے ہوئے آرام سے بولا۔

"پھر...... پھر کیا چاہتے ہو تم......؟"

"بات صرف اتنی سی ہے توبیہ غلام علی...... ! کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں اور جو مجھے اچھا لگے میں اسے اسی طرح......"

"انتہائی گھٹیا حرکت ہے یہ۔" وہ اس کی بات کاٹ کر چیخی۔

"کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری اس حرکت سے میں اور ابا میاں زندہ درگور ہو جائیں گے......؟"

"بس کچھ دن کی بات ہے پھر میں تمہیں واپس چھوڑ آؤں گا۔"

"کچھ دن......؟" وہ کتنی دیر تک غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"کچھ دن میں قیامت نہ آ جائے گی......؟ ابا میاں میری پُراسرار گمشدگی کو کیا نام دیں گے......؟ اور میں واپس کیا منہ لے کر ان کے سامنے جاؤں گی......؟ نہیں...... تم خدا کے لئے مجھے جانے دو۔" اس کے ساتھ ہی وہ چادر پھینک کر مسہری سے اتر آئی۔

"ارے ارے......!" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا تو وہ ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگی۔

"مجھے جانے دو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ ابا میاں ایک پل زندہ نہیں رہ سکیں گے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" اس کا لہجہ پھر بدل گیا اور اسے دھکا دے کر دوبارہ مسہری پر گراتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم یہاں سے نہیں جا سکتیں۔ اپنے آپ کو میری قید میں سمجھو۔ یاد رکھو اگر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو......" سگریٹ پھینک کر جوتے سے مسلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس نے باہر سے دروازہ لاک ہونے کی آواز سنی پھر وہیں بازوؤں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

کتنی دیر گزر گئی...... آنسو خشک ہو گئے...... سسکیاں دم توڑ گئیں پھر بھی وہ یوں ہی اوندھی لیٹی رہی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر آہستہ آہستہ ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ تب بھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ وہ اسے یہاں کیوں لایا ہے......؟ اس کی یہ بات کہ وہ اسے اچھی لگی ہے اسی لئے تو اس بات پر دل یقین کرنے کو آمادہ

نہیں تھا۔

(کیا ابا میاں سے کوئی دشمنی......؟) اس نے سوچا پھر فوراً ہی اپنی سوچ کی نفی کر دی۔

(نہیں...... ! ابا میاں تو بہت اچھے ہیں۔ ان سے کسی کو آج تک کوئی شکایت نہیں ہوئی...... کہاں دشمنی......؟ پھر......؟" پھر جتنا سوچتی ذہن اسی قدر الجھتا جا رہا تھا۔ دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کمرہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"رات ہو گئی۔" وہ بڑبڑائی اور اٹھ کر سوئچ بورڈ تلاش کرنے کے بجائے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھنے لگی۔ دور تک کہیں ہلکی سی روشنی کا نشان بھی نہیں تھا۔

(پتا نہیں میں کہاں ہوں......؟) وہ سوچتی ہوئی دوبارہ مسہری تک آئی اور بیٹھتے ہی ابا میاں کا خیال آیا۔

(مجھے نہ پا کر پتا نہیں ابا میاں پر کیا گزری ہوگی......؟) اس خیال کے ساتھ ہی آنکھوں میں پھر سیلاب اتر آیا جو پلکوں کا بند توڑتا ہوا اس کے رخساروں اور گود میں رکھے ہاتھوں کو تر کرتا گیا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی...... پتہ نہیں اس نے سنی نہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کی۔ وہ اندر آیا، لائٹ جلائی تب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"آپ ابھی تک رو رہی ہیں۔" وہ چکر کاٹ کر اس کے سامنے آیا اور بے آواز آنسوؤں سے روتے ہوئے دیکھ کر قدرے جھکتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم......" وہ ایک دم اس پر جھپٹ پڑی۔ سدا کی بزدل اس وقت جانے کیسے اتنی ہمت کر گئی تھی کہ سینے کے پاس سے اس کی قمیص کو دونوں مٹھیوں میں جکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے کے ساتھ گالیوں سے بھی نوازتی گئی اور وہ اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہیں تھا اور شاید اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک اس پر جھپٹ پڑے گی۔ پہلے لڑکھڑایا اور پھر اسے روکنے کی کمزور سی کوشش کی اور بالآخر مرد تھا۔ اس کی کلائیوں پر گرفت مضبوط کر گیا۔

"چھوڑو مجھے......!" وہ چیخی اور وہ ایک جھٹکے سے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کھڑکی کی طرف پلٹ کر جاتے ہوئے بولا۔

"یہ تو طے ہے توبیہ غلام علی...... ! کہ آپ کو ایک طے شدہ پروگرام کے تحت غیر معینہ مدت تک کے لئے یہیں رہنا ہے۔ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اس لئے آپ کی ایسی کوشش فضول ہوگی۔"

پھر کھڑکی میں لگی گرل سے کندھا لگا کر اس کی طرف پلٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"آپ اگر تعاون کریں تو یہ وقت سہولت سے کٹ سکتا ہے۔"

"کیسا تعاون......؟"

"کوئی پرابلم کھڑی کرنے کے بجائے اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اطمینان سے رہیں۔"

"اطمینان سے......؟" اس نے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

"میرا یقین کریں، میں ان شاء اللہ بہت جلد آپ کو واپس گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"کون سے گھر......؟ کیا اس گھر میں اب میرے لئے کوئی جگہ رہی ہوگی......؟ میرے خدا......! میں تو

ابا میاں کا سامنا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔" وہ پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"میرے خدا...... ! یہ اتنے آنسو کہاں سے آجاتے ہیں آپ کی آنکھوں میں۔" وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر اس کے قریب آیا اور جیسے ہی اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھنے لگا وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"چلیے کھانا کھالیں۔" اس کے ہلکے پھلکے انداز پر وہ چڑ گئی۔

"مجھے نہیں کھانا۔"

"آپ نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"تمہیں اس سے کیا......؟ بس مجھے نہیں کھانا۔"

اسی وقت وہ بوڑھی خاتون کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر چلی آئی۔ وہ دیکھتے ہی ان کی طرف لپکا۔

"ارے بی بی...... ! آپ نے کیوں تکلیف کی......؟ میں ابھی آرہا تھا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا......!" بی بی نے ٹرے اس کے ہاتھوں میں تھمائی پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ چہرے سے ہاتھ ہٹا کر ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مسلسل رونے کی وجہ سے آنکھیں سرخ تو ہو رہی تھیں۔ اب تو پوری طرح کھل بھی نہیں رہی تھیں۔

"بیٹی...... ! آؤ کچھ کھالو۔" بی بی کے پُر شفقت اور محبت بھرے اصرار پر بھی اس نے ان کی بات نہیں مانی اور انکار کرتی رہی۔

"مجھے کچھ نہیں کھانا اور اگر زیادہ ہی شوق ہے مجھے کھلانے کا تو زہر لا دو۔"

"بیٹی......! ایسی باتیں نہیں کرتے۔" بی بی نے بڑھ کر اس کا بازو تھاما اور مسہری پر بٹھانے کے بعد اس سے کہنے لگیں۔

"ولید...... ! تم باہر جاؤ...... اپنی بیٹی کو کھانا میں خود کھلاؤں گی۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کیا کہ وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر تک بی بی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر اس کے ہاتھوں کو اپنے بوڑھے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنے لگیں۔

"کیا میری بات بھی نہیں مانو گی......؟" وہ خاموش رہی۔

"چلو...... میں خود تمہیں کھلاتی ہوں۔" انہوں نے ٹرے اٹھا کر اپنے سامنے رکھی پھر نوالہ بنا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میں نہیں کھاؤں گی۔" اس نے پھر انکار کیا۔

"نہیں کھاؤ گی تو رات میں نیند نہیں آئے گی۔"

(نیند تو ویسے بھی نہیں آئے گی)۔ اس نے سوچا۔

"لو بیٹی......!" پھر محبت بھرا اصرار تھا۔ اس نے انکار تو نہیں کیا لیکن اپنی طرف بڑھے ہوئے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"پہلے بتائیں مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے......؟"

"میں یہ سب نہیں جانتی۔"

"کیسے نہیں جانتیں......؟ آپ ماں ہیں اس کی۔"

"میں اس کی ماں نہیں ہوں...... ہاں ماں کی طرح ضرور ہوں۔"

"جو کوئی بھی ہیں۔ یاد رکھیں آپ اس کے جرم میں برابر کی شریک ہیں۔"

"کون سا جرم......؟"

"مجھے یہاں لا کر اس نے جرم نہیں تو کیا نیکی کی ہے؟" وہ ان کی کلائی چھوڑ کر دانت پیستے ہوئے بولی۔

"میں نہیں جانتی لیکن یہ یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ کوئی نیکی ہی کر رہا ہوگا۔"

"ہونہہ...... ! نیکی......؟ دوسرے کی عزت کو دن دہاڑے اغواء کر کے لے آیا ہے اور آپ اسے نیکی کہہ رہی ہیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"آپ کو کم از کم اتنا اندازہ تو ضرور ہوگا کہ میری گمشدگی سے میرے ابا میاں پر کیا گزری ہوگی......؟ اور کیا آپ نہیں جانتیں کہ بیٹیوں کی عزت آبگینے کی مانند ہوتی ہے......؟"

"میں جانتی ہوں لیکن......" بی بی نے طویل سانس لیا پھر کہنے لگیں۔

"چلو چھوڑو...... پہلے کھانا کھاؤ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بھوک تو ضرور ہوگی...... صبح سے کچھ نہیں کھایا...... چلو ایسا کرو تم خود ہی کھالو...... میں جب تک تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔"

بی بی کو شاید یقین تھا کہ وہ اب زیادہ دیر کھانے کو نظر انداز نہیں کر سکے گی۔ اس لئے چائے بنانے کے بہانے اٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر تک تو وہ بالکل خالی الذہن سی بیٹھی رہی پھر ٹرے پر نظر پڑی تو بھوک کی شدت سے اب پیٹ میں درد کا احساس ہونے لگا۔ پھر واقعی وہ ہاتھ نہ روک سکی اور آہستہ آہستہ کھانے لگی۔

بی بی جان بوجھ کر چائے دیر سے لائیں اور جب وہ چائے لے کر آئیں تو وہ بھی ان کے ساتھ اندر آیا۔ ایک نظر ٹرے کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ بی بی نے چائے کا مگ اسے تھمایا اور ٹرے اٹھا کر واپس چلی گئیں۔

اس کا خیال تھا شاید وہ پھر کوئی سوال کرے گی لیکن اس نے خاموشی سے چائے پی اور اٹھ کر خالی مگ میز پر رکھنے کے بعد اس کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو اب تم جاؤ یہاں سے۔

"سونے کا ارادہ ہے......؟" اس نے اٹھتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔ وہ جواب دینے کے بجائے آکر مسہری پر بچھی چادر ٹھیک کرنے لگی۔

"اوکے...... ! شب بخیر......!" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ باہر سے دروازہ لاک کرنے کی آواز آئی تو لمحہ بھر کو اس کے ہاتھ فوم کی سطح پر ٹھہر گئے اور وہ بے حد خاموش نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ حالانکہ دن بھر رونے کی وجہ سے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

اجنبی جگہ، اجنبی لوگ، جانے کیا ہو جائے......؟ حالانکہ اس نے اپنے اطمینان کے لئے اندر سے دروازے کی کنڈی لگادی تھی پھر بھی اسے ڈر لگ رہا تھا۔ مسلسل کروٹیں بدلنے سے تھک گئی تو اٹھ کر کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ چاروں طرف تاریکی نے اپنی چادر تان رکھی تھی۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ اُکتا کر واپس پلٹنے لگی تھی کہ ننھے سے شعلے نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ بغور اسی طرف دیکھنے لگی اور پھر ایک ننھی سی چنگاری کو کبھی اُوپر اٹھتے اور کبھی نیچے گرتے دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ وہ وہیں کہیں کھڑا سگریٹ پی رہا ہے۔

(گویا اسے اب بھی خدشہ ہے کہ میں اس زنداں سے نکلنے کی کوشش کروں گی)۔ اس نے جل کر سوچا اور وہاں سے ہٹ آئی۔ پھر بقیہ رات اس نے سوتے جاگتے ہی گزاری۔ کسی وقت آنکھ لگ جاتی لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ صبح کے قریب ہی شاید اسے گہری نیند آئی تھی اور جب اس نے باہر سے لاک کھول کر دروازہ کھولنا چاہا تو وہ اندر سے بند تھا۔ دو تین بار دستک بھی دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر اس نے دوسری طرف سے آکر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تھا اور اسے گہری نیند سوتے دیکھ کر اس نے بی بی کو کچھ ہدایات دیں اور پھر چلا گیا۔

کافی دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کتنی دیر تک وہ یونہی بے حس و حرکت پڑی چھت پر گھورتی رہی۔ جب ذہن بیدار ہوا تو پہلا خیال ابا میاں کا آیا۔ پھر اس کی باتیں کہ اسے کچھ دن یہیں رہنا ہے۔ ایک بار پھر اُلجھی ڈور کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو مایوس ہو کر اٹھ بیٹھی۔ دروازے کی طرف دیکھا وہ اسی طرح بند تھا۔ اطمینان کا سانس لے کر اٹھی اور باتھ روم چلی گئی۔

ٹھنڈے پانی کے چھینٹے آنکھوں پر مارتے ہوئے اسے قدرے سکون ملا اور آنکھوں کی جلن میں بھی کسی حد تک کمی آگئی۔ پھر وہ دوپٹے کے پلّو سے ہی چہرہ تھپتھپاتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بڑھ کر دروازے کی کنڈی گرادی۔ یونہی بے خیالی میں ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دبایا تو دروازہ کھل گیا۔ وہ چونکی اور پھر بہت احتیاط سے پورا دروازہ کھول دیا۔

سامنے ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا جس کے اختتام پر ایک اور دروازہ نظر آرہا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی اس بڑے کمرے میں آگئی اور فوری طور پر سامنے والے دروازے کی طرف بڑھنے کے بجائے پورے ہال کا جائزہ لینے لگی۔ مشرقی دیوار میں بھی دروازہ نظر آرہا تھا اور کیونکہ وہ قریب تھا اس لئے پہلے اسے آزمایا لیکن وہ باہر سے لاک تھا۔ پھر جب وہ سامنے والے دروازے کے پاس آئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں کچن تھا اور بی بی کھڑی شاید اس کے لئے ناشتہ بنارہی تھیں۔ اسے ایک دم تھکن کا احساس ہونے لگا جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔ دیوار سے کندھے ٹکا کر وہ بہت خاموشی سے بی بی کو دیکھنے لگی اور جب بی بی نے اسے دیکھا تو ہلکے سے مسکرائیں۔

"اُٹھ گئیں بچی......؟" وہ ایک لفظ ہاں تک نہ کہہ سکی نہ ہی اثبات میں سر ہلایا۔

"تم چل کر بیٹھو...... میں ناشتہ لے کر آرہی ہوں۔"

وہ شکستہ قدموں سے چلتی ہوئی ہال کمرے میں آبیٹھی۔ کچھ دیر بعد ہی بی بی ناشتے کی ٹرے لیے آگئیں۔ وہ شاید ہار مان چکی تھی۔ اس لئے ان کے کہنے سے پہلے ہی اپنے لئے چائے بنانے لگی اور پھر ابھی پہلا گھونٹ ہی

لیا تھا کہ ابا میاں کا خیال آیا۔

(پتا نہیں انہوں نے کچھ کھایا بھی ہوگا کہ نہیں)۔ سلائس کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ رُک گیا اور وہ چائے کے ساتھ ساتھ اپنے آنسوؤں کو بھی حلق سے نیچے اتارتی رہی۔

"خالی پیٹ چائے مت پیو...... کچھ کھا بھی لو۔" بی بی نے ٹوکا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا سلائس بھی واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

"بچی......! میں تمہاری کیفیت سمجھتی ہوں۔" بی بی اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھیں۔

"پھر بھی کہوں گی...... ذرا حوصلے سے کام لو۔ میں نہیں جانتی ولید تمہیں یہاں کیوں لایا ہے......؟ لیکن اتنا یقین رکھو وہ کسی بری نیت سے نہیں لایا ہوگا۔"

"بری نیت سے نہ بھی لایا ہو پھر بھی میری زندگی سے تو کھیل ہی گیا ہے۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ کوئی لڑکی ایک رات بھی گھر سے باہر رہ لے خواہ کہیں بھی تو دنیا اسے کن نظروں سے دیکھتی ہے......؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں کیا کروں......؟ اس سے کچھ پوچھتی ہوں تو جواب ہی نہیں دیتا۔ کہتا ہے بس ایک یہی بات مت پوچھو۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں......؟"

"میں آپ کو الزام نہیں دوں گی۔ اگر جو آپ مجھے یہاں سے نکلنے کا راستہ بتادیں۔" وہ ان کے ہاتھ تھام کر منت سے بولی۔

"راستہ تو ایک ہی ہے۔" انہوں نے مشرقی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن اسے وہ باہر سے بند کر گیا ہے۔"

"کیا آپ یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ کیا چاہتا ہے......؟"

"میں نے کہا ناں...... میں کچھ نہیں جانتی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"کچھ دن پہلے ولید میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ ایک مصیبت زدہ لڑکی کو کچھ دن کے لئے میرے پاس چھوڑنا چاہتا ہے اور یہ کہ خاندانی جھگڑوں کی بناء پر اس کے بہت سے دشمن ہیں جو اس کی جان لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے سخت حفاظت کی ضرورت ہے۔ پھر وہ تمہیں لے آیا۔" وہ کتنی دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیا ایسا ہی ہے......؟" بی بی نے پوچھا تو وہ اپنی آواز پر قابو نہ رکھ سکی۔

"جھوٹ کہتا ہے وہ۔ بکواس کرتا ہے۔ اوّل تو ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے اور اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا بھی تو وہ کون ہوتا ہے اس معاملے میں ٹانگ اڑانے والا؟ کیا ناطہ ہے اس کا ہم سے جو وہ میرا محافظ بننے چلا آیا؟"

"بچی......! غصہ مت کرو۔" بی بی آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ تھپکنے لگیں۔

"اور تمہیں ڈرنے یا فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... میں جو ہوں۔ تم میری بیٹی کی طرح ہو۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"بیٹے کی طرح تو وہ بھی ہے لیکن اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا......؟ خیر آنے دو...... میں اس کی خبر لیتی ہوں۔"

"کہاں گیا ہے......؟" وہ یونہی پوچھ بیٹھی۔

"دفتر...... کہہ رہا تھا وہیں سے پہلے اپنے گھر جائے گا پھر یہاں آتے آتے رات تو ہو ہی جائے گی۔" بی بی نے تفصیلی جواب دیا۔

"اس کا گھر بھی ہے......؟" بی بی نے اس کے لہجے میں چھپے طنز کو محسوس ہی نہیں کیا سادگی سے کہنے لگیں۔

"ہاں...... ! کیوں نہیں......؟ ماشاءاللہ گھر بھی ہے اور گھر والے بھی۔" پھر آہ بھرتے ہوئے بولیں۔

"باپ تو بچارے کا آٹھ سال پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا اب ایک ماں اور تین بہنیں ہیں۔ بڑا کڑا وقت دیکھا ہے میرے ولید بخت نے۔ چھوٹی سی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھا تو ماں بہنوں کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر آن پڑی۔ لیکن شاباش ہے کبھی جو حالات سے ہار مانی ہو۔ محنت مزدوری کر کے گھر بھی چلایا پڑھا لکھا بھی...... اب کہیں جا کے چار مہینے پہلے کسی اچھے دفتر میں ملازم ہوا ہے۔" بی بی اس کی تعریفیں کیے جا رہی تھیں جبکہ وہ اس سے مزید متنفر ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔

(گھر میں بہنیں رکھتے ہوئے میرے ساتھ یہ حرکت کر گیا ہے۔ اسٹاپ پر کھڑی لڑکیوں کو تاکنا اور پھر گھر سے اُٹھا لانا شریفوں کا شیوہ تو نہیں۔ مجھے تو پہلے ہی اس پر شبہ تھا۔ کاش! میں اسی دن ابا میاں کو بتا دیتی تو یہ نوبت نہ آتی)۔

بی بی اسے خاموش دیکھ کر اُٹھیں اور ٹرے اُٹھا کر کچن میں چلی گئیں اور وہ کتنی دیر تک وہیں بیٹھی آنے والے وقت اور حالات کو سوچ کر خوفزدہ ہوتی رہی۔ سارا دن اسی طرح کٹا۔ کسی وقت بی بی اس کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتیں تو کچھ دیر کو اس کا دھیان بٹ جاتا ورنہ پھر وہی لامتناہی سوچیں اسے اپنی گرفت میں لے لیتیں۔ رات میں اس کے آنے سے پہلے ہی وہ کمرے میں بند ہو گئی۔ وہ آیا بہت دیر تک دستک بھی دیتا رہا لیکن اس نے نہ تو دروازہ کھولا اور نہ ہی کوئی جواب دیا تھا۔ صبح جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکا ہو گا تب اس نے دروازہ کھولا۔ لیکن ابھی باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ وہ ایک دم سامنے آ کر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک قہر آلود نظر اس پر ڈالتی ہوئی فوراً اس کی طرف سے پیٹھ موڑ گئی۔

"اگر آپ اسی طرح نفرت کا اظہار کرتی رہیں تو یہاں آپ کا قیام طویل بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب......؟" وہ اسی تیزی سے اس کی طرف پلٹی جس تیزی سے پیٹھ موڑی تھی۔ وہ مسکرایا اور کندھے اُچکاتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور جب اطمینان سے کرسی پر بیٹھا تو وہ چیخ پڑی۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو......؟"

"تمہاری محبت......!" اسی اطمینان سے جواب دے کر وہ جیب سے سگریٹ نکالنے لگا۔

"میں مر کر بھی تم سے محبت نہیں کر سکتی۔"

"کیوں......؟ کیا برائی ہے مجھ میں......؟"

"تم انتہائی گھٹیا اور کمینے انسان ہو۔" وہ سگریٹ سلگانے کے بہانے اپنے ہاتھوں پر جھک گیا اور جب چہرہ اُونچا کر کے اس کی طرف دیکھا تو آنکھوں میں ایک انجانا دکھ کروٹیں لے رہا تھا۔ جسے جانے اس نے محسوس کیا یا نہیں لیکن زیادہ دیر تک ان آنکھوں کی گہرائیوں میں نہ دیکھ سکی۔

"اگر محبت کرنے سے انسان گھٹیا اور کمینہ ہو جاتا ہے تو میں یہ سب ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اور تو بہ غلام علی...... ! اگر چند دن آپ مجھے اپنی محبت کا احساس بخش دیں تو آپ کا کیا جائے گا......؟ ہاں میں ضرور ہی اُٹھوں گا۔"

"تو کیا تم صرف اسی لئے مجھے یہاں لائے ہو......؟"

"ہاں......!" "ہاں" کی صورت اس نے سینے میں دبی سانس خارج کی۔

"مجھے تو تم پاگل لگتے ہو۔ ایک ذرا سی بات کے لئے اتنے بڑے جرم کے مرتکب ہوئے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں سے نکل کر تمہارا نام نہیں لوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں ساری دنیا کو بتا دوں گی کہ تم......"

"بتا دیجئے گا ساری دنیا کو کہ ولید بخت آپ سے بڑی دیوانی محبت کرتا ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"اور میں تم سے بڑی شدید نفرت کرتی ہوں۔" اس کے لہجے میں نفرت کے ساتھ ساتھ حقارت بھی سمٹ آئی تھی۔

"اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ آپ کے تحقیر آمیز سلوک سے مایوس ہو کر میں آپ کو چھوڑ دوں گا تو......"

"مجھے تم سے کسی اچھی بات کی اُمید نہیں ہے۔" وہ جلدی سے کہہ کر اس سے پہلے ہی کمرے سے نکل آئی۔

(حالات اس طرح میرے خلاف ہو جائیں گے یہ تو گمان میں بھی نہیں تھا)۔ وہ سوچتا ہوا کمرے سے نکلا اور پھر وہیں سے بی بی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

○ ○ ○

اُسے یہاں مقید ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ کتنے دن اور یہاں رہے گی۔ اس سے جب بھی پوچھتی وہ کہتا۔ میری محبت کا جواب محبت میں دو تو جلد رہائی ممکن ہے اور یہ اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ جسے دیکھتے ہی اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی اور اندر کے سارے جذبے سمٹ کر آنکھوں میں آ سماتے۔ اس سے وہ جھوٹی محبت کا ڈھونگ بھی نہیں رچا سکتی تھی کہ بارہا وہ اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ چکا تھا۔ تمہاری آنکھیں تمہارے ہونٹوں کا ساتھ نہیں دے رہیں ابھی کل ہی تو وہ اس کی منت کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"سنو......! بس ایک بار مجھے دور ہی سے ابا میاں کو دکھا دو پھر بقیہ جتنے دن مجھے یہاں رہنا ہے میں تمہاری خواہش کے مطابق اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہوں گی۔"

وہ کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا تھا۔

"میری صرف یہی ایک خواہش تو نہیں ہے۔ اس سے بڑی اور شدید خواہش تو یہ ہے کہ تم مجھے اپنی محبت کا احساس بخش دو۔"

"میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی تھی اور وہ قدم بڑھا کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"میری طرف دیکھ کر بات کرو۔"

اور بمشکل تمام جب اس نے پلکیں اُٹھائی تھیں تو وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی ہنس پڑا تھا۔

"ثوبیہ غلام علی......! تم نے کبھی اپنی آنکھوں کو دیکھا ہے۔ یہ جتنی گہری ہیں اتنی ہی شفاف بھی ہیں کہ تمہارے اندر کا ہر جذبہ ان میں واضح طور پر تحریر ہو جاتا ہے۔" اس کے پلکیں جھکانے پر کہنے لگا۔

"میں صرف تمہارے ہونٹوں سے "آئی لو یو" سننے کا متمنی نہیں ہوں۔ اپنی آنکھوں میں میرے نام کے خواب سجاؤ اور ہونٹوں سے ان کی تعبیر کا وعدہ کرو۔"

اور وہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔

"جس دن میری آنکھوں میں تمہارا ہلکا سا عکس بھی لہرایا۔ اسی دن میں اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالوں گی۔"

"تو پھر یہاں سے جانے کا خیال دل سے نکال دو۔" وہ سنگ دلی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا۔

(اب کیا کروں......؟) وہ نئے سرے سے سوچنے لگی تھی اور اگلے تین دن تک وہ الجھتی رہی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے......؟ اب اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا پھر بھی اس نے آخری کوشش کے طور پر بی بی سے بات کی۔

"آپ ولید کو سمجھاتی کیوں نہیں......؟"

"میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی اس سے بات کر چکی ہوں بیٹی......! وہ نہ تو میری کوئی بات سنتا ہے اور نہ کسی بات کا جواب دیتا ہے۔" بی بی نے معذوری ظاہر کی۔

"آپ کسی طرح اس کی والدہ کے پاس جائیں۔"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن تم دیکھتی ہو، وہ باہر سے تالا لگا کر جاتا ہے۔"

"پھر آپ ہی بتائیں میں کیا کروں......؟" وہ رونے لگی۔

"بیٹی......! رو مت۔" بی بی نے اس کا کندھا تھپکا تو وہ اور زیادہ رونے لگی۔

"مجھے ابا میاں کا خیال آتا ہے۔ انہوں نے کہاں کہاں نہ ڈھونڈا ہوگا مجھے......؟ اور پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گے......؟ اور پتا ہے بی بی......! ان کا تو میرے سوا کوئی ہے ہی نہیں۔"

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ اسی وقت وہ آ گیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا پھر انہی قدموں پر پلٹ کر ہال کمرے میں جا بیٹھا۔ بی بی شاید اسے چپ کرا کے ہی کمرے سے نکلی تھیں۔ اس کی طرف دیکھا اور پھر خفگی کے اظہار کے طور پر منہ موڑ کر کچن میں چلی گئیں۔

(بی بی بھی خفا ہو گئیں)۔ اس نے دکھ سے سوچا اور بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

وہ کمرے سے نکلی تو وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ آہٹ پر آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے لمحہ بھر کو قدم روکے اور پھر بی بی کے پیچھے جانا چاہتی تھی کہ اس نے پکار لیا۔

"آؤ......! یہاں بیٹھو۔" وہ کچھ سوچتی ہوئی قدرے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"روتی رہی ہو......؟"

اس کا دل چاہا کہ کہے تمہیں اس سے کیا۔ لیکن اس کا لہجہ اور انداز روزانہ سے بہت مختلف تھا۔ لہجہ ٹوٹا ہوا اور انداز میں شکستگی تھی جس نے اسے کچھ کہنے سے باز رکھا۔

"رونے والے بزدل ہوتے ہیں۔" وہ اسے خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔

"اور میں کم از کم تمہیں بزدل نہیں دیکھنا چاہتا...... بہادر ہو...... یہ تو معمولی سی بات ہے۔ زندگی میں اس سے بڑے بڑے حادثات اچانک رونما ہو جاتے ہیں۔"

"کیا اس سے بڑا بھی کوئی حادثہ ہوگا ولید بخت......! کہ تم میرے عزت دار باپ کی نیک نامی کو داغدار کر رہے ہو......؟"

"میں......؟" وہ یوں چونکا جیسے اس نے کوئی غلط الزام اس کے سر رکھ دیا ہو۔

"تم نہیں تو کیا کوئی اور......؟ مجھے بتاؤ تم کس کی ایماء پر مجھے یہاں لائے ہو......؟"

وہ سر جھکا کر جانے کس سوچ میں ڈوب گیا۔

"بتاؤ ولید بخت......! کون ہے وہ......؟"

"میرا دل...... ہاں میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں یہاں لایا ہوں۔" پھر اچانک وہ اپنا لہجہ اور انداز بدل گیا۔

"یاد نہیں ہے میں کئی روز سے تمہیں دور ہی دور سے دیکھتا رہا ہوں......؟ پھر تمہارے قریب بھی آیا...... تم سے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن تم اول روز کی طرح انجان رہیں اور میرا دل اس بات پر مچلتا تھا کہ میں تمہیں سامنے بٹھا کر تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں۔ جس طرح کہ اب تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔"

وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"میں مانتا ہوں ثوبیہ......! کہ یہ طریقہ غلط ہے لیکن فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"سنو......! کیا تم میری اس غلطی کو معاف کر سکو گی......؟"

"تمہارے لئے شاید یہ کوئی بات نہ ہو ولید بخت......! لیکن مجھ پر زندگی کے راستے تنگ ہو گئے ہیں جس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی بھی نہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے پلٹ کر کہنے لگی۔

"اور سنو......! میرے لئے کسی دارالامان میں بات کر رکھنا کہ مجھ پر جان دینے والے ابا میاں بھی اب مجھے قبول نہیں کریں گے۔"

"ثوبیہ......!" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ ان سنی کرتی ہوئی بی بی کے پاس کچن میں چلی گئی۔

"لائیے بی بی......! روٹی میں پکا دوں۔" بی بی کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود اس نے ان کے ہاتھ سے بیلن لے لیا۔

"میں مہمان نہیں ہوں اور پھر یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ تو کام کریں اور میں آرام سے بیٹھی رہوں۔" وہ اپنے آپ کو نارمل پوز کرنے کی خاطر خواہ مخواہ بولتی رہی۔

"ولید نے کچھ کہا ہے......؟" بی بی بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"نہیں......!" وہ صاف مکر گئی۔

"وہ برا انسان نہیں ہے بیٹی......! بس پتا نہیں کیوں......؟"

"بی بی پلیز......!" اس نے ٹوک دیا۔

"میرے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں کریں۔ وہ اچھا ہے یا برا...... آپ بہتر جانتی ہوں گی لیکن میرے ساتھ اس نے بہرحال اچھا نہیں کیا۔"

بی بی کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر خاموشی سے کچن سے نکل گئیں۔ وہ روٹی پکانے کے بعد سالن گرم کر رہی تھی کہ وہ کچن کے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ وہ پیٹھ موڑے کھڑی تھی اس لئے اسے دیکھ نہ سکی۔

"پل بھر کے لئے کوئی ہمیں پیار کرلے جھوٹا ہی سہی۔" وہ گنگنایا تو بے خیالی میں اس نے گرم گرم دیگچی کو ہاتھ سے پکڑ لیا پھر فوراً ہاتھ کھینچ کر انتہائی غصے سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آئی ایم سوری......!" وہ واقعی شرمندہ ہوا۔

"ہاتھ دکھاؤ......! کہیں زیادہ تو نہیں جل گیا......؟"

"شٹ اپ......!" وہ چیخی اور چولہا بند کر کے اسے دھکیلتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

○○○

(زندگی میں اگر خوشیاں نہیں تھیں تو دُکھ بھی نہیں تھے)۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی دور تک پھیلے آسمان پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

(کمی تو بہت سے لوگوں کی تھی لیکن یہ الگ بات کہ ابا میاں نے کبھی محسوس نہیں ہونے دی۔ کیا نہیں کیا ابا میاں نے میرے لئے......؟ یہی کیا کم ہے کہ میری خاطر ساری زندگی تنہا گزار دی......؟ اور میں نے تو کبھی ابا میاں کو دُکھ دینے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ اب بھی میں قصوروار نہیں ہوں پھر بھی میری ذات دُکھ کا باعث تو بنی۔ کیا سوچتے ہوں گے ابا میاں میرے بارے میں کہ میں کہاں چلی گئی ہوں......؟ چودہ دن سے زیادہ ہو گئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے اور یہ ولید بخت پتا نہیں کیا چاہتا ہے......؟)۔

(ولید بخت......!)۔ اس نے پیشانی گرل پر رکھ دی۔

(میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں اور تم پتا نہیں کون سے جنم کا بدلہ لے رہے ہو مجھ سے......؟)۔ کتنے ہی آنسو پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے گرتے چلے گئے تھے۔

صبح جب وہ کمرے سے نکلی تو وہ ہال کمرے میں موجود تھا۔ اسے آتے دیکھا تو کتنی دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اس کا دل چاہا واپس پلٹ جائے لیکن چاہنے کے باوجود وہ قدموں کو واپس نہ موڑ سکی۔

"آؤ ثوبیہ......!" اس نے خود ہی بلایا اور وہ اپنے آپ کو اس کی بات ماننے سے باز رکھتے رکھتے بھی اس کے سامنے جا بیٹھی۔ کتنی دیر گزر گئی وہ پتا نہیں اسے اپنے سامنے بٹھا کر بھول گیا تھا یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں سمجھ سکی۔ بار بار اس کی طرف دیکھتی لیکن وہ متوجہ نہیں تھا۔ ایک ہی نقطے پر نظریں مرکوز کیے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے غور کیا تو خاصا مضطرب نظر آیا۔ کبھی بالوں میں انگلیاں پھنسا لیتا اور کبھی مٹھیاں بھینچ کر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیتا پھر اسی طرح اُٹھ کر چلا گیا۔ وہ اسے جاتے ہوئے بھی چپ چاپ دیکھتی رہی تھی۔

بی بی ناشتہ لے کر آئیں۔ اسے موجود نہ پا کر اس سے پوچھنے لگیں۔

"کہاں گیا ولید......؟" اس نے باہر کی طرف اشارہ کر دیا۔

"چلا گیا......؟" بی بی متعجب ہوئیں۔

"بتایا بھی نہیں اور ناشتہ بھی نہیں کیا۔" پھر خود کلامی کے انداز میں کہنے لگیں۔

"عجیب لڑکا ہے۔ کل سے دیکھ رہی ہوں کچھ پریشان سا ہے۔ کتنی بار پوچھا پر بتا کے نہیں دیا۔"

وہ خاموشی سے ان کی بڑبڑاہٹ سنتی رہی۔

"آؤ......! تم تو ناشتہ کر لو۔" بی بی نے اسے مخاطب کیا تو وہ اٹھ کر ان کے ساتھ تخت پر آ بیٹھی۔

پھر دن بھر وہ بی بی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ رات وہ بہت دیر تک سوچتی اور کڑھتی رہی تھی اس لئے دل خاصا بوجھل ہو رہا تھا اور اسی بوجھل پن کو کم کرنے کی غرض سے ہی وہ بی بی کے پاس بیٹھی تو انہی کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

"میرے ماں باپ میرے بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔"

اس کے پوچھنے پر بی بی اپنے بارے میں بتانے لگیں۔

"کہنے کو تین چچا تھے لیکن کسی نے بھی میرے سر پر دستِ شفقت نہیں رکھا اور نہ ہی کوئی اپنے گھر میں میرے لئے کوئی جگہ نکال سکا۔ یوں تینوں نے صلاح اور مشورے کے بعد مجھے یتیم خانے میں داخل کر دیا۔ میں وہیں پروان چڑھی۔ لڑکپن سے نکلی تھی کہ اللہ نے ایک فرشتہ صورت انسان بھیج دیا جو مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے آیا۔ اس کے ساتھ ولید کے ابا بھی تھے جنہوں نے مجھے اپنی بہن کہا اور نہ صرف کہا بلکہ اپنے آخری وقت تک اس رشتے کو خلوص سے نبھایا۔ ان کی اولاد بھی اسی طرح محبت سے ملتی ہے اور سچ کہوں بیٹی......! تو میرے اصل رشتہ دار یہی ہیں۔ ولید کی بہنیں اور اماں اب بھی میرا اسی طرح خیال رکھتے ہیں جس طرح ان کا باپ رکھتا تھا۔"

"اور آپ کے میاں......؟"

"ان کی زندگی نے وفا نہ کی...... شادی کے بعد بس پانچ سال زندہ رہے۔"

بی بی کے آزردہ لہجے پر وہ بھی افسردہ ہو گئی۔

"بچے نہیں ہیں......؟"

"اللہ رکھے...... دو ہیں ایک بیٹا ایک بیٹی۔ بیٹی کی گزشتہ سال شادی کر دی تھی۔ وہ بہاولپور میں ہوتی ہے اور بیٹا جدہ میں ہوتا ہے۔ اب آئے گا تو اس کی بھی شادی کر دوں گی۔" بی بی کی آنکھیں آنے والی کل کو سوچ کر چمکنے لگی تھیں۔

"بیٹی......! دُکھ کے دن بُرے ہوتے ہیں پھر بھی کٹ ہی جاتے ہیں۔"

"کٹ تو جاتے ہیں بی بی! لیکن اپنے نشان بھی تو چھوڑ جاتے ہیں۔" اس نے اپنے حوالے سے کہا۔

پھر دوپہر ابھی پوری طرح نہیں ڈھلی تھی کہ وہ آ گیا صبح جتنا مضطرب تھا اس وقت اتنا ہی خوش نظر آ رہا تھا۔

"سنو......! اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاؤ گی......؟" وہ کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھا۔

"نہیں......!" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"سوچ لو......! میں اس وقت تمہیں ایک بڑی خوشی دینے والا ہوں۔"

"تم کیا خوشی دو گے......؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"غریب سہی لیکن خوشیاں بانٹنے میں شاہ ہوں...... یقین نہیں تو بی بی سے پوچھ لو۔"

"مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"گویا مانتی ہو......؟"

"تمہیں میں کیا مانتی ہوں یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ اُٹھ کر جانے لگی کہ وہ قدم بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا۔

"چلو...... یاد کرو کہ کبھی میں نے تمہیں چائے کے لئے کہا تھا اور تم نے انکار کیا تھا۔" وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"چلو......! تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے تئیں دھمکا کر کہا لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"کیا بات ہے......؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی......؟" وہ اُلٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

"میرے خیال میں تو ہونا چاہئے......؟"

"ہا......! تمہارے خیال میں۔" وہ اس کی طرف سے رُخ موڑتے ہوئے بولی۔

"تمہارے خیال میں تو ابا میاں میرے لئے پھولوں کے ہار لے کر کھڑے ہوں گے......؟ سنو ولید بخت......! میں گھر نہیں جاؤں گی۔"

"ثوبیہ......!"

"ہاں ولید بخت......! میں قصوروار نہیں ہوں پھر بھی ابا میاں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔"

"میں جو ہوں۔"

"کون ہو تم......؟ کیا ناطہ ہے تمہارا مجھ سے جو میں تمہارا سہارا لے کر ابا میاں کے سامنے جا کھڑی ہوں......؟" وہ چیخنے لگی۔

"میں نے کہا تھا جب یہاں سے جانے کی بات آئے تو میرے لئے کسی دارالامان میں بات کر رکھنا۔"

"کیا بات ہے......؟" بی بی اس کے چیخنے سے پریشان ہو کر چلی آئیں۔

"اس سے پوچھیں...... یہ مجھے ابا میاں کے پاس لے جانے کی بات کر رہا ہے۔"

"بیٹی......! یہ تو اچھی بات ہے۔" بی بی نے کہا تو وہ پھر چیخ پڑی۔

"آپ بھی ایسا کہہ رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ بھی اس کے ساتھ شریک ہیں جبھی تو اسے کچھ کہا نہیں۔ اگر آپ......" الفاظ اس کے ہونٹوں میں رہ گئے۔ کیونکہ ایک بار پھر سفید رومال نے اس کی ناک اور پھر پورے چہرے کو ڈھانپ دیا تھا۔

○○○

اُس نے آنکھیں تو کھول دیں لیکن ذہن شاید ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس لئے خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار پر لگے بلب کو دیکھنے لگی۔ جس کی زرد روشنی رات کے اختتام پذیر ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ یہ وہ کمرہ تو نہیں تھا جہاں وہ اور ابا میاں رہتے تھے لیکن

اس کمرے میں رچی بسی مہک کچھ مانوس سی تھی۔ دائیں طرف آہٹ محسوس کر کے اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ابا میاں جا نماز سے اُٹھ رہے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف پلٹتے اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

(میرے خدا......!)۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

(پتا نہیں ابا میاں کیا کہیں......؟ میں کس طرح ان کے سوالوں کا جواب دے سکوں گی اور پتا نہیں وہ میری بات کا یقین کریں گے بھی کہ نہیں)۔

"ثوبیہ......!" اس کی پلکوں کو لرزتا دیکھ کر ابا میاں نے پکارا۔ وہی انداز...... وہی شفقتوں سے چور لہجہ...... بند پلکوں کے پیچھے ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا۔

"بیٹا......!" پیشانی کو ابا میاں کے ہاتھوں نے کیا چھوا کہ سارا پانی کناروں سے نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگا۔ پلکوں کے در کھولنے کی ہمت پھر بھی نہیں ہوئی۔

"رو نہیں میری جان......!" ابا میاں کے گلوگیر لہجے پر وہ تڑپ کر اٹھی اور ان کے سینے سے جا لگی۔

"ابا میاں......! میں کچھ نہیں جانتی...... میں کچھ نہیں جانتی...... میرا کوئی قصور نہیں۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں بیٹا......!" ابا میاں آہستہ آہستہ اس کی پشت سہلانے لگے۔

"کیا کیا جانتے ہیں......؟"

"یہی کہ تمہارا کوئی قصور نہیں۔" ابا میاں نے اسے اعتماد، اعتبار اور یقین بخش دیا۔

"تم دل پر بوجھ مت ڈالو میری بچی......! جو ہوا اسے بھول جاؤ...... بس یوں سمجھو تم ابھی ابھی ایک طویل نیند سے بیدار ہوئی ہو۔"

"ابا میاں......!" وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر مچل مچل کر روئی اور اسے چپ کراتے کراتے ابا میاں کے اپنے آنسو چھلک پڑے تھے۔

بظاہر کوئی ڈر کوئی دھڑکا نہیں۔ پھر بھی وہ رات بھر چونک چونک کر اٹھتی رہی۔ ایک سایہ ہاتھوں میں سفید رومال لئے اپنی طرف بڑھتا محسوس ہوتا اور وہ پوری پسینے میں نہا جاتی۔ کتنی دیر تک بے حس و حرکت پڑی صرف نظروں کا زاویہ بدل بدل کر چاروں طرف دیکھتی اور جب کوئی نظر نہ آتا تو اٹھ بیٹھتی۔ بارہا دل چاہا ابا میاں کو اٹھا کر کہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ لیکن نہیں...... گہری نیند میں دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو باز رکھا۔

پھر اگلے کئی دن تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ گو کہ ابا میاں نے اسے اعتماد اور یقین بخش دیا تھا پھر بھی وہ ان سے نظریں چراتی رہی۔ کہیں بھی بیٹھی ہوتی، کوئی بھی کام کر رہی ہوتی اسے لگتا جیسے ابا میاں اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ حالانکہ اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے اس نے کئی بار ابا میاں کو دیکھا اور ہر بار انہیں اپنے ہی کسی کام میں مصروف پایا تھا پھر بھی وہ اس احساس سے نہ نکل پائی۔

(ولید بخت......!)۔ اس نے بارہا اسے مخاطب کرتے ہوئے سوچا تھا۔

(میرے اور ابا میاں کے درمیان خلیج حائل کرنے کے ذمہ دار تم ہو، جس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی)۔ دوسرے ابا میاں کی خاموشی اسے مارے ڈال رہی تھی۔ نہ کوئی ملامت نہ کوئی سوال۔ اُس نے

کہا۔ میں بے قصور ہوں اور انہوں نے یقین کر لیا حالانکہ اُسے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا لیکن وہ یقین کی دولت لے کر بھی مطمئن نہیں تھی۔

اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں یہاں سے نکل کر تمہارا نام نہیں لوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اُس نے ولید بخت سے کہا تھا اور وہ واقعی اس کا نام لینا چاہتی تھی لیکن ابا میاں پوچھتے تب ناں......؟ انہوں نے تو شاید اسے ہی بہت سمجھ لیا تھا کہ وہ زندہ سلامت ان کے پاس آ گئی تھی۔

بہر حال وقت بڑا مرہم ہے۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی گئی۔ اُس کی سوچوں میں وہ شدت نہ رہی تو زندگی خود بخود معمول پر آ گئی۔

بس یوں سمجھو تم ایک طویل نیند سے بیدار ہوئی ہو ابا میاں نے کہا تھا اور اب واقعی اسے وہ ایک حادثہ کم اور خواب زیادہ لگتا جیسے طویل نیند کے دوران اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور آنکھ کھلی تو ہر چیز ویسی ہی تھی۔

ابا میاں کا وہی معمول تھا۔ صبح سات بجے آفس کے لئے نکلنا اور شام پانچ بجے واپسی۔ اس کے بعد وہ کہیں نہیں جاتے تھے۔ اس کا البتہ بیرونی دُنیا سے ناطہ بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ ایک بار ابا میاں نے کہا بھی کہ وہ دوبارہ کالج جانا شروع کر دو لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ شاید اندر کہیں اب بھی کوئی خوف موجود تھا۔

اس شام وہ آنگن میں بچھے تخت پوش پر بیٹھی رات میں پکانے کے لئے چاول چن رہی تھی۔ ابا میاں عصر کی نماز کے بعد اندر جا نہیں کیا کر رہے تھے جب حیدر آباد سے پھوپھی اماں آ گئیں۔ انہوں نے آتے ہی اُسے اپنے ساتھ لپٹا کر جو رونا شروع کیا تو وہ پریشان ہو گئی۔ آواز سن کر ابا میاں باہر آئے تو یہ سمجھے کہ اتنے دنوں بعد ملاقات ہونے پر آبدیدہ ہو رہی ہیں لیکن پھر فوراً کسی خیال کے تحت آگے بڑھ کر پھوپھی اماں کو کندھوں سے تھام لیا۔

"کیا کر رہی ہیں آپا......! بچی پریشان ہو رہی ہے۔"

"ہائے غلام علی......! تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی بچی بچاری......"

"آپا......!" ابا میاں نے انہیں ٹوک دیا۔

"آیئے......! اندر چلیں۔"

"ٹھہرو......! بچی سے تو ڈھنگ سے مل لینے دو۔"

"بعد میں مل لیجئے گا۔" ابا میاں انہیں زبردستی اندر لے گئے اور وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہ گئی۔ ابا میاں کی طرح اسے بھی فوری طور پر پھوپھی اماں کا یوں رونا سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن جس انداز سے ابا میاں انہیں زبردستی اس سے الگ کر کے اندر لے گئے تھے اس سے وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔

(گویا بات سارے زمانے میں پھیل چکی ہے)۔ اُس نے سوچا اور دل میں انجانے اندیشے گھر کرنے لگے۔ اندر سے ابا میاں کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے چاول کی تھالی اُٹھا کر کچن میں آ گئی پھر چاول چڑھ جانے سے پہلے اُس نے چائے بنائی اور جس وقت وہ چائے لے کر اندر گئی، اُس نے دیکھا ابا میاں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لہجہ گلوگیر اور اُن کے ہاتھ پھوپھی اماں کے سامنے بندھے ہوئے تھے۔

"ابا میاں......!" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی دُکھ کی شدید لہر دل سے اُٹھتی ہوئی پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

اُسے دیکھتے ہی ابا میاں کے دونوں ہاتھ کٹی ہوئی شاخوں کے مانند ان کی گود میں جا گرے اور وہ ملتجیانہ نظروں سے پھوپھی اماں کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اُس نے خاموشی سے چائے کی ٹرے اُن دونوں کے درمیان رکھی اور الٹے قدموں واپس پلٹ آئی۔ کچن تک آنے میں کتنے بے شمار موتی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے اپنے قدموں میں بکھرتے چلے گئے تھے۔

(میں قصور وار نہیں ہوں پھر بھی گناہ گار ٹھہرائی جاؤں گی)۔ اُس نے چوکی پر بیٹھ کر سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

(کس کس کے سامنے ابا میاں ہاتھ باندھیں گے......؟ اور کون ہے جو میری بے گناہی کا یقین کرے......؟ میں صرف ابا میاں کا یقین لے کر مطمئن ہونے جا رہی تھی)۔ اُس کے آنسو اور شدت سے بہنے لگے۔

ابھی زیادہ دن تو نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس حادثے کو خواب کا نام دے کر اپنے آپ کو بہلانے میں کامیاب ہوئی تھی کہ پھوپھی اماں نے آ کر اس کے زندہ حقیقت ہونے کا احساس دلا دیا۔ اُس نے سوچا۔ وہ بھی اس حادثے کو نہیں بھلا سکے گی۔ اگر چاہے تب بھی اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہیں رکھ سکتی کہ زندگی کے ہر دوسرے موڑ پر کوئی نہ کوئی ان حقائق کو دُہراتا ہوا اُس کے سامنے آن کھڑا ہوگا۔ اُس نے بمشکل تمام اپنے آنسوؤں کو مزید بہنے سے روکا اور کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

رات میں جب پھوپھی اماں اُس کے برابر لیٹیں تو وہ بہت دیر تک اُن کے گھر والوں کا حال احوال پوچھتی رہی تھی اور تیمور جس کا نام لینے میں ایک جھجک مانع تھی، اس کے بارے میں وہ چاہتی تھی کہ پھوپھی اماں خود سے بتائیں، لیکن جانے کیوں انہوں نے سب کا ذکر کیا، ایک اسی کا نہیں کیا۔ پھر پھوپھی اماں تو سو گئیں اور وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ اگلا دن پھوپھی اماں نے بمشکل گزارا۔ بار بار جانے کی بات کرتی رہیں۔ ابا میاں نے کہا بھی کہ کچھ دن رہیں لیکن شام تک وہ بالکل تیار ہو گئیں۔

"بس غلام علی......! میں بڑی مشکل سے وقت نکال کر آئی تھی وہ بھی اس لئے کہ......" اسے کھڑے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

"مہربانی ہے آپ کی......!"

"اچھا تو اگلے مہینے تم آ رہے ہو ناں......؟ تیمور کی شادی ہے۔"

وہ ایک دم سر اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ ابا میاں الگ اپنی جگہ حیرت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

"تیمور کی شادی......؟" ابا میاں کو شاید اپنی سماعتوں پر دھوکہ ہوا۔ اس لئے تصدیق کی غرض سے پوچھا۔

"ہاں......! تیمور کی شادی ہے...... تو بیٹی کو ساتھ ضرور لانا بلکہ میں تو کہتی ہوں اسے پہلے ہی بھیج دینا۔ بچی بچاری اکیلی رہتی ہے بہل جائے گی۔"

"ہاں کیوں نہیں......؟" ابا میاں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور وہ جو زمین کو اپنے پیروں تلے سے کھسکتا محسوس کر رہی تھی اُسے ابا میاں کا سہارا بڑا غنیمت لگا۔

رات وہ بہت دیر تک ابا میاں کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اصل میں پھوپھی اماں جاتے جاتے جو بات کہہ گئی تھیں، اُس سے اس نے محسوس کیا کہ ابا میاں ایک دم سے بجھ سے گئے ہیں اور دل تو اس کا بھی ٹوٹا تھا۔ لیکن وہ ظاہر کر کے ابا میاں کو مزید آزردہ کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے اپنے زخم چھپا کر وہ اپنے آپ

کو بے حد نارمل پوز کرتی ہوئی بہت دیر تک اُن سے باتیں کرتی رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود ہی اسے سونے کے لئے کہا۔ وہ اُٹھ کر اپنی جگہ پر آ گئی۔ بہت دیر ہو گئی تھی اپنے آپ کو دھوکہ دیتے، اب جو تکیے پر سر رکھا تو مزید بہلانا مشکل ہو گیا۔ گو کہ دل ایک ہی جملے کی تکرار کر رہا تھا۔ مجھے ملال نہیں لیکن آنکھوں میں آتی برسات نے کوئی تاویل نہیں سنی اور ٹوٹ کے برسی۔

(ولید بخت......!)۔ اُسے مخاطب کر کے سوچا۔

(ہر زخم کے ذمے دار تم ہو۔ خدا میری آنکھوں سے ٹوٹے ہر قطرے میں تمہارے لئے بددعا ہے کہ زندگی تمہارے لئے سزا بن جائے)۔ یونہی روتے اور کڑھتے ہوئے ہی جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح وہ اپنے معمول کے مطابق اُٹھی ہر طرف گہری خاموشی تھی وہ متعجب ہوئی کیونکہ اس وقت ابا میاں کے مناجات پڑھنے کی آواز تو ضرور آتی تھی اُس نے فوراً تکیے سے سر اُٹھا کر دیکھا ابا میاں سوئے ہوئے نظر آئے۔

(الٰہی خیر......!)۔ وہ اُٹھ کر اُن کی چارپائی کے پاس آئی اور کسی وہم میں گھر کر کتنی دیر تک اُن کی سانسوں کی آمد و رفت کو محسوس کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

(توبہ......! میں بھی کیسی پاگل ہوں)۔ اُس نے اپنے آپ کو ملامت کی اور ابا میاں کو آواز دے ڈالی۔ دوسری اور پھر تیسری آواز پر بھی وہ نہیں اُٹھے تو جھک کر اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ تپش کا احساس ہوا تو وہ پریشان ہو گئی۔ پھر پہلے انہیں اُٹھانے کے بجائے اس نے جا کر چائے بنائی اور جب وہ چائے لے کر اندر آئی تو ابا میاں خود ہی اُٹھ چکے تھے۔

"آپ کو بخار ہو رہا ہے......؟" وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں شاید......؟"

"شاید نہیں ابا میاں......! بخار بہت تیز ہے آپ یہ چائے پی لیں میں آپ کے لئے ناشتہ بناتی ہوں۔"

"ناشتہ رہنے دو بیٹا......! کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا۔"

"کوئی گولی وغیرہ دیکھوں......؟" وہ اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

"لیکن خالی پیٹ گولی لینا ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم اتنا تردد مت کرو میں ٹھیک ہوں۔" ابا میاں نے اُسے تسلی دی اور گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگے۔ وہ بہت خاموشی سے اُن کی طرف دیکھے گئی۔

ایک ہی رات میں اتنے کمزور ہو گئے تھے اور چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال...... یقیناً پھوپھی اماں کی باتوں نے بنا تھا۔ اُسے دُکھ ہونے لگا اور اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے ہوئے وہ ان کے پاس سے اُٹھ گئی۔ دن چڑھنے کے ساتھ ساتھ ابا میاں کے بخار میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ مسلسل اُن کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی لیکن بخار کسی طرح کم نہ ہو رہا تھا۔ اب تو غنودگی میں وہ کچھ بڑبڑانے بھی لگے تھے۔ وہ گھبرا کر اُٹھی۔ پڑوس میں سے کسی بچے کو بلا کر ابا میاں کے پاس بٹھایا اور خود اُن کی دوا لینے چلی گئی۔ جب سے اس گھر میں آئی تھی پہلی بار نکل رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو گھبراتی یا ڈرتی لیکن اس وقت صرف ابا میاں کا خیال تھا۔ اس لئے کسی کلینک کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی ہوئی وہ پیدل ہی چل پڑی۔ گھر سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر

اُسے ایک کلینک نظر آیا تو وہ اسی میں چلی گئی۔ مریضوں کا زیادہ رش نہیں تھا بس گنتی کی دو تین عورتیں ہی بیٹھی تھیں وہ بنچ پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی پہلے اُس نے سوچا وہ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہے گی لیکن پھر اُس نے ابا میاں کی کیفیت بتا کر صرف دوا لینے پر اکتفا کیا اور جیسے ہی کلینک سے باہر نکلی سامنے سے وہ عین ولید بخت آتا ہوا نظر آیا۔ یوں لگا جیسے وہ اسی کے انتظار میں کھڑا ہو اور اب اُسے دیکھ کر لپکتا ہوا اُس کی طرف آ رہا ہو۔

(میرے خدا......! کیا کوئی حادثہ......؟)۔ اُس نے سوچا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ سہارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ اس اثناء میں وہ قریب آ چکا تھا۔

(میں اگر یونہی ڈرتی رہی تو کبھی بھی اُس کا سامنا نہیں کر سکوں گی)۔ اُس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا۔

"تو یہ......! خیریت تو ہے......؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی شیشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ وہ جواب دینے کے بجائے دور سے آتے رکشہ کو ہاتھ کے اشارے سے روکنے لگی۔ رکشہ قریب آ کر رُکا تو وہ اُس سے پہلے ہی اس کی طرف بڑھا اور جانے کیا کہا کہ رکشہ چلا گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے......؟" وہ اپنے آپ کو اس کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر چکی تھی۔ غصے سے بولی۔

"تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا......؟"

"کون سی بات......؟"

"یہی کہ یہ دوا کس کے لئے لے جا رہی ہو......؟"

"تمہیں اس سے کیا......؟ اور تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے......؟"

"اگر سمجھو تو بہت کچھ۔" وہ بلکے سے مسکرایا جس سے وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گئی۔

"سنو......! میں اب وہ کمزور اور بزدل لڑکی نہیں رہی کہ تم میرے چہرے کو رومال سے ڈھانپ دو اور میں خاموش رہوں۔ تمہاری اس حرکت نے مجھے تم جیسے لوفروں سے نپٹنے کا حوصلہ بخش دیا ہے۔ سیدھی طرح اپنا راستہ لو ورنہ وہ حشر کروں گی کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔"

"میں تمہیں ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کی باتوں کا نوٹس نہ لیتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے ایسا یا ویسا دیکھنے والے......؟"

"اس کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں اگر دوبارہ سننا چاہتی ہو تو سنو......! تم میری زندگی کی اوّلین تمنا ہو اور......"

"شٹ اپ......!" وہ اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے قدرے اونچی آواز میں چیخی اور اپنے راستے پر چل پڑی جبکہ وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

"ہائے......! اتنی دیر لگا دی۔" گھر میں داخل ہوئی تو وہ بچہ جسے وہ ابا کے پاس چھوڑ گئی تھی شکوہ کرنے لگا۔

"اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔" اُس نے چادر اُتار کر ایک طرف رکھی پھر اس سے پوچھنے لگی۔

"ابا میاں اُٹھے تو نہیں تھے۔"

"نہیں......! اب میں جاؤں......؟"

"ہاں جاؤ......! لیکن میرے پاس چکر ضرور لگاتے رہنا، ہو سکتا ہے کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔"

لڑکا سر ہلاتا ہوا بھاگ گیا تو وہ دوا لے کر ابا میاں کے پاس آ بیٹھی۔

شام میں ابا میاں قدرے بہتر نظر آئے۔ اس نے آنگن میں چھڑکاؤ کر کے وہیں تخت پوش پر ابا میاں کا بستر لگا دیا۔ پھر انہیں سہارا دے کر باہر لے آئی۔

"ابا میاں......!" وہ اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں جانتی ہوں آپ کو پھوپھی اماں کی بات نے دُکھ پہنچایا ہے۔"

"دُکھ کی بات تو ہے بیٹا......! تمہاری دادی اپنے ہاتھوں سے تمہاری اور تیمور کی نسبت طے کر گئی تھیں جسے توڑتے ہوئے تمہاری پھوپھی اماں کو ذرا خیال نہ آیا اور پھر قصوروار میں ہوں سزا تمہیں......"

"ابا میاں......!" وہ کچھ تڑپتے ہوئے اُن کی بات کاٹ گئی۔

"آپ کا کیا قصور ہے......؟"

"ہیں......؟" ابا میاں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بے خیالی میں وہ پتا نہیں کیا کہتے جا رہے تھے کہ فوراً سنبھل گئے۔

"بیٹا......! ذرا سا پانی پلا دو۔"

"جی......!" وہ اٹھ کر چلی گئی۔ پانی لا کر انہیں پلایا پھر کیونکہ ان کے لئے کھچڑی پکانی تھی، اس لئے اس کا دھیان اُدھر چلا گیا۔

اگلے دن وہ صبح کے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ابا میاں سے کہہ کر ان کے لئے دوا لینے چلی گئی۔ اس وقت تک وہ بالکل خالی الذہن تھی لیکن جب دوا لے کر کلینک سے نکلی اُسی وقت اُسے ولید بخت کا خیال آیا کہ کل وہ یہیں اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ ڈری تو نہیں لیکن چاہتی تھی کہ اب بھی اُس سے سامنا نہ ہو۔ اس لئے احتیاطاً ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی وہ گھر کی طرف چل پڑی۔ جس وقت وہ اپنے گھر جانے والی گلی میں مڑ رہی تھی وہ اُسے اُسی گلی میں سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ پہلے تو وہ ٹھٹکی لیکن پھر یوں بن گئی جیسے اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔

"ثوبیہ......!" وہ انجان بنی اس کے قریب سے گزر رہی تھی کہ اس نے پکار لیا۔

"پتا نہیں میری دُعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟" وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ اس کے باوجود اس نے سن لیا۔

"کیا دُعا مانگی تھی تم نے......؟"

"یہی کہ تم سے کبھی سامنا نہ ہو۔"

"کیا......؟ اتنا بُرا ہوں میں......؟"

"ہاں......! اتنے بُرے ولید بخت......! کہ جب تم پر نظر پڑتی ہے وہ میری زندگی کا بدترین لمحہ ہوتا ہے۔"

"میں تمہاری زندگی میں آنے والے بدترین لمحوں کو نہیں روکوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ کبھی تم ان لمحوں کو آواز ضرور دو گی۔"

جواب میں وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے وہ چلا گیا۔

○○○

ابا میاں نے پتا نہیں پھوپھی اماں کی بات کو جی کا روگ لگایا تھا یا جانے کیا بات تھی کہ ایک بار جو چار پائی

سے لگے تو اُٹھ ہی نہ سکے۔ پچھلے دو دن سے تو وہ انہیں خاصا مضطرب بھی دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی بات کہنا چاہتے ہوں لیکن کہہ نہیں پاتے۔ اس نے اُن کی خدمت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ رات رات بھر اُن کے پاس بیٹھی رہتی۔ اُن کے ہونٹوں سے بس چند جملے ہی ادا ہوتے۔

"اللہ کو اپنے بندوں کی آزمائشیں مطلوب ہوتی ہیں۔ وہ بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہے تو نکال بھی لیتا ہے۔"

سہ پہر کا وقت تھا۔ ابا میاں کی حالت زیادہ بگڑنے لگی تھی۔ وہ گھبرا کر خود ہی ڈاکٹر کو لینے بھاگی لیکن وقت ایسا تھا کہ کوئی کلینک کھلا ہوا نہیں ملا۔ مایوس ہو کر واپس آئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو ابا میاں کے ساتھ کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اُس کی طرف پیٹھ تھی اس لئے وہ دیکھ نہ سکی۔ پچھلے کئی دنوں سے ابا میاں کے ساتھ کام کرنے والے عیادت کو آ رہے تھے، وہ یہی سمجھی آفس کا کوئی بندہ ہوگا۔ دوپٹے کو ٹھیک طرح سے سر پر جماتے ہوئے وہ اندر جانے لگی تو ابا میاں نے اشارے سے پاس بلا لیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے اُن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"بیٹا......! یہ ولید ہے۔" ابا میاں کی کمزور آواز پر اُس نے یونہی سر اُٹھایا تھا۔ اُس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سامنے وہ ہوگا۔ کتنی دیر تک حیرت کی تصویر بنی کھڑی رہی جبکہ وہ یونہی سر جھکائے بیٹھا تھا لیکن انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کی طرف نہ متوجہ ہونے کے باوجود اس کی کیفیت سمجھ رہا ہے۔

"ابا میاں......!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر کہنے لگے۔

"یہ میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ بہت اچھا اور نیک لڑکا ہے۔" وہ ابا میاں کی غلط فہمی دُور کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی ابا میاں نے اس کا ہاتھ ولید کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"میں تمہاری طرف سے بہت فکرمند تھا بیٹا......! لیکن ولید نے ایک بار پھر......"

"ابا میاں......! آپ اسے نہیں جانتے۔" وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور تم بھی جان لو کہ میرے بعد تمہیں اسی کے ساتھ جانا ہے۔"

"نہیں ابا میاں......! آپ کہیں نہیں جائیں گے۔" وہ چیخ پڑی اور اُن کے سینے پر سر رکھنا چاہتی تھی کہ اُس نے روک دیا۔

"پلیز......! انہیں تکلیف ہوگی۔"

"چھوڑو مجھے......!" وہ پاگل ہونے لگی۔ اپنا ہاتھ چھڑا کر ابا میاں کی طرف دیکھا۔

وہ اس کی فکر سے آزاد ہو کر اطمینان سے سو رہے تھے۔

"ابا میاں......!" حلق سے دلدوز چیخ بلند ہوئی اور اندھیروں نے ایک پل میں اُجالوں کو مات دے دی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی اُسے ہوش آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ گھر عورتوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھتی رہی۔

"بیٹی! تمہارے کوئی رشتے دار وغیرہ نہیں ہیں؟" کسی عورت نے پوچھا تو اُسے پھوپھی اماں کا خیال آیا۔

"حیدر آباد میں ہیں۔" اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کسی سے کہہ کر انہیں اطلاع کرواؤ۔"

"کس سے کہوں......؟" وہ اُلٹا انہی سے پوچھنے لگی۔

"کوئی نمبر وغیرہ ہو تو مجھے دیں میں اطلاع کر دیتی ہوں۔" ایک لڑکی نے خلوص سے پیش کش کی تو اُس نے پھوپھی اماں کا نمبر بتایا۔

پھر پھوپھی اماں کے آنے کے بعد ہی ابا میاں کو اُن کی آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا گیا تھا۔

○ ○ ○

ایک ابا میاں ہی اُس کے سب کچھ تھے۔ ماں باپ، بہن بھائی اور دوست یہ سارے ناطے اسی ایک ہستی سے وابستہ تھے۔ وہ چلے گئے تو اب اس کے لئے جیسے کچھ بھی نہ رہا۔ اپنے آپ کو ایک دم سے بہت تنہا محسوس کرنے لگی اور حقیقتاً وہ بہت تنہا ہو گئی تھی۔ سوئم کے بعد ہی پھوپھی اماں جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ اُس سے کہا میرے ساتھ چلو اور شاید وہ چلی جاتی لیکن ایسے وقت ولید بخت چلا آیا۔

"ثوبیہ کہیں نہیں جائیں گی۔" اُس کے فیصلہ کن انداز اور لہجے پر پھوپھی اماں نے جن نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اُس سے وہ اپنی جگہ کٹ تو گئی لیکن سوچا، ابا میاں بھی ان ہی کی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر حوصلہ ہار گئے تھے۔

"تم کیا کہتی ہو ثوبیہ......؟" پھوپھی اماں براہِ راست اُس سے پوچھنے لگیں۔

"میں اپنے ہی گھر میں رہوں گی۔" جواب پھوپھی اماں کو دیا اور جتایا ولید بخت کو۔

"اکیلی......؟"

"اکیلی ہو گئی ہوں تو اکیلے ہی رہنا پڑے گا۔" اُس کی آواز بھرا گئی تو وہ انہیں وہیں چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

پھر پھوپھی اماں جانے سے پہلے اُس کے پاس آئیں۔ اُسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے جیسے اپنا فرض نبھایا اور پھر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد ہی وہ آیا۔ کتنی دیر تک خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اُسے ابا میاں کی بات یاد دلا کر اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہے گا اس لئے اُس کے بولنے سے پہلے ہی کہنے لگی۔

"سنو......! ابا میاں تمہاری حقیقت سے آگاہ نہیں تھے اس لئے انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ جانے کے لئے کہا لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں اور مجھے یقین ہے اگر میں تمہیں ابا میاں کے سامنے بے نقاب کر دیتی تو وہ کبھی میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہ دیتے۔"

"تمہاری اس بات سے میں یہ سمجھوں کہ تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتیں......؟"

"ہاں......! اور پلیز......! ابا میاں کا واسطہ دے کر مجھے مجبور مت کرو۔"

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن یہ تو سوچو تم یہاں کیسے رہو گی......؟"

"یہ میرا مسئلہ ہے اس لئے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"اور پلیز......! اب تم جاؤ......! میں زیادہ دیر تک تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہیں دیکھ کر میرے زخموں سے لہو رسنے لگتا ہے۔ پہلا زخم تم ہی نے تو لگایا تھا ولید بخت......! باقی سب تو اس کی کڑیاں ہیں۔"

"ثوبیہ......!" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"صاف ستھری، بے داغ زندگی تھی میری...... نہ استطاعت سے بڑھ کر خواہشیں اور نہ برداشت سے بڑھ کر آزمائشیں تھیں۔ ایسے میں تم جانے کہاں سے چلے آئے اپنی محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ محبت اور دھاندلی میں کتنا فرق ہوتا ہے......؟ دھاندلی سے تم نے میرے راستوں میں کانٹے بچھائے...... اس کے برعکس محبتوں کے پھول بھی تو کھلا سکتے تھے۔" وہ ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکائے کہنے لگی۔

"جانتے ہو...... تمہارے بچھائے ہوئے کانٹوں پر چل کر ہی آج میں تنہا ہو گئی ہوں۔ ابا میاں کے ناتواں پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ان خاردار راستوں پر میرے ساتھ دور تک چل سکتے، پھر بھی انہوں نے بہت کوشش کی لیکن جب پھوپھی اماں نے برسوں پہلے میرے اور تیمور کے درمیان بندھا بندھن محض تمہاری وجہ سے توڑ دیا تو ابا میاں ٹوٹ گئے۔"

"میری وجہ سے......؟" اُس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا اور آنکھوں میں اُلجھن۔

"کیا تمہیں اس بات سے انکار ہے......؟" وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"اتنے نادان نہیں ہو تم ولید بخت......! کیا نہیں جانتے کہ ایک اغوا شدہ لڑکی کا معاشرے میں کیا مقام رہ جاتا ہے......؟"

"میرے خدا......!" اُس نے طویل سانس لیتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"تمہیں منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے......؟ مرد ہو...... سیاہ کاریوں کے باوجود سر اُٹھا کر چلنے کا حق لئے کھڑے ہو...... مجھے بتاؤ میں کیا کروں......؟ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں میں جاؤں اور میری طرف اشارہ نہ ہو......؟ ابا میاں نے کہا تھا کہ سب بھول جاؤ...... یوں سمجھو تم ایک طویل نیند کے بعد بیدار ہوئی ہو اور میں بھی یہی سمجھ کر اپنے آپ کو بہلانے لگی تھی لیکن اب جانا کہ نیند تو کبھی آئی ہی نہیں۔"

(تم یہ سب سوچنے اور کہنے میں حق بجانب ہو اور میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ التجاؤں کی زنجیر میں میرا پور پور جکڑا ہے اور ہونٹوں پر وعدے کا قفل)۔ اُس نے انتہائی کرب سے سوچا۔

"میری آنکھوں میں ان ناتواں بندھے ہاتھوں کا منظر ٹھہر گیا ہے، جن کی لاج مجھے اپنی آخری سانسوں تک رکھنی ہے۔" وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اس وقت اگر میں تمہیں اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہوں گا تو تم صرف انکار کرو گی اس لئے اس بات کو بعد کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں۔ ہاں...... یہ میرا کارڈ رکھ لو...... اگر ضرورت پڑے تو......"

اُس نے کارڈ لینے کو ہاتھ نہیں بڑھایا بلکہ ہونٹ بھینچ کر پیشانی گھٹنوں پر ٹکا دی۔

وہ کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا اُسے دیکھتا رہا پھر کارڈ اُس کے پیروں کے پاس رکھ کر چلا گیا۔

بہت دیر تک وہ اسی طرح بیٹھی اپنی ہی آوازیں سنتی رہی تھی۔ کبھی دل، کبھی دماغ اور کبھی ضمیر سب اپنی اپنی بولی بول رہے تھے اور وہ اپنے طور پر سب کو مطمئن بھی کر رہی تھی۔ پھر جانے کب سب تھک کر خاموش ہو گئے تھے یا اُس سے ہار مان کر کہ آوازیں آنا بند ہو گئیں اور جب اندر سناٹا چھایا تو باہر کے سناٹے کا احساس بھی جاگ اُٹھا۔ اُس نے فوراً گھٹنوں سے سر اُٹھا دیا۔ پورے گھر پر خاموشی اور ویرانی کی دبیز چادر تنی تھی۔

(سب چلے گئے)۔ اُس نے سوچا اور پھر اپنے آپ کو مطمئن کیا۔

(ظاہر ہے کوئی کب تک رُکتا ہے بھلا...... اور میں اس طرح کیوں بیٹھی ہوں...... ؟ کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح جبکہ ایک طویل سفر میرا منتظر ہے جسے مجھے تنہا ہی طے کرنا ہے)۔ اُس نے بہتی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے رگڑا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے ساری بکھری چیزوں کو سمیٹ کر ان کی جگہوں پر رکھا پھر صفائی کی۔ اس کے بعد کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ جب وہ چائے کا مگ لے کر کچن سے نکلی تو شام ڈھل رہی تھی۔

ڈھلتی شام ویسے بھی اُداس سی لگتی ہے۔ جیسے کائنات ساری اُداسیاں سمیٹ کر دور کہیں اندھیروں میں چھپنے جا رہی ہو۔ اُسے اندھیروں کی آغوش میں سمٹتے ملگجے سے اُجالے اچھے نہیں لگے اور وہ دل پر ایک بوجھ لیے اندر چلی آئی۔

ابا میاں کی چارپائی خالی تھی۔ وہ کتنی دیر تک اُس پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ اُسے احساس بھی نہیں ہوا۔ آنسو پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چائے کے مگ میں گرتے رہے جسے وہ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔

"باجی......!" پڑوس کا بچہ اُسے پکارتا ہوا اندر آیا تو وہ بے حد خاموش نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"باجی...... ! امی پوچھ رہی ہیں آپ کے لئے کھانا بھجواؤں۔"

"نہیں...... ! مجھے بھوک نہیں ہے۔" اُس نے منع کر دیا۔

"باجی......!" بچہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اُس کے پاس چلا آیا۔

"آپ اکیلی رہیں گی......؟" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کو ڈر نہیں لگے گا......؟"

"نہیں......!"

"کیا آپ بہت بہادر ہیں......؟"

"نہیں......!"

بچہ اس کے جواب پر مطمئن نہیں ہوا اور شاید یہ سمجھا کہ وہ اس کی بات نہیں سمجھی۔ اس لئے آسان لفظوں میں اپنا مفہوم یوں واضح کیا۔

"میرا مطلب ہے اگر کوئی چور آ گیا تب......؟"

"تب میں تمہیں بلاؤں گی۔" اُس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اس کے باوجود بچہ ڈر گیا۔

"نہیں باجی...... ! مجھے مت بلایئے گا۔"

"ارے کیوں......؟"

"آپ خود ہی دیوار پھلانگ کر ہمارے گھر آ جایئے گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ بھاگتا ہوا چلا گیا۔ یوں جیسے ابھی ابھی کسی چور کی آمد متوقع ہو۔ وہ کتنی دیر تک بیٹھی اُس کی باتوں کو سوچتی رہی پھر اُٹھ کر پہلے باہر کا دروازہ بند کیا اس کے بعد اندر آ کر کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا اور جب اپنی جگہ پر لیٹی تو ادراک ہوا کہ وہ اب تک اپنے آپ کو دھوکا دیتی آ رہی ہے ورنہ وہ اب بھی اندر سے وہی بزدل اور کمزور لڑکی ہے جو حالات سے بری طرح خوفزدہ ہے۔

پوری رات اسی طرح گزر گئی اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ سونا نہیں چاہتی تھی

بلکہ اُس نے بہت کوشش کی لیکن ایک نامعلوم سے خوف نے اسے سونے نہیں دیا۔ فجر کی اذان ہونے لگی تھی۔ اُس نے مزید کوشش کا ارادہ ترک کر دیا اور نماز پڑھنے کے لئے اُٹھ گئی۔

صبح کی سپیدی نمودار ہوتے ہی اُس کا ڈر اور خوف جانے کہاں جا چھپا کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف بہتر محسوس کرنے لگی بلکہ رات بھر جاگنے کو حماقت پر بھی محمول کیا۔ ناشتے کے نام پر اُس نے چائے کے ساتھ صرف دو رس لیے اور پھر ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس کا خیال تھا پڑوس میں سے کوئی ہو گا لیکن ولید بخت کو دیکھ کر اُسے حیرت تو نہیں ہوئی ناگوار ضرور گزرا اور اس کی ناگواری محسوس کرتے ہی وہ کہنے لگا۔

"مجھے آنا تو نہیں چاہئے تھا لیکن آئے بنا چارا بھی تو نہیں تھا۔"

"کیوں...... ؟ ایسی کیا بات ہو گئی......؟" ناگواری کا اظہار اس کے لہجے سے بھی ہو گیا۔

"رات بھر تم کسی انجانے خوف میں گھر کر جاگتی رہیں۔ میں نے سوچا جاتے جاتے تم سے پوچھتا چلوں کہ تم اس خوف سے نکلیں یا نہیں......؟"

"ولید بخت......!" وہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہیں میری کیفیتوں کی خبر کون دیتا ہے......؟"

"میں بذاتِ خود تمہارے آس پاس رہتا ہوں، بات صرف محسوسات کی ہے۔"

"تو یہ غلام علی......!" اسے خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔

"سنو...... ! دن کے اُجالے میں اب تم یہ مت سمجھنے لگنا کہ تم بہت بہادر ہو گئی ہو۔"

"اور تم بھی یہ مت سمجھنا کہ میں خوفزدہ ہو کر تمہارے ساتھ جانے پر آمادہ ہو جاؤں گی سن لو ولید بخت......! کہ مر بھی جاؤں گی تو ایسا نہیں سوچوں گی...... تمہارے ساتھ جانے کا تو کبھی بھی نہیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔

(میں نے ایسا ڈھیٹ شخص اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ واضح طور پر اپنی نفرت کا اظہار کر چکی ہوں پھر بھی چلا آتا ہے)۔ وہ کتنی دیر تک اس کے بارے میں اسی انداز سے سوچتی رہی تھی۔

دوپہر میں جب وہ غیر جانبداری سے اپنے بارے میں سوچنے بیٹھی تو اسے اپنے آپ سے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اس طرح نہیں رہ سکتی۔ اسے کوئی ایسا راستہ منتخب کرنا پڑے گا کہ جس پر چل کر وہ اپنے لئے کچھ سامان خرید سکے۔ آخر زندہ رہنے کے لئے فقط ایک چھت ہی تو درکار نہیں ہے اور بھی بہت کچھ چاہئے ہوتا ہے۔ جبکہ یونہی بیٹھے رہنے سے تو اس کے پیٹ کی روٹی بھی میسر نہیں آ سکتی۔ ابا میاں نے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی جس پر وہ تکیہ کر کے بیٹھ جاتی اور نہ ہی ایک عمر کی ملازمت کے بعد ان کے واجبات اس کی بقیہ تمام زندگی کے لئے کافی ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے کل کے بارے میں مختلف انداز سے سوچتے ہوئے سو گئی۔ وہ بالکل بے خبری کی نیند نہیں سوئی تھی لیکن کیونکہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اس لئے اس وقت بالکل بے خبر ہو گئی۔

شام ڈھل چکی تھی جب دروازے پر زوردار دستک کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ دستک پتا نہیں کب سے ہو رہی تھی۔ اب بھی اس کے پہنچنے تک دو تین بار دروازہ پیٹا جا چکا تھا۔

"کون......؟" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

''میں ہوں بیٹا......؟'' آواز جانی پہچانی تھی پھر بھی وہ فوری طور پر پہچان نہ پائی۔ دروازہ کھولا سامنے بی بی کھڑی تھیں اور ان کے پیچھے وہ بھی تھا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو وہ فوراً دروازہ بند کر دیتی کیونکہ وہ پہر میں وہ کچی نیند کر کے سوئی تھی لیکن بی بی کی وجہ سے اس نے اندر آنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

''کیا سو رہی تھیں......؟'' بی بی اندر آتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''جی......؟'' اس نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''مجھے ابھی ولید نے تمہارے ابا میاں کا بتایا۔'' بی بی بیٹھتے ہی بولیں اور پھر بہت دیر تک ابا میاں کی باتیں اور تعزیت کرتی رہیں۔ اس دوران بار بار اس کی آنکھیں چھلکیں اور ہر بار بی بی نے اپنے دامن میں اس کے آنسو سمیٹے اور آخر میں اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ دادی کے بعد اب برسوں بعد اسے ایک مامتا بھری آغوش میسر آئی تھی جس میں سمٹ کر پہلے وہ مچل مچل کر روئی پھر دل پر چھائے آزردگی کے بادل یوں چھٹے کہ وہ کافی حد تک پُرسکون ہو گئی۔

''جاؤ بیٹی......! منہ ہاتھ دھولو اور مجھے بتاؤ باورچی خانہ کہاں ہے......؟ میں جب تک تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔'' بی بی نے اسے اُٹھایا پھر خود اُٹھنے لگیں کہ اس نے روک دیا۔

''آپ بیٹھیں بی بی......! میں چائے بناتی ہوں۔'' وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ پہلے منہ ہاتھ دھویا پھر کچن میں آ کر ابھی چائے کا پانی رکھا ہی تھا کہ وہ چلا آیا۔

''معاف کرنا ثوبیہ......! مجھے بار بار یہاں آنا پڑتا ہے۔'' وہ جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''اصل میں غلام علی صاحب تمہاری ذمہ داری مجھے سونپ گئے ہیں۔ تم نہ مانو یہ الگ بات ہے لیکن میں اس ذمہ داری کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں۔''

''میں کوئی چھوٹی سی بچی نہیں ہوں۔'' وہ اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے بول پڑی۔

''بچی نہیں ہو لیکن لڑکی بہرحال ہو اور بدقسمتی سے تنہا بھی ایسے میں تمہارے لئے محافظ کی ضرورت......''

''ولید بخت......!'' اس نے اسے ٹوک دیا۔

''کہیں تم میرے محافظ بننے تو نہیں آئے۔ ویسے بڑی دلچسپ بات ہے کہ غیر بھی پاسبان ہونے کا دعویٰ کرنے لگے ہیں۔''

''میں کوئی ایسا دعویٰ نہیں کر رہا۔'' وہ کہاں تک اس کی باتیں برداشت کرتا آخر ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا۔ اس کی آواز میں قدرے تلخی آ گئی اور لہجے میں تنبیہ کہ بار بار میری انا کا بت مت توڑو۔

''پھر......؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے صرف غلام علی صاحب کا خیال ہے جو میں بار بار تمہارے در پر چلا آتا ہوں ورنہ مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں۔''

''اچھا......!'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی پھر کہنے لگی۔

''تمہیں نہ تو میرے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت ہے اور نہ بار بار میرے در کے چکر لگانے کی۔ کیونکہ میں اپنے لئے خود بہتر انداز سے سوچ سکتی ہوں بلکہ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نہ صرف سوچ سکتی

ہوں بلکہ فیصلہ بھی کر چکی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''کیا فیصلہ کیا ہے تم نے......؟'' وہ فوراً پوچھنے لگا۔

''کیا ضروری ہے تم میری ہر بات جانو......؟'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''میں بتاؤں نہ بتاؤں...... تم جان جاؤ گے کیونکہ بقول تمہارے میرے آس پاس جو رہتے ہو۔'' اس کی طنز کے باوجود وہ محظوظ ہوا اور ہنسنا بھی چاہتا تھا لیکن صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''بہرحال جب تک تم اپنے فیصلے پر عملدرآمد نہیں کرتیں تب تک کے لئے میں بی بی کو تمہارے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس پر تم اعتراض نہیں کرو گی۔''

''مجھے واقعی اعتراض نہیں ہے۔ آخر میں بھی تو ان کی مہمان رہی ہوں۔'' وہ مسلسل طنز کر رہی تھی۔

''لیکن ایک بات سن لو......! میں بی بی کی آڑ میں تمہارا بار بار یہاں آنا پسند نہیں کروں گی۔''

''یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں اپنی کسی خواہش کے پیش نظر انہیں یہاں چھوڑ رہا ہوں مجھے غلام علی صاحب کا خیال ہے اور تم انہی کی بیٹی ہو۔'' وہ ایڑیاں اُٹھا کر پنجوں پر ذرا سا اونچا ہوا پھر اسی طرح گھوم کر چلا گیا۔

○ ○ ○

بی بی کے آنے سے واقعی اس کی کافی ڈھارس بندھی تھی اور وہ اپنے آپ کو قدرے محفوظ تصور کرنے لگی تھی۔ جب غم میں وہ شدت نہ رہی اور ذہن پُرسکون ہوا تو وہ ازسرنو اپنے بارے میں سوچنے لگی۔ اس وقت بھی وہ سوچوں میں گم تھی جب بی بی اسے پکار کر پوچھنے لگی۔

''بیٹی......! ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہو......؟''

''کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں...... یہاں تو سوچنے کو بہت ساری باتیں ہیں۔'' وہ طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔

''میں بھی تو سنوں۔'' بی بی اس کے پاس آ بیٹھیں۔

''میری سوچیں روٹی کپڑا مکان کے گرد گھومتی ہیں۔ اس وقت تو یہ تینوں چیزیں مجھے میسر ہیں۔ لیکن زیادہ عرصہ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں۔''

''ساری باتوں کا ایک ہی حل ہے بیٹی......! شادی کر لو۔'' بی بی نے نہایت اطمینان سے مشورہ دے ڈالا۔ وہ کتنی دیر تک ان کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔

''مجھ سے کون شادی کرے گا......؟''

''کیوں......؟ کیا کمی ہے تم میں......؟ ماشاءاللہ......! ہزاروں نہیں لاکھوں میں ایک ہو۔''

''لاکھوں کو خاک...... آپ کے ہونہار سپوت ولید بخت نے کیا ہے بی بی......! جو کچھ ہوا آپ کے سامنے ہے۔ اس کے باوجود آپ نے شادی کا مشورہ دے کر لگتا ہے میرا مذاق اُڑایا ہے۔''

''بیٹی......! کیسی باتیں کر رہی ہو۔''

''میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ کو کیا معلوم......؟ میری اپنی پھوپھی اماں جن کے بیٹے سے میں گزشتہ آٹھ سال سے منسوب تھی وہ پل میں سارے ناطے توڑ گئی ہیں۔ محض اس واقعے کی بنا پر...... اور جب اپنوں نے

جڑے ناطے تو ڑ دیئے تو غیروں سے آدمی کیا توقع رکھے۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی شامل ہوگئی، پھر بھی وہ خاموش نہیں ہوئی۔

"میں اس نہج پر سوچ کر اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ میں نے اسی دن، جس دن پھوپھی اماں ناطہ توڑ گئی تھیں، جان لیا تھا کہ زندگی کے اس رُخ پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ میں خواب سجا سکتی ہوں اور نہ ہی ان کی تعبیر مانگنے کو میرے ہاتھ اُٹھنے کے قابل رہے ہیں۔ اس تمام عرصے میں بی بی.....! میں تو اپنا قصور سوچتی رہی ہوں اور یقین کریں میری یادداشت میں اپنی حیات کا کوئی ایسا پل محفوظ نہیں ہے، جو میں نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو، کسی کا دل دُکھایا ہو یا حق مارا ہو، پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا.....؟ کیوں بنا قصور کے ایک عمر کی سزا میرا مقدر ٹھہری.....؟" وہ رونا نہیں چاہتی تھی پھر بھی آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے۔ اس کی باتوں میں صداقت تھی اس لئے بی بی اپنے آپ میں مجرم بنی خاموش رہیں۔

"بہرحال آپ بتا دیجئے گا ولید بخت کو..... میں اس بات کو جی کا روگ بنا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ میں اسے اپنے طور پر زندہ رہ کر دکھاؤں گی۔ وہ اگر یہ سمجھ رہا ہے کہ میں حوادثِ زمانہ سے گھبرا کر اسے آواز دوں گی تو یہ اس کی بھول ہے، مجھے اس سے نفرت ہے..... شدید نفرت۔" اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

اگلے دن وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔ پہلے آس پاس کے اسکولوں میں پتا کیا کہیں کوئی جگہ خالی ہو لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ مایوس نہیں ہوئی کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ہر قسم کی صورت حال کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی چیز آسانی سے حاصل نہیں ہوگی۔ پھر اگلے کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک دو جگہ بات بنی بھی لیکن تنخواہ اتنی کم تھی کہ اس نے خود ہی منع کر دیا۔ ساتھ ہی اسکول میں پڑھانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا پھر "ضرورت ہے" کے اشتہار دیکھنے سے پہلے ایک انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لے کر وہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے لگی۔

اس تمام عرصے میں ولید بخت ایک بار بھی نہیں آیا۔ بی بی البتہ دو تین بار اپنے گھر سے ہو آئی تھیں اور اب ان کا کہنا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہ سکیں گی۔ کیونکہ دو مہینے بعد ان کا بیٹا جہانزیب آنے والا ہے اور وہ اس کے آنے سے پہلے ہی اپنے گھر چلی جائیں گی۔ وہ انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ یہ بھی ان کا احسان تھا کہ اپنا گھر چھوڑ کر اس کے پاس رہ رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی بی بی کے جانے سے پہلے ہی وہ اپنی زندگی کی ناؤ کو کسی کنارے لے آئے۔ جہاں سے بقیہ سفر میں اس کے لئے مزید دشواریاں نہ ہوں۔ اس کا خیال تھا جاب ملتے ہی وہ کسی گرلز ہاسٹل میں اپنے لئے ایک کمرہ لے لے گی۔ بہرحال یہ بعد کی بات تھی۔ پہلا مسئلہ جاب کا تھا جس کے لئے وہ روزانہ کسی نہ کسی دفتر کا چکر لگا رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک جگہ انٹرویو دینے کے بعد گھر جانے کے لئے اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی جب ولید بخت نے اپنی بائیک اس کے بالکل قریب لا کر روکی۔

وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی بلکہ قدموں کو اور مضبوطی سے جما لیا۔ اپنے تئیں شاید وہ اسے جتانا چاہتی تھی کہ میں ہر طوفان کے سامنے یونہی جم کر کھڑی رہ سکتی ہوں۔

"کیسی ہو.....؟" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"ٹھیک ہوں.....!" اسی لہجے میں جواب دیا۔

"کہاں جا رہی ہو.....؟" وہ جواب دینے کے بجائے دُور سے آتی بس کی طرف دیکھنے لگی۔

"سنو.....! اگر گھر جا رہی ہو تو میرے ساتھ چلو میں تمہارے ہی گھر جا رہا ہوں۔"

"کیوں.....؟"

"مجھے بی بی سے کچھ کام ہے۔"

"مجھے بتا دو۔ میں کہہ دوں گی۔" اس نے بے اعتنائی کی انتہا کر دی۔ اس کے باوجود وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"بڑی بے مروّت ہو..... چھوٹے منہ ہی کہہ دو کہ....."

"مجھ سے ایسی توقع مت رکھو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی اور قریب آتی بس کی طرف بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے بائیک آگے کر دی۔

"میرے ساتھ چلو.....!"

"اپنی حد میں رہو ولید بخت.....! ورنہ....." وہ دانت پیستی ہوئی چکر کاٹ کر جلدی سے بس میں سوار ہوگئی اور جب گھر میں داخل ہوئی تو وہ اسے بی بی کے پاس بیٹھا نظر آیا۔ وہ نظر انداز کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی اور اس وقت تک اپنے آپ کو وہیں مصروف رکھا جب تک وہ چلا نہ گیا۔

○ ○ ○

اس کا ٹائپنگ کا کورس مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ابھی تک کہیں جاب نہیں ملی تھی۔ گو کہ وہ اس بات کے لئے تیار تھی کہ کوئی چیز آسانی سے حاصل نہیں ہوگی، پھر بھی اب تک وہ اتنے انٹرویو دے چکی تھی کہ اب مزید کوشش کرنے پر اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

(سب دکھاوا ہے)۔ وہ سوچتی۔

(سلیکشن تو وہ پہلے ہی کر چکے ہوتے ہیں محض خانہ پوری کے لئے سب کو بلا کر بے وقوف بناتے ہیں)۔

ادھر بی بی اپنے گھر جانے کے لئے تیار تھیں۔ اب جاب سے زیادہ اسے یہ فکر ستانے لگی کہ وہ اکیلی کیسے رہے گی.....؟

"بی بی.....! کچھ دن اور....." اس نے منت کر ڈالی۔

"میں اپنا کوئی انتظام کر لوں پھر چلی جایئے گا۔"

"بیٹی.....! تم میرے ساتھ چلی چلو.....!" بی بی نے خلوص سے پیش کش کی اس کے باوجود اسے لگا جیسے ان کے منہ میں ولید بخت کی زبان ہو اور یہ کیسے ممکن تھا کہ جس بات کے لئے وہ اسے بری طرح دھتکار چکی تھی اب اُسی پر عمل کر ڈالے۔

"میرا جانا ممکن نہیں ہے بی بی.....!" اس نے سہولت سے منع کیا۔

"بس..... آپ کچھ دن اور رُک جائیں۔ اگر اس دوران میرا کام ہو گیا تو ٹھیک..... ورنہ پھر بھی میں آپ کو روکوں گی نہیں۔" اس نے بی بی سے وعدہ کر لیا۔

(بس آج آخری کوشش)۔ وہ انٹرویو کے لئے جا رہی تھی تمام راستہ اپنے آپ سے یہی کہتی رہی۔ شاید اندر کہیں مایوسیوں نے بھی گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ خاصی دل برداشتہ بھی ہو رہی تھی اور ذہن مسلسل آنے والے

کل کو سوچتے ہوئے پریشانیوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

اس کا نام پکارا گیا۔ وہ کسی معمول کی طرح اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ پھر وہی باتیں جو پہلے انٹرویو میں ہوئی تھیں۔ اس نے بے دلی سے جواب دیئے اور بڑی عجلت میں اُٹھ کر باہر آ گئی۔ اس ٹھنڈے کمرے میں اس کا دل گھبرانے لگا تھا اور اس خیال نے کہ سب دکھاوا ہے۔ اسے وہاں سے جلدی اُٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ باہر آ کر وہ دوبارہ بینچ پر بیٹھ گئی اور قریب سے گزرتے چوکیدار سے پانی لانے کے لئے کہا۔ پانی پی کر اعصاب قدرے پُرسکون ہوئے تو وہ بیگ کندھے پر لٹکائے ہوئے جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ابھی اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک بار پھر اس کا نام پکارا جانے لگا۔ وہ ٹھٹک کر رُکی اور حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔

"ثوبیہ غلام علی آپ ہیں......؟" کسی نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ وہ صرف سر ہلا گئی۔

"آپ کو ایم ڈی صاحب بلا رہے ہیں۔"

اپنی طرف اشارہ کئے وہ بس لمحہ بھر کو رُکی پھر اس کے پیچھے چل پڑی۔

"میرے خدا......!" اسے دیکھتے ہی ایم ڈی نے اپوائنٹمنٹ لیٹر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور کتنی دیر تک وہ غیر یقینی سے اس بند لفافے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اتنی کوششوں کے بعد اس کا مایوس ہونا شاید اُوپر والے کو پسند نہیں آیا تھا۔ جب ہی اُمیدوں کے چراغ اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔ وہ بے حد خوش ہوئی۔

"تھینک یو سر......!" اس کی آواز میں زندگی کی کھنک لوٹ آئی تھی۔

"آپ پہلی تاریخ سے جوائن کر لیں۔"

"او کے سر......!" اس نے باہر آتے ہوئے دنوں کو شمار کیا۔ پہلی تاریخ میں چھ دن تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس عرصے میں وہ رہائش کا بھی کوئی انتظام کر لے گی۔ آفس سے نکل رہی تھی کہ ایک لڑکی بینچ سے اُٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ پہلے وہ متوجہ نہیں ہوئی لیکن جب اس نے پوچھا۔

"انٹرویو کیسا رہا......؟" تب وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شکل کچھ جانی پہچانی سی تھی جیسے پہلے کہیں دیکھا ہو۔ ذہن پر زور دیا لیکن یاد نہیں آیا۔

"تم نے بتایا نہیں...... انٹرویو کیسا رہا......؟" لڑکی نے دوبارہ پوچھا تو وہ خجل سی ہو کر مسکرانے لگی۔

"کامیاب رہا...... بلکہ اپوائنٹمنٹ لیٹر بھی مل گیا ہے اور پہلی تاریخ سے مجھے جوائن کرنا ہے۔"

"اچھا......! مبارک ہو......!" لڑکی نے خوشی کا اظہار کیا۔

"کیا تم بھی انٹرویو کے لئے آئی تھیں......؟" وہ اس سے پوچھنے لگی۔

"نہیں......! میں ایک اور جگہ جاب کر رہی ہوں۔ یہاں ایک کام کے سلسلے میں آئی تھی۔" قدرے توقف کے بعد پوچھنے لگی۔

"تم کس طرف جاؤ گی......؟"

"حسن آباد......!"

"ارے......! میں بھی اسی طرف جا رہی ہوں۔ اگر تمہارے پاس کنوینس نہیں ہے تو چلو......! میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔"

"شکریہ......! میں بس سے چلی جاؤں گی۔" اس نے منع کیا لیکن وہ بھی عجیب لڑکی تھی بصد اصرار اسے اپنے ساتھ لے آئی۔

"میرا نام مریم ہے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں ثوبیہ ہوں۔"

تعارف کے بعد باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور گھر پہنچنے تک وہ اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی۔

"سنو......!" جب وہ گھر کے سامنے اُترنے لگی تو مریم نے ایک کاغذ پر جلدی جلدی کچھ لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ میرا نمبر ہے۔ کل اسی وقت مجھے فون کر لینا۔" اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگی۔

"ہمارے ہاں ایک کمرہ خالی ہے اگر تم پے انگ گیسٹ کے طور پر رہنا چاہو تو......"

"میں کل تمہیں فون کروں گی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"او کے......! خدا حافظ......!" مریم ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی بڑھا لے گئی اور اس نے فوراً پلٹ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

"بی بی......! بی بی......!" بی بی نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ ان سے لپٹ گئی۔

"میرا کام ہو گیا بی بی......! مجھے نوکری مل گئی اور اُمید ہے کل رہنے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" خوشی سے اس کی آواز بے قابو ہو گئی تھی اور بی بی کو گول گول چکر دیتے ہوئے وہ گرنے کو تھی کہ دو مضبوط ہاتھوں نے بی بی کے ساتھ ساتھ اسے بھی تھام لیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے بی بی کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

"ثوبیہ......! تم ٹھیک تو ہو؟" اس کی آواز پر وہ ایک جھٹکے سے سر اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ کس قدر قریب کھڑا تھا وہ اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے۔ وہ فوراً پیچھے ہٹی اور اس کی طرف سے پیٹھ موڑتے ہوئے بولی۔

"تم کب آئے......؟"

"ابھی میں نے دستک دی تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ پھر سامنے جو منظر دیکھا تو......" وہ مسکراہٹ روکتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا گیا۔

"ویسے اس سارے ہنگامے کا پس منظر پوچھ سکتا ہوں......؟"

"مجھے جاب مل گئی ہے۔" وہ اپنی خوشی میں بھول گئی کہ سامنے وہ کھڑا ہے۔ بے اختیار اس کی طرف پلٹی۔

"اور پتا ہے...... بہت جلد میری رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

"رہائش کا کیا مسئلہ تھا......؟ یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔"

"اپنا تو ہے لیکن میں اکیلی نہیں رہ سکتی تھی اور جب سے بی بی نے جانے جانے کی رٹ لگائی شروع کی ہے تب سے تو میں اور پریشان ہو گئی تھی۔"

"بی بی تمہارا اتنا ہی ساتھ دے سکتی تھیں۔ اب ظاہر ہے ان کا بیٹا آنے والا ہے اور بی بی کو اس کی شادی

بھی کرنی ہے اور پھر ان کا بیٹا یہ کہاں چاہے گا کہ اس کی موجودگی میں اس کی والدہ کہیں اور رہیں......؟"

"میں جانتی ہوں اور میں نے بی بی سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر اس ایک ہفتے میں میرا کام نہ بھی ہوا تو میں انہیں نہیں روکوں گی۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ میرے دونوں مسئلے ایک ساتھ حل ہو گئے۔"

"رہائش کا انتظام کہاں کیا ہے......؟" اس نے یونہی پوچھا تھا اور وہ جانے کیا سمجھی کہ مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ وہ اتنی دیر سے اس سے یوں باتیں کئے جا رہی ہے جیسے اس کا سب سے بڑا ہمدرد وہی تو ہے جبکہ اس کی نظر میں وہ اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

"یوں کیا دیکھ رہی ہو......؟" وہ اس کی کیفیت سمجھ کر محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں......!" وہ نظریں چرا گئی۔

"تم نے بتایا نہیں کہ رہنے کے لئے کہاں انتظام کیا ہے......؟"

"سوری......! میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"مت بتاؤ......! لیکن اپنا اطمینان ضرور کر لینا۔"

"کیا مطلب......؟"

"ظاہر ہے تم اکیلی لڑکی ہو اور کوئی بھی تمہیں بے وقوف بنا سکتا ہے۔ جبکہ میرا خیال ہے تم ابھی زمانے کے چلن سے بالکل ناواقف ہو۔"

"تمہارا میرے بارے میں خیال غلط ہے ولید بخت! میں اب بندوں کو اچھی طرح پہچاننے لگی ہوں۔"

"اچھا......!" وہ کھل کر ہنسا اور وہ برا مانتی ہوئی اندر چلی گئی۔

○ ○ ○

وہ مریم کے گھر شفٹ ہوئی تو اپنے طور پر اس نے اپنی زندگی کے گزشتہ باب کو بند کر دیا۔ مریم کی فیملی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ والدین کے علاوہ مریم سمیت دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔ مریم کسی مقامی فرم میں جاب کرتی تھی۔ اس کی بہن ارم بی۔ اے کی اسٹوڈنٹ تھی جبکہ بھائی میٹرک میں پڑھتا تھا۔ والدہ سیدھی سادی نیک خاتون تھیں اور والد اسے دیکھنے میں ابا میاں کی طرح لگے تھے۔ وہ اپنا گارمنٹ کا کاروبار کرتے تھے۔ اچھا خاصا خوشحال گھرانہ تھا۔ اسے جو کمرہ دیا گیا تھا وہ بقیہ کمروں سے قدرے الگ تھلگ تھا لیکن بالکل الگ نہیں لگتا تھا کیونکہ آنے جانے کا راستہ اس کے سامنے تھا۔ شروع شروع میں وہ کافی جھجکتی رہی اور کوشش کرتی کہ جب مریم کے والد گھر پر ہوں، وہ اپنے کمرے ہی میں رہے۔ ویسے دن کا بیشتر حصہ تو اس کا آفس ہی میں گزرتا تھا۔ شام میں البتہ سب کا سامنا ہونے کا امکان ہوتا تھا اور ایسے وقت وہ کمرے میں رہتی۔ پھر آہستہ آہستہ کبھی مریم اور کبھی ارم اسے ٹی وی پر کسی خاص پروگرام کے بہانے کمرے سے باہر لانے لگیں۔ ویسے بھی گھر میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں تھا جس کی وجہ سے کوئی نیا افسانہ بننے کا ڈر ہوتا۔ اس لئے کچھ ہی دنوں میں اس کی جھجک کافی حد تک کم ہو گئی۔ اب وہ اکثر آفس سے واپسی پر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کچن میں چلی جاتی اور جو بھی کام کر رہا ہوتا وہ اس کا ہاتھ بٹانے لگتی۔ زندگی کی ناؤ بھنور سے نکل کر پرسکون سطح پر بہنے لگی تھی اور فی الحال اس کے لئے یہ بہت تھا۔

اس شام وہ آفس سے نکلی اور اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے اس نے ابھی کچھ فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ولید

بخت ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔ یوں جیسے اچانک وہ نظر آئی ہو لیکن اس نے محسوس کیا جیسے وہ پہلے ہی سے کہیں آس پاس موجود تھا۔

"کیا تم نے تہیہ کر لیا ہے کہ میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے......؟"

"اور تم مجھ سے پیچھا کیوں چھڑانا چاہتی ہو......؟" وہ اسی کے لہجے میں بولا تو وہ سختی سے ہونٹ بھینچ گئی۔

"سنو......! کون کس کا پیچھا کر رہا ہے......؟ اس بحث کو ہم پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت تم سنجیدگی سے میری بات سن لو۔" وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ کہنے لگا۔

"میں پچھلے دو دن سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں اگر تم اپنا کوئی نیا نشان چھوڑ جاتیں تو مجھے اتنی دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ بہرحال اب تم مل ہی گئی ہو تو یہ اپنا کارڈ لو۔" اس نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"کیسا کارڈ ہے......؟" وہ لینے سے پہلے پوچھنے لگی۔

"بی بی نے دیا ہے۔ ان کے بیٹے کی شادی کا کارڈ ہے۔ انہوں نے کہا تھا یہ ہر صورت تم تک پہنچانا ہے اور تمہارے لئے تاکید تھی کہ ضرور آنا۔" اس نے خاموشی سے کارڈ لے لیا۔

"آؤ گی ناں......؟" اس کے لہجے کا اشتیاق چھپائے نہ چھپا۔

"کوشش کروں گی۔"

"صرف کوشش نہیں ثوبیہ......! بی بی نے بہت محبت اور مان سے بلایا ہے۔" وہ بہت خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا سوچنے لگیں......؟" وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"میں سوچ رہی ہوں وقت تمہیں ہر دوسرے موڑ پر میرے سامنے کیوں لا کھڑا کرتا ہے......؟ میں جتنا گزرے دنوں کو بھولنے کی کوشش کرتی ہوں تم سامنے آ کر میری ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہو۔"

"حالانکہ میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا جبکہ اندر کہیں کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"بہرحال یہ بتاؤ تم جہاں ہو وہاں خوش اور مطمئن ہو......؟"

"ہاں......! بہت حد تک۔"

"چلو......! تمہاری طرف سے مجھے اطمینان ہوا۔"

وہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتی تھی جس سے اس کا سارا اطمینان پل میں رخصت ہو جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔

"ٹھیک ہے......! بی بی سے کہہ دینا میں آؤں گی۔" اس کے ساتھ ہی وہ اسے وہیں چھوڑ کر اپنے راستے پر چل پڑی۔

گھر میں داخل ہوئی تو مریم اور ارم بیڈمنٹن کھیلتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ اندر جانے کے بجائے وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور بظاہر ان کا کھیل دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں مسلسل شٹل کاک پر تھیں جو کبھی ادھر جاتی اور کبھی ادھر اور اسی طرح اس کا ذہن بھی بھٹک رہا۔

''ثوبیہ.....! آؤ تم بھی کھیلو۔'' مریم نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آؤ ناں.....!'' اس نے دوبارہ بلایا۔

''مجھے کھیلنا نہیں آتا۔'' اس نے معذوری ظاہر کی۔

''ارے.....! اس میں کیا مشکل ہے.....؟''

''مشکل نہ ہو لیکن میں کیونکہ کبھی کھیلی ہی نہیں اس لئے مجھے مشکل لگتا ہے۔''

''چلو.....! میں سکھا دیتی ہوں۔''

''پھر کبھی سہی اس وقت تھکی ہوئی آئی ہوں۔'' وہ بیگ اُٹھا کر کھڑی ہوگئی اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے محسوس ہوا جیسے اس کا سارا اطمینان رُخصت ہو رہا تھا اور وہ حالات سے لڑنے کی سکت کھو رہی ہو۔

(ولید بخت.....! یہ سب تمہاری وجہ سے ہے)۔ وہ بیگ پھینک کر خود بھی وہیں بیڈ پر گر گئی۔

(میں جتنا ماضی سے بھاگتی ہوں وہ اتنا میرا تعاقب کرتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے میرا ولید بخت سے پھر بھی ہم کسی نہ کسی ناطے ایک موڑ پر آ کھڑے ہوتے ہیں..... آخر کیوں.....؟ اور اُسے یہ یقین کیوں ہے کہ میں حالات سے شکست مان کر بالآخر اسے ہی آوازدوں گی.....؟)۔

''ثوبیہ.....!'' مریم اسے پکارتی ہوئی اندر چلی آئی اور اسے بیڈ پر اوندھے لیٹے دیکھ کر تشویش سے بولی۔

''کیا ہوا.....؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟''

''ہاں.....!'' ہاں کی صورت اس نے سینے میں دبی سانس خارج کی۔

''لو چائے پیؤ.....!'' مریم نے ایک مگ اس کی طرف بڑھایا تو وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

''تم نے خوامخواہ زحمت کی میں ابھی آ ہی رہی تھی۔''

''چلو یہ تکلف چھوڑو..... یہ بتاؤ تمہیں ہوا کیا ہے.....؟'' مریم اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بہت اپنائیت سے پوچھنے لگی۔

''مجھے کیا ہوا ہے.....؟ کچھ بھی نہیں۔''

''نہیں ثوبی.....! جب تم آئی تھیں اس وقت میں نے محسوس کیا تھا کہ تم کچھ بجھی بجھی سی ہو۔ کیا آفس میں کوئی بات ہوگئی ہے.....؟''

''نہیں.....!''

''پھر.....؟''

ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا وہ ساری بات مریم کو بتا کر اس سے مدد مانگے۔ اس سے کہے کسی طرح ولید بخت سے میرا پیچھا چھڑا دو۔ کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ میرے راستے میں آنا چھوڑ دے۔ لیکن پھر اس خیال نے کہ پتا نہیں مریم اس کے بارے میں کیا سوچے۔ اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

''کچھ پریشان ہو.....؟'' مریم بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''ہاں.....! نہیں.....!'' بمشکل اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پایا پھر کہنے لگی۔

''میں پریشان نہیں ہوں مریم.....! بس یونہی طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔''

''تم نہ بتانا چاہو..... دوسری بات ہے ورنہ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ کوئی بات ضرور تمہاری پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔''

''تم خوامخواہ شبہ کر رہی ہو۔'' وہ بیگ کھول کر اس میں سے کارڈ نکالنے لگی۔ پھر وہ کارڈ مریم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اصل بات یہ ہے۔''

''یہ کیا ہے.....؟'' مریم کارڈ ہاتھوں میں لیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ ایک شادی کا کارڈ ہے۔ میں یہاں جانا نہیں چاہتی اور جانا ضروری بھی ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی.....؟'' مریم بالکل نہیں سمجھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''جانا یوں ضروری ہے کہ یہ اس عورت کی طرف سے ہے جس کے مجھ پر احسان ہیں اور جانے پر دل آمادہ یوں نہیں ہوتا کہ وہاں وہ بھی ہوگا۔'' آخری الفاظ اس نے بے خیالی میں ادا کئے تھے۔

''کون.....؟ کون ہوگا.....؟'' مریم کے پوچھنے پر وہ چونک گئی۔

''کوئی نہیں.....!''

''ثوبیہ.....! شاید تم مجھے دوست نہیں سمجھتیں جبھی اتنی غیریت برت رہی ہو.....؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ نادم ہوئی۔

''تو پھر سیدھی طرح بتاؤ کیا بات ہے.....؟ اپنے آپ میں کیوں اُلجھ رہی ہو.....؟''

وہ کتنی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ اصل میں وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مریم کو کس طرح مطمئن کرے۔ بہت دیر بعد اس نے یوں بات کی۔

''اصل میں اس خاتون کا ایک بیٹا ہے جو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا اور میں کئی بار اس سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر چکی ہوں اس کے باوجود وہ مجھ سے کچھ غلط اُمیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے اور میں اس کی وجہ سے شادی میں نہیں جانا چاہتی۔''

''اتنی سی بات کو تم نے مسئلہ بنا لیا ہے.....؟'' مریم کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔

''تم اسے اتنی سی بات کہہ سکتی ہو کیونکہ تمہارا اس لڑکے سے واسطہ نہیں پڑا..... انتہائی لوفر ہے۔''

''کتنا بھی لوفر ہو پھر بھی وہ شادی کے بھرے گھر میں سے تمہیں اغواء کر کے لے جانے سے تو رہا.....؟''

مریم نے یونہی ایک بات کہی تھی اور وہ زرد پڑ گئی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو؟'' اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تو مریم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''عجیب لڑکی ہو..... تم تو یوں ڈر رہی ہو جیسے وہ سچ مچ تمہیں.....''

''پلیز مریم.....!'' اس نے ٹوک دیا۔

''اچھا چھوڑو.....! یہ بتاؤ شادی ہے کب.....؟'' پھر خود ہی کارڈ دیکھ کر کہنے لگی۔

''پرسوں..... ایسا کرو تھوڑی دیر کے لئے چلی جانا اور اگر نہ جانا چاہو تو مجھے نمبر دے دینا۔ میں اطلاع کر دوں گی کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

(مجھے نمبر دے دو میں اطلاع کر دوں گی)۔ اس نے دل ہی دل میں دہرایا اور بغور مریم کی طرف دیکھنے لگی۔ جبکہ ذہن اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔

○ ○ ○

اس نے مریم سے بہت کہا کہ وہ ابھی اس کے ساتھ چلے لیکن وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئی۔ بی بی کا خیال نہ ہوتا تو وہ بھی نہ جاتی لیکن بی بی نے ایسے وقت اس کا ساتھ دیا تھا جب اپنے بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے اور انہی کی خاطر وہ مریم کے بھائی شوبی کے ساتھ ان کی خوشیوں میں شریک ہونے چلی گئی۔

اس کا خیال تھا بی بی کے گھر میں پہلے قدم پر اس کا سامنا ولید سے ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پہلے قدم پر تو کیا وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اچنبھے کی بات تو تھی لیکن اسے اطمینان دے گی۔ بی بی کی بیٹی بھی آئی ہوئی تھی، وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور جب بارات روانہ ہوئی تب بھی وہ اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ شوبی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ دلہن والوں کے ہاں وہ بس کچھ دیر ہی رُکے گی۔ اس کے بعد واپس چلیں گے۔

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

وہ سر جھکائے اپنے ہی کسی خیال میں چل رہی تھی جب اس کی آواز کہیں قریب ہی سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رُکی اور ڈرتے ڈرتے سر اُٹھا کر دیکھا۔ خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا وہ قریب چلا آیا۔

"میں اپنے غریب خانے پر تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

"یہ تمہارا گھر ہے۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... ! اور آج میری بہن کی شادی ہے۔" اس نے کہا تو وہ سارا معاملہ سمجھ کر سوچ میں پڑ گئی۔

"آؤ اندر چلو...... !" اس نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں بس...... ! اب میں واپس جاؤں گی۔"

"ارے...... ؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہاں تک آ گئی ہو تو اندر چلنے میں کیا قباحت ہے...... ؟"

"یہاں تک میں انجانے میں آئی ہوں۔" وہ پلٹنے لگی تو وہ قدم بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا۔

"تو بہ...... ! کچھ دیر کو اپنی نفرتیں کہیں پس منظر میں دھکیل دو۔ میں اس خوشی کے موقعے پر واقعی خوش ہونا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہیں خوش ہونے سے نہیں روک رہی اور تم مجھے جانے سے مت روکو۔"

"تم چلی گئیں تو میں کہاں خوش ہو سکوں گا بھلا...... ؟ بس کچھ دیر۔" اصرار میں اسرار تھا۔ وہ نظر انداز کرتے ہوئے ذرا دور کھڑے شوبی کو آواز دے گی۔

"میں جا رہی ہوں...... بی بی پوچھیں تو بتا دینا۔" ایک پل میں اس کی آنکھوں میں جلتی شمعیں بجھ گئیں اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، وہ شوبی کی طرف چل پڑی۔ پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ شاید اسے بھی یقین تھا کہ اگر اس نے غلطی سے بھی پلٹ کر دیکھا تو لمحہ بھر کو ہی سہی پتھر ضرور ہو جائے گی۔

وہ شوبی کے ساتھ واپس آئی تو ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں سب لوگ جاگ رہے تھے۔ وہ شوبی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی اور ابھی لباس بدل کر بیٹھی ہی تھی کہ مریم آ گئی۔

"کھانا نہیں کھاؤ گی...... ؟" مریم اندر آتے ہی پوچھنے لگی۔

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے منع کر دیا۔

"ایک بات بتاؤ...... ؟" مریم اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"شادی کا کھانا بھوک نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ آئی ہو یا اس کی وجہ سے...... ؟"

"کس کی وجہ سے...... ؟"

"وہی...... جسے تم لوفر کہہ رہی تھیں۔"

"دونوں باتیں تھیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"ویسے وہ لوفر ہے کون...... ؟" مریم کے شریر انداز پر اس نے برا سا منہ بنایا اور تکیہ سیدھا کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"چلو...... ! اب مجھے سونے دو۔"

"کیا کرو گی اتنی جلدی سو کر...... ؟ صبح ویسے بھی چھٹی ہے۔"

"چھٹی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ رات جاگ کر گزار دی جائے۔"

"واقعی سو رہی ہو...... ؟"

"ہاں بھئی...... ! کہو تو لکھ کر دے دوں...... ؟"

"اچھا شب بخیر...... ؟" مریم ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی پھر لائٹ آف کرنے سے پہلے وہ معنی خیز انداز سے مسکرائی تھی۔

"عجیب لڑکی ہے۔ پتا نہیں کیا سمجھ رہی ہے؟" وہ ہلکے سے بڑبڑائی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کی جاب ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی اور اب اکیلے پن کا مسئلہ بھی نہیں رہا تھا بلکہ گھر جیسا ماحول مل گیا تھا۔ شروع کے دنوں میں اس نے سوچا تھا اب کوئی مسئلہ نہیں رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اب اسے محسوس ہوتا جیسے اصل مسئلہ تو جوں کا توں اپنی جگہ موجود ہے وہ لاکھ حالات کو شکست دے یا فرار حاصل کرے بہرحال ایک لڑکی ہے اور کسی محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت سے انکار حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے اور وہ کتنا عرصہ حقائق سے نظریں چرا سکے گی۔ دور و نزدیک نظر ڈالی تو پھوپھی اماں کے سوا کوئی نظر نہیں آیا اور پھوپھی اماں کے پاس جانا گویا خود اپنے ہاتھوں اپنی خودداری کا خون کرنا تھا اور یہ اسے کسی طور گوارا نہیں ہوا۔ ان دنوں وہ مسلسل اسی نہج پر سوچتی تھی اور جب تھک جاتی تو اپنے آپ کو یوں مطمئن کرتی۔

(وقت کا دامن بہت وسیع ہے۔ شاید اس پوری دنیا سے زیادہ وسیع...... جبھی تو اس کائنات کے جانے کون کون سے اسرار اپنے دامن میں سمیٹتا چلا جا رہا ہے...... ؟ کبھی جو میرے ساتھ گزرے حادثے پر اس کی نظر پڑے گی تو وہ اسے بھی باقی سب اسرار کی طرح اپنے دامن میں لے اُڑے گا۔ پھر شاید میں اپنی آئندہ زندگی کے لئے کوئی بہتر راستہ منتخب کر سکوں)۔

"تم خاصی اَپ سیٹ رہنے لگی ہو کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ......؟" اس روز مریم نے اسے ٹوک ہی دیا۔

"تمہارا وہم ہے یا پھر میری شکل ہی ایسی ہے۔" اس نے بات بنائی۔

"شکل تو خیر...... اللہ میاں نے اچھی خاصی بنائی ہے۔ تم جان بوجھ کر خراب کئے رہتی ہو۔"

"کیا مطلب......؟"

"ہر وقت بیزاری...... نہ کہیں آنا جانا...... نہ تفریح...... جینے پر جیسے تم نے خود پابندی لگا رکھی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کو زبردستی گھسیٹ رہی ہو۔ کیا تمہارا خوش رہنے کو دل نہیں چاہتا......؟"

"چاہتا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

"پھر کیوں نہیں خوش رہتیں......؟"

"کس کے لئے خوش رہوں......؟"

"اگر ہمیں کسی گنتی میں شمار نہیں کرتیں تو اپنے آپ کے لئے......؟" وہ کچھ دیر تک مریم کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"میرے اندر سناٹا ہے مریم......! اور ایک نامعلوم سا خوف...... مجھے لگتا ہے کہ اگر میں اونچی آواز میں بولوں گی تو لوگ میری طرف اشارہ کرنے لگیں گے اور اگر ہنسوں گی تو سب پاگل کہیں گے۔"

"ارے......!" مریم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہیں یہ خیال کیوں آتا ہے......؟ ہمیں دیکھو......! بات بے بات اونچی آواز میں ہنستے ہیں۔ ہماری طرف تو کوئی اشارہ نہیں کرتا۔"

"تمہاری بات اور ہے۔"

"کیوں......؟ ہماری بات اور کیوں ہے......؟"

"تمہارے سامنے ڈھال کی صورت تمہارے امی ابو ہیں اور میں ہر پہلو سے تنہا کھڑی ہوں۔ نہ ماما کی پُرسکون چھاؤں نہ شفقتوں کے سائے۔ کوئی مضبوط پناہ گاہ نہیں جس کے بل پر میں دُنیا کا سامنا کر سکوں۔ اس کے برعکس یہ خیال زیادہ زور آور ہے کہ میں قصوروار نہیں ہوں گی تب بھی قصوروار ٹھہرائی جاؤں گی۔" اس کی آنکھیں گہرائیوں سے سطح تک پانیوں سے لبریز ہو گئیں اور اس شفاف پانی میں گزرے دنوں کا عکس جھلملانے لگا تھا۔

"اتنی حساس مت ہو ثوبیہ......! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" اسے آزردہ دیکھ کر مریم بھی افسردہ ہو گئی۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"اور جہاں تک مضبوط پناہ گاہ کی بات ہے اس سے تو تم خود نظریں چرائے ہوئے ہو۔"

"کیا مطلب......؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"مطلب کو چھوڑو...... چلو اُٹھ کر منہ ہاتھ دھولو پھر میرے ساتھ چلو۔" مریم نے ایک دم اپنا موڈ بدل لیا۔ خوشگوار لہجے میں بولی۔

"کہاں......؟"

"مجھے کچھ چیزیں لینی ہیں۔ یہیں قریبی مارکیٹ تک چلیں گے۔"

"ارم کو لے جاؤ۔" اس نے پہلو بچانا چاہا۔

"نہیں بھئی......! تم چلو...... ذرا بہل جاؤ گی۔" مریم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں جب تک اپنا حلیہ ٹھیک کر آؤں۔ اتنے میں تم بھی تیار ہو جاؤ اور سنو......! ذرا جلدی کرنا۔" مریم کمرے سے نکل گئی تو وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں تھی بس منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں برش کیا اور دوپٹہ شانوں پر پھیلاتی ہوئی مریم کے پیچھے آئی۔ وہ گیلری میں کھڑی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ وہ وہیں رُک کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ مریم کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

"سنو......! تم اسے بتا کیوں نہیں دیتے......؟"

"وعدے کا خیال ہے۔ کسی کی زندگی کا خیال نہیں۔"

"حوصلہ ہار رہی ہے...... مجھے لگتا ہے مر جائے گی۔"

"چھپاؤ مت......! اتنا ہی خیال ہے تو سامنے آؤ۔"

"میرا خیال ہے مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا...... اچھا خدا حافظ......!" مریم ریسیور رکھ کر پلٹی تو اُسے سامنے دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھٹکی پھر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے بولی۔

"تیار......!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھہرو......! میں اپنا پرس لے آؤں۔" مریم فوراً کمرے میں چلی گئی۔ اسے آنے میں کچھ دیر لگی۔ اس دوران وہ برآمدے سے نکل کر آہستہ روی سے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ گیٹ کے قریب رُک کر پیچھے دیکھا مریم بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی پھر اس کے آنے پر اس کے ساتھ ہی باہر نکلی۔

مریم نے ٹھیک کہا تھا۔ بہت سارے لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے وہ کافی حد تک اپنے خول سے باہر نکل آئی۔ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں اس نے بھی خریدیں اور کوئی گھنٹہ بھر بعد جب دونوں واپس آئیں تو وہ اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے جو چہرے پر آزردگی کے بادل چھائے تھے وہ چھٹ چکے تھے۔ مریم اسی کے پاس بیٹھ کر اپنی لائی ہوئی چیزیں کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر ایک چھوٹے سے لفافے میں سے لپ اسٹک نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ رُک گئے۔

"ارے......! یہ تو غلام علی صاحب کی تصویر ہے۔" مریم لفافے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"کون غلام علی......؟" اس نے یونہی ہاتھ بڑھا کر اس سے لفافہ لے لیا اور تصویر پر نظر پڑتے ہی ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

"ابا میاں......!"

"یہ ہمارے ہاں اکاؤنٹنٹ تھے۔" وہ ابھی تصویر کے ساتھ لکھی چند لائنیں پڑھنا ہی چاہتی تھی کہ مریم بتانے لگی۔

"بیچارے بہت نیک انسان تھے لیکن ان کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی۔"

"کیا......؟ کیا ٹریجڈی ہوئی......؟" وہ دبی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی اور مریم ابھی کوئی جواب دینا ہی

چاہتی تھی کہ ارم اسے بلانے آ گئی۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ہاتھ میں پکڑے لفافے کی طرف دیکھا۔ پھر ابا میاں کی تصویر کے نیچے قدرے بڑے حروف میں لکھے ہوئے چند الفاظ "اکاؤنٹنٹ غلام علی غبن کیس میں گرفتار۔"

"میرے خدا...... ! یہ کب کی بات ہے......؟" اس نے تفصیل پڑھنے کے لئے لفافے کو موڑا لیکن اخبار کو وہیں تک کاٹ کر لفافہ بنایا گیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح لفافے کو موڑ موڑ کر دیکھتی رہی۔ پھر احتیاط سے لفافے کو جوڑ پر سے کھول کر دوسری طرف بھی سب دیکھ ڈالا لیکن اس خبر سے متعلق کہیں کوئی بات نظر نہیں آئی۔

"کب کا اخبار ہے......؟" اس نے یہ جاننے کی بھی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر اس کی نظریں دوبارہ اسی سرخی پر جم گئیں اور دل چیخ چیخ کر گواہی دینے لگا۔

(میرے ابا میاں ایسے نہیں ہو سکتے...... یہ ان پر بہتان ہے...... وہ تو بڑے متقی پرہیزگار تھے...... پھر کس نے ان پر ایسا گھناؤنا الزام لگایا......؟) اب ابا میاں نہیں تھے پھر بھی اسے یہ خبر بہت دُکھ دے رہی تھی اور اندر کا سارا دُکھ ایک دم آنکھوں میں سمٹ آیا جو اچانک جلنے لگی تھیں۔

(میری یادداشت میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے جو ابا میاں گرفتار ہوئے ہوں)۔ وہ جھٹلانا چاہتی تھی لیکن ہاتھ میں پکڑی حقیقت اسے جھٹلانے نہیں دے رہی تھی۔ پوری شام اس نے یونہی بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ اپنی حیات کا ہر پل سوچ ڈالا لیکن کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جسے وہ گرفت میں لے کر سوچتی کہ ابا میاں قصوروار ہو سکتے ہیں۔ وہ مسلسل ان لفظوں کو جھٹلاتی رہی۔ ارم کھانے کے لئے بلانے آئی تو اس نے بھوک نہ ہونے کا بہانا کر کے منع کر دیا۔ حقیقت میں اس کا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد مریم چائے لے کر آ گئی۔ اسے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"ثوبیہ...... ! تین گھنٹے پہلے میں تمہیں یہاں چھوڑ کر گئی تھی تم اس وقت سے یہیں بیٹھی ہو۔"

"نہیں تو......!" اس نے جھوٹ بولا۔

"میں لیٹ گئی تھی ابھی ابھی اُٹھ کر بیٹھی ہوں۔"

"کھانے پر کیوں نہیں آئیں......؟"

"بھوک نہیں تھی۔"

"اچھا لو...... ! چائے پیو......!" مریم نے بیٹھتے ہوئے مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی پھر تکیے کے نیچے سے وہ کاغذ نکال کر کہنے لگی۔

"تم کسی غلام علی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

"ہاں...... ! اب تو بیچارے اس دُنیا میں رہے ہی نہیں...... بہت اچھے انسان تھے۔"

"کیا ٹریجڈی ہوئی تھی ان کے ساتھ......؟" وہ اصل بات جاننا چاہتی تھی۔

"ایک لمبی کہانی ہے۔ خیر چھوڑو...... تم کیا کرو گی سن کر......؟" مریم موضوع بدلنا چاہتی تھی کہ اس نے ٹوک دیا۔

"نہیں...... ! مجھے بتاؤ......!"

"یار...... ! ایک تو تم پہلے ہی اتنی آزردہ رہتی ہو...... یہ واقعہ سن کر اور بھی افسردہ ہو جاؤ گی۔"

"پھر بھی میں ضرور سنوں گی۔" اس کے اصرار پر مریم نے ہتھیار ڈال دیے۔ پہلے اُٹھ کر خالی مگ ٹیبل پر رکھے پھر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اس کی کہانی کے تین کردار ہیں۔ ایک غلام علی صاحب، ایک ان کی بیٹی اور ولید بخت۔"

"ولید بخت......!" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

"ہاں ولید بخت اور ابتداء میں اسی سے کروں گی۔ وہ اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ تھا یعنی ایک طرح سے غلام علی صاحب کے انڈر میں کام کرتا تھا۔ خاصا زندہ دل اور ملنسار لڑکا تھا اور جانثار بھی۔ ہر ایک کے کام آنا جیسے اس نے اپنی عادت بنالی تھی۔ میں ان دنوں وہاں اسٹینو ٹائپسٹ تھی۔ میں نے کبھی دیکھا کہ وہ کسی کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا۔ یوں مدد کے لئے تیار ہو جاتا جیسے خاص اس کا فرض ہو اور اس کے لئے خواہ اس کا اپنا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ میرے ساتھ اس کی اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ کبھی جب فارغ ہوتا تو میرے پاس آ بیٹھتا تھا اور اپنی زندگی کے تلخ و شیریں واقعات دُہراتا۔ ایک بار اس نے بتایا کہ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے وہ بھی بس اسٹاپ پر...... میں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ لیکن وہ بہت سنجیدہ تھا اور ابھی وہ محبتوں کی راہگزر پر اس لڑکی کی ہمراہی کے خواب دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔" مریم شاید سسپنس پیدا کرنے کے لئے خاموش ہوئی تھی اور وہ فوراً بول پڑی۔

"کیا واقعہ......؟"

"واقعہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں پے ڈے تھا اور غلام علی صاحب بینک سے دس لاکھ کی رقم نکلوا کر آئے ہی تھے کہ ایم ڈی کے والد کے انتقال کی خبر آ گئی۔ ظاہر ہے وہ مالک تھے اس لئے اسی وقت فیکٹری بند کر دی گئی اور اگلے روز جب غلام علی صاحب آفس آئے تو ان کی سیف میں وہ دس لاکھ موجود نہیں تھے۔"

"کس نے لیے تھے......؟" وہ فوراً پوچھنے لگی۔

"یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو سارا الزام غلام علی صاحب پر آ گیا۔ کیونکہ وہی لے کر آئے تھے حالانکہ سب جانتے تھے کہ وہ کیسے انسان ہیں سب ان کی ایمانداری اور نیک نامی کی قسمیں کھانے کو تیار تھے لیکن حالات و واقعات کا کیا کرتے جو ان کے خلاف جا رہے تھے......؟ پھر ایم ڈی نے غلام علی صاحب کو صرف ایک ہفتے کی مہلت دی کہ اتنی مدت میں وہ دس لاکھ فراہم کریں ورنہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"پھر......؟" اس نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"ظاہر ہے...... وہ بیچارے کہاں سے اتنی رقم کا بندوبست کرتے......؟ اور پتا ہے ثوبیہ...... ! انہیں اپنی فکر نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے میری بے گناہی تو ایک نہ ایک دن ثابت ہو ہی جائے گی لیکن میری بیٹی کا کیا ہو گا......؟ وہ تو کبھی بھی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ اسے اگر معلوم ہوا کہ میں گرفتار ہو گیا ہوں تو وہ مر جائے گی۔ ایسے میں ولید نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ اس نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی بیٹی کو کبھی بھی یہ بات معلوم نہیں ہونے دے گا۔" مریم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

"جس روز پولیس غلام علی کو لے کر گئی اسی دن ولید ان کی اجازت سے ان کی بیٹی کو بظاہر اغواء کر کے اپنے

ساتھ لے گیا لیکن یہاں بیچارے ولید کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی کیونکہ وہ وہی لڑکی تھی جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ میں نے بتایا ناں کہ وہ دوسروں کی مدد کرنے میں اپنے نقصان کی پرواہ نہیں کرتا۔ عام حالات میں شاید وہ لڑکی بھی اس کی محبت قبول کر لیتی لیکن اس واقعے نے اسے ولید سے اتنا متنفر کر دیا ہے کہ وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ حالانکہ وہ اب بھی اسے اتنی ہی شدت سے چاہتا ہے۔''

کتنی بہت ساری باتیں ایک ساتھ اس کے ذہن پر دستک دینے لگی تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''غلام علی صاحب کا کیا ہوا......؟''

''وہ بے گناہ تھے اور ایک مہینے بعد ان کی بے گناہی ثابت ہو گئی۔''

''کیسے......؟''

''اصل میں ایم ڈی کا ان پر اندھا اعتماد اس کے بیٹوں کو بہت کھلتا تھا اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس دن سیف سے رقم نکال لی۔ بعد میں ان بھائیوں میں نا اتفاقی ہوئی تو ایک نے بتا دیا۔''

''اور ان کی بیٹی......؟''

''اسے جس طرح ولید لے کر گیا تھا اسی طرح واپس چھوڑ گیا۔ یوں کہ اسے اس تمام واقعے کی خبر ہی نہ ہوئی۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''لیکن ولید کی پوزیشن بڑی خراب ہو گئی ہے۔ وہ اس لڑکی کے بغیر زندگی کو بے معنی قرار دیتا ہے اور غلام علی صاحب سے کیا وعدہ بھی نہیں توڑ سکتا۔ کیا کرے عجیب مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔''

وہ چپ چاپ مریم کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم بتاؤ ثوبیہ......! اسے کیا کرنا چاہیے......؟''

وہ نفی میں یوں سر ہلانے لگی جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔

''میرا خیال ہے اسے بتا دینا چاہیے۔'' مریم اپنی رائے دینے لگی۔

''آخر غلام علی صاحب بھی تو اپنے آخری وقت میں اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے گئے تھے۔''

''ہاں شاید!'' اس کی آنکھوں میں وہ ایک پل آن ٹھہرا۔ جب اس کا ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔

''اور پتا ہے ثوبیہ......!'' مریم اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''عجیب دیوانی محبت ہے اس کی۔ اس لڑکی کے واضح انکار اور نفرت کے باوجود اس نے اپنے آپ کو اس کی پاسبانی کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ وہ ایک پل اس سے غافل نہیں ہوتا۔''

(اور ولید بخت آپ سے بڑی دیوانی محبت کرتا ہے)۔ ذہن کے دریچوں پر اس کی کہی بات دستک دینے لگی۔

''وہ جب اکیلی تھی۔'' مریم اپنی کہہ رہی تھی۔

''اس نے اپنی پھوپھی کو اس کے پاس بھیج دیا۔ جب اس نے سنا کہ وہ جاب کی تلاش میں ہے تب بھی جگہ جگہ اس کے لئے دوڑتا رہا اور آخر میں وہ میرے پاس آیا کہ وہ کسی گرلز ہاسٹل میں جانا چاہتی ہے۔ وہ اس

وقت اطمینان سے نہیں بیٹھا جب تک اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہو گیا۔'' مریم خاموش ہو کر بغور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید اس کی کیفیت کا اندازہ کرنا چاہتی تھی اور وہ ایک ہی نقطے پر نظریں مرکوز کئے شاید ان لمحوں کو آواز دے رہی تھی جن کے بارے میں اس نے کہا تھا۔ میں تمہاری زندگی میں آنے والے بدترین لمحوں کو نہیں روکوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ کبھی تم ان لمحوں کو آواز ضرور دو گی۔

''ثوبیہ......!'' مریم نے بہت آہستہ آواز میں اسے پکارا۔ ڈر تھا جو حصار اس نے اس کے گرد کھینچا ہے وہ ٹوٹ نہ جائے اور وہ اس حصار میں مکمل طور پر مقید ہو چکی تھی۔

مریم اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ تاریکیوں میں ڈوبا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ بہت ساری باتیں جو اس کے لئے معمہ بنی رہیں اب خود بخود واضح ہو رہی تھیں۔

(وہ ابا میاں کی پریشانی...... وہ نصف شب ان کا ورد کرنا...... ''نہ دنیا میں میری پردہ دری''...... اور ایک بار وہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے...... ''یہ سب آزمائشیں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں، اب نہیں تو کبھی نہ کبھی ضرور میری بے گناہی ثابت ہو جائے گی'')۔

(اور آخری دن گھر کی ساری چیزیں بکھری دیکھ کر اسے چور کا گمان ہوا تھا...... تو کیا اس دن پولیس نے اس کے گھر کی تلاشی لی تھی)۔ اس نے سوچا اور پلنگ کی پٹی پر سر رکھ لیا۔

(میرے خدا......!)۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

(ابا میاں نے میرا خیال کرتے ہوئے بھی میرا خیال نہ کیا۔ وہ کسی اور بہانے بھی تو مجھے کہیں بھیج سکتے تھے انہوں نے یہ طریقہ کیوں اختیار کیا......؟ اور پھر انہوں نے مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کیا......؟ کیا انہیں یہ خدشہ تھا کہ میں بھی انہیں مجرم نہ سمجھنے لگوں......؟ نہیں ابا میاں......!)۔ آنکھوں میں رکا پانی کناروں سے بہتا چلا گیا۔

(ساری دنیا بھی آپ کے خلاف گواہی دیتی تب بھی میں یقین نہ کرتی۔ لیکن آپ نے میرا یقین نہیں کیا۔ میں اپنی ہی نظروں میں مجرم بنی اب تک زمانے سے چھپ رہی ہوں)۔ وہ سوچنے پر آئی تو سوچتی چلی گئی۔

(اور ولید بخت......!)۔ بھی ہونٹ اس نام کو چھوتے تو شدید نفرت کا احساس ہوتا تھا اور اب اگر کچھ نہیں تھا تو آنسو اور شدت سے بہنے لگے تھے۔

(مجھے یقین ہے وہ تمہارے ساتھ کوئی نیکی ہی کر رہا ہو گا)۔ بی بی نے یقین سے کہا تھا۔

اور پھر وقتاً فوقتاً کہی گئیں اس کی باتیں جو ہر دوسرے موڑ پر وہ اس کے سامنے آ کر کہتا رہا تھا۔

(''تم میری زندگی کی اولین تمنا ہو'' اور ''تم نہ سمجھو لیکن میں تمہارے آس پاس رہتا ہوں'')۔

(میرے خدا......!)۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

(میں اتنی نادان اتنی انجان کیوں تھی......؟ وہ ایک شخص جس کے ہونٹوں پر وعدے کا قفل ہے اب بھی میری پاسبانی کر رہا ہے اور میں اس کا شکر گزار ہونے کی بجائے اس سے متنفر ہوں)۔

صبح جب مریم آفس کے لئے نکل رہی تھی وہ کمرے سے نکل کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''سنو......! رات تم نے کہانی کے تین کردار بتائے تھے چوتھے کا ذکر نہیں کیا۔''

''چوتھا کردار......؟'' مریم جان بوجھ کر انجان بنی۔

"ہاں......! وہ لڑکی مریم جو مجھے پہلے دن آفس میں ملی پھر ولید کے کہنے پر اپنے گھر لے آئی۔"

مریم بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"لگتا ہے رات ٹوٹ کر روئی ہے۔"

"ہاں......!" اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

"اب کیا ارادہ ہے......؟" مریم نے شرارت سے پوچھا۔

"اس کے پاس جاؤں گی جس کے ہاتھ میں ابا میاں نے میرا ہاتھ تھمایا تھا اور کہا تھا خدا کے سوا تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بجز ولید بخت۔"

"اچھا تو کیا اب میں تمہاری کچھ نہیں لگتی......؟" مریم نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کیا۔

"تم بہت کچھ ہو اور وہ سب کچھ......"

"میرے ساتھ چلو......! میں تمہیں اس کے پاس چھوڑتی ہوئی جاؤں گی۔" مریم اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولی۔

"بیچارا......! پتا نہیں رات بھر سو بھی سکا ہوگا کہ نہیں۔"

"کیا مطلب......؟" وہ قدم روک کر پوچھنے لگی۔

"رات فون پر میں نے اسے ساری بات بتا دی تھی اور کہا تھا فیصلے کی گھڑی صبح آئے گی۔" وہ سر جھٹک کر پھر اس کے ساتھ چل پڑی۔

مریم نے اس کے گھر کے سامنے ہی اسے اُتار دیا اور خود چلی گئی۔ کتنی دیر تک تو وہ کھڑی سوچتی رہی کہ اس سے کیا کہے گی۔ پھر ایک دم بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ اسی نے کھولا۔ شاید نہا کر آ رہا تھا تولیے سے بالوں کو رگڑتا ہوا۔ اس پر نظر پڑی تو اس کا ہاتھ تولیے سمیت سر پر ہی رُکا رہا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم......؟" کتنی دیر بعد وہ بس اسی قدر کہہ سکا تھا۔

"ہاں ولید بخت......! میں ان لمحوں کو کھوجتی ہوئی یہاں تک آئی ہوں جن کے بارے میں تم نے یقین سے کہا تھا کہ کبھی میں انہیں آواز ضرور دوں گی۔"

"تو یہ......!"

"اندر آنے کو نہیں کہو گے......؟"

"کبھی تم اسی دروازے سے لوٹ گئی تھیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گیا۔

"اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ جس مضبوط پناہ گاہ کی میں آرزو کرتی ہوں وہ یہی تو ہے۔"

"اب جان لیا ہے تو ایمان کی حد تک یقین رکھنا۔ آؤ......! اس گھر اور اس دل کے دروازے صرف تمہارے لئے کھلے ہیں۔"

اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اپنی بھیگی بھیگی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں محبتوں کے چمکتے جگنو نئے موسموں کی نوید دے رہے تھے۔

⊖ ⊖ ⊖

تو نے پار اُتارا ہے

"اماں......! اماں......! ایک جگہ سے انٹرویو کال آ گئی۔" وہ آنگن ہی سے چلاتی ہوئی اندر آئی تو اس کے ہاتھ میں لفافہ دیکھ کر اماں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"عبید کا خط ہے کیا......؟"

اس کی خوشی پل میں غائب ہو گئی اور فوراً جواب بھی نہیں دے سکی۔ سر جھکا کر لفافہ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی اور بھابی نے کچن ہی سے اس کے ہاتھ میں لفافہ دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی کام چھوڑ کر اس کے پیچھے چلی آئیں اور اب دروازے میں کھڑی اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھیں۔

"بتاؤ ناں......! کس کا خط ہے......؟" اماں نے حد درجہ بے صبری کا مظاہرہ کیا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

"بھیا کا نہیں ہے۔" بھابی اس کا جواب سنتے ہی واپس پلٹ گئیں اور اماں نے بے دلی سے پوچھا۔

"پھر کس کا ہے......؟"

"کسی کا نہیں ہے۔ ایک جگہ نوکری کی درخواست دی تھی انہوں نے انٹرویو کے لئے بلایا ہے۔" اماں ہی کی طرح اس نے بھی بے دلی سے جواب دیا اور لفافہ کھولنے لگی۔ کتنی جگہ اپلائی کر رکھا تھا اس نے اور کتنا انتظار تھا کہ کہیں سے تو کال آئے اور اب اس لفافے نے کتنی ہلچل مچا دی تھی۔ اماں اور بھابی جتنی مشتاق تھیں، اتنی ہی مایوس نظر آ رہی تھیں اور اگر پہلے مرحلے پر اسے پتا نہ چل جاتا تو اس کی اپنی بھی یہی کیفیت ہوتی۔ بہرحال انٹرویو کی تاریخ دیکھ کر اس نے کاغذ دوبارہ لفافے میں ڈالا پھر اماں سے پوچھنے لگی۔

"اماں......! بھیا کو گئے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں......؟"

"دن......؟" اماں نے تعجب سے اسے دیکھ کر کہا۔

"پورے چھ مہینے ہو گئے ہیں۔"

"چھ مہینے......؟" وہ سوچ میں پڑ گئی اور اماں اپنے آپ بولنے لگیں۔

"اتنا غیر ذمہ دار تھا تو نہیں...... دیکھو باہر جا کر سب بھلا بیٹھا ہے۔ ایک خط خیریت کا نہیں لکھا۔ اگلے مہینے خیر سے جمیلہ کی گود بھرنے والی ہے اس کا بھی کوئی خیال نہیں۔"

"ہاں......! بھابی بیچاری بہت پریشان ہیں۔"

"پریشانی کی بات نہیں ہے کیا......؟ یہاں تو ہر دم اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا اور اب......" بھابی کو آتے دیکھ کر اماں خاموش ہو گئیں اور وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔

"آئیں بھابی......! آپ کن کاموں میں اُلجھی ہوئی ہیں......؟"

"بس......! وہ چار برتن رکھے تھے وہی دھو رہی تھی۔ تم بتاؤ......! کس کا خط ہے......؟" بھابی پہلے سن چکی تھیں کہ عبید کا خط نہیں ہے اس لئے سرسری انداز میں پوچھا اور اس بار اس نے خوشی سے جواب دیا۔

"انٹرویو لیٹر ہے......کل جانا ہے۔"

"تم جاب کرو گی......؟" بھابی نے یونہی عام سے لہجے میں پوچھ لیا اور وہ ذرا سا ہنس کر بولی۔

"کیوں......؟ کیا میں جاب نہیں کر سکتی......؟" حالانکہ یہ واقعی اس کے لئے بہت مشکل تھا کیونکہ وہ خاصی ڈرپوک اور بزدل قسم کی لڑکی تھی اور بھابی نے بھی شاید اس لئے پوچھا تھا۔ جواباً وہ ہنسی اور بھابی تو خاموش ہو رہیں لیکن اماں بول پڑیں۔

"کیوں نہیں کر سکتی......؟ ماشاء اللہ پڑھی لکھی سمجھدار ہو۔ اگر وقت پر تعلیم کام نہ آئے تو پھر کیا فائدہ ایسی تعلیم کا یوں بھی گھر میں بے کار بیٹھی رہتی ہو۔" وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

پھر سارا دن وقفے وقفے سے اماں اس سے ایسی باتیں کر کے اسے حوصلہ دیتی رہیں کیونکہ وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ اسکول و کالج میں بھی بڑی مشکل سے جاتی تھی۔ اگر اماں سختی نہ کرتیں تو شاید ابتدائی کلاسوں کے بعد ہی وہ گھر بیٹھ جاتی اور اس وقت اماں نے یہ تو نہیں سوچا تھا کہ اسے نوکری کرنی ہے۔ بس ان کی خواہش تھی کہ ان کے بچے خوب پڑھ لکھ جائیں۔

بڑے عبید بھیا تھے۔ بی کام کے بعد ان کا اپنا ارادہ بھی مزید پڑھنے کا تھا لیکن ابا کے انتقال کے باعث انہیں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور انہوں نے جاب کر لی۔ اس وقت وہ انٹر میں تھی اور اسے پڑھنے کا شوق تو تھا لیکن وہ باہر نکلنے سے بہت گھبراتی تھی۔ اس کی بھی وجہ تھی۔ بہت چھوٹی سی تھی غالباً پانچ چھ سال کی۔ ایک روز باہر کھیلتے ہوئے گھر سے کچھ دور نکل گئی۔ کھیل کے دوران تو احساس نہیں ہوا لیکن جب سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تب اسے اپنا گھر کہیں نظر نہیں آیا۔ ایک سی جیسی گلیاں تھیں۔ وہ ادھر سے اُدھر بھٹکتی پھری جب تھک گئی تو رونے لگی۔ ایک آدمی نے قریب آ کر رونے کا سبب پوچھا پھر بہلایا کہ وہ اسے اس کے گھر پہنچا دے گا اور پھر بجائے اسے گھر پہنچانے کے گود میں اٹھا کر کسی اور ہی راستے پر چل نکلا۔ یقیناً بردہ فروش تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ محلے کے کسی آدمی نے دیکھ لیا اور کیونکہ بردہ فروش بھی شکل ہی سے کچھ مشکوک لگ رہا تھا اس لئے محلے کا آدمی نظر انداز نہیں کر سکا۔ اسے روک کر پوچھا کہ بچی کو کہاں لے جا رہے ہو اور وہ اس قدر گھبرایا کہ اسے پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

پھر وہ گھر تو پہنچ گئی تھی لیکن جس طرح وہ ماجرا سن کر اماں نے اسے ڈرایا دھمکایا تو اس وقت سے اس کے اندر ایک خوف بیٹھ گیا تھا۔ جسے بعد میں خود اماں بھی نہیں نکال سکیں۔ ابھی تک راستہ چلتے ہوئے اسے یوں لگتا جیسے ہر شخص اس کے تعاقب میں آ رہا ہو۔ اسکول میں میٹرک تک ابا خود اسے چھوڑ کر آتے تھے اور واپسی میں بھیا لے کر آتے۔ اس کے بعد ابا نے ایک نئے علاقے میں اپنا گھر خرید لیا۔ یوں وہ پرانا محلہ چھوٹ گیا اور نئی جگہ سے

ایک دو لڑکیاں کالج جانے والی مل گئیں تو وہ ان کے ساتھ آنے جانے لگی۔ کسی دن وہ لڑکیاں زہرا اور شبینہ چھٹی کر لیتیں تو اس کی بھی چھٹی ہو جاتی تھی۔ اماں لاکھ ڈانٹتیں کہ آخر کب تک دوسرے کے سہارے چلو گی......؟ لیکن اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ بس میں اکیلی نہیں جا سکتی۔

پھر ابا کے انتقال کے بعد جہاں بھیا کی پڑھائی چھوٹ گئی وہاں اس نے بھی سوچا تھا کہ گھر بیٹھ جائے، لیکن اللہ کی مہربانی سے بھیا کو جلد ہی نوکری مل گئی اور اماں نے اسے گھر نہیں بیٹھنے دیا۔ بی اے کروا کے دم لیا اور ابھی وہ بی اے سے فارغ ہوئی تھی کہ اماں کو بھیا کی شادی کرنی پڑی۔ حالانکہ ان کا خیال پہلے اس کی شادی کرنے کا تھا لیکن نبیلہ جو اماں کی بھانجی تھی، پانچ سال کی عمر میں اس کی اماں کا انتقال ہو گیا تھا اور کچھ ہی عرصے بعد اس کے ابا نے دوسری شادی بھی کر لی۔ دوسری ماں روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی۔ اس وقت اماں نے چاہا تھا کہ نبیلہ کو اپنے پاس لے آئیں لیکن اس کے ابا نے منع کر دیا تھا اور ظاہر ہے اماں زبردستی تو کر نہیں سکتی تھیں لیکن اسی وقت انہوں نے سوچ لیا تھا کہ نبیلہ کو بہو بنا کر لے آئیں گی اور گو کہ ابھی اس کا وقت تو نہیں آیا تھا کیونکہ وہ پہلے اپنی بیٹی سے فارغ ہونا چاہتی تھیں لیکن ایک روز نبیلہ خود ہی چلی آئی اور اس نے رو رو کر اماں کو بتایا کہ اس کی ماں ایک بڈھے سے اس کی شادی کر رہی ہے۔ تب اماں کو اور تو کچھ نہیں سوجھا اسی وقت محلے کے چند لوگوں کو بلا کر عبید اور نبیلہ کا نکاح کر دیا۔

بعد میں نبیلہ کے اماں ابا لینے آئے لیکن اس وقت ان کا بس نہیں چلا۔ کیونکہ لڑکی اپنی مرضی سے شوہر کو پیاری ہو چکی تھی اور یہ کوئی سال بھر پہلے کی بات تھی۔ اس وقت عبید بھیا باہر جانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور وہ ہرگز شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ابھی بیوی بچے افورڈ نہیں کر سکتے پہلے باہر جائیں گے۔ دو تین سال کے بعد یہاں آ کر اپنا کاروبار کریں گے اس کے بعد پہلے بہن کو رخصت کریں گے پھر اپنی شادی کا سوچیں گے۔ لیکن وہی بات کہ تقدیر کے سامنے انسان بے بس ہے خواہ کچھ بھی سوچ لے ہوتا وہی ہے جو اوپر والے نے لکھ دیا۔

پہلے ابا کے انتقال کے باعث تعلیم چھوٹی اور اب اماں نے شادی کی زنجیر پہنا دی۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ہر بار انسان مجبور ہو کر بیٹھ نہیں جاتا۔ عبید بھیا جو شادی کے حق میں نہیں تھے نبیلہ کو پا کر گویا انہیں اپنی منزل مل گئی۔ ابتدائی دو مہینے تو وہ بے خوش اور مگن سے تھے پھر جب نبیلہ امید سے ہوئی تو آنے والی نئی ذمہ داری کو سوچتے ہوئے انہیں وسائل کم لگنے لگے اور وہ ایک بار پھر باہر جانے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ گو کہ اب اماں نہیں چاہتی تھیں کہ وہ باہر جائیں اور نبیلہ کا تو رو رو کر برا حال تھا لیکن ان پر دھن سوار ہو چکی تھی۔ اماں کے سامنے اپنی ذمہ داریاں گنواتے اور نبیلہ کو بہلاتے۔ تمہاری گزشتہ زندگی میرے سامنے ہے۔ کبھی کوئی سکھ نہیں دیکھا تم نے۔ اب میں تمہیں اچھی اور آسودہ زندگی دینا چاہتا ہوں۔ دو تین سال کی بات ہے گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا اور نبیلہ جسے ایک عمر کے بعد محبت ملی تھی، وہ ہرگز بھی اس میں دو تین سالوں کا وقفہ نہیں چاہتی تھی اور عبید پر اس کی گریہ وزاری کا اثر ہوا بھی تب بھی انہوں نے اپنا جانے کا ارادہ ملتوی نہیں کیا۔ باہر بھیجنے والی مختلف کمپنیوں کے چکر لگاتے رہے لیکن وہ سب جتنا پیسہ مانگتی تھیں وہ ان کے پاس نہیں تھا۔ پھر ایک ایجنٹ سے ان کی ملاقات ہوئی جس نے کمپنیوں کی نسبت کم پیسہ مانگا لیکن آگے ملازمت کی ذمہ داری نہیں لی اور انہوں نے سوچا بس ایک بار

باہر نکل جائیں آگے ملازمت وہ خود تلاش کرلیں گے۔ یوں سب کو اچھے دنوں کی آس دلا کروہ رخصت ہو گئے۔

اور جب تک انہیں روکنا اختیار میں تھا اماں اور نبیلہ نے ہر حربہ استعمال کیا لیکن جب وہ چلے گئے تو پھر ظاہر ہے وہی آس کی ڈوری ہی رہ جاتی تھی جو وہ تھما گئے تھے اور آنکھیں بھی وہی خواب دیکھنے لگیں جن کی جھلک وہ دکھا گئے تھے۔

انہوں نے بتایا تھا کہ یہاں سے سنگاپور اور وہاں سے جانے کس راستے سے وہ ملائیشیا جائیں گے اور اسی حساب سے دسویں دن سے اماں نے خط کا انتظار شروع کر دیا اور نبیلہ تو جہاں دروازے پر آہٹ ہوتی بھاگی جاتی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ چھ مہینے ہو گئے تھے اور ابھی تک خیریت سے پہنچنے کا خط بھی نہیں آیا تھا۔ تشویش کی بات تو تھی۔ سو اندیشے اُٹھتے، ڈراتے لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا......؟ ان کی فکر...... پھر یہاں گھر میں ایک وہی کمانے والے تھے۔

لاکھ فکریں ہوں پیٹ تو روٹی مانگتا ہے۔ یوں ان کے جانے کے دو مہینے بعد ہی اماں کو زیادہ گھر کی فکر ستانے لگی۔ اگر وہ خود سلائی کڑھائی میں ماہر ہوتیں تو بہت خاموشی سے مشین سنبھال لیتیں۔ انہیں سلائی آتی تو تھی لیکن وہی گزارے والی بات تھی کہ اپنے کپڑے خود ہی سی لیے۔ بہر حال بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ آخر ربیعہ کی تعلیم کس دن کام آئے گی لیکن اس کے ساتھ وہی مسئلہ تھا کہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتی تھی۔ پہلے وہ یہی کہتی رہی کہ نوکری کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ لیکن پھر گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے اسے خود میں تھوڑی ہمت پیدا کرنی پڑی۔ ظاہر ہے اور کون تھا۔ گزشتہ دو مہینوں سے وہ کئی جگہوں پر درخواستیں بھیج چکی تھی اور آج پہلی بار انٹرویو کال آئی تھی تو جہاں وہ خوش تھی وہاں اس کا ڈر بھی ساتھ ساتھ تھا۔ اماں کے سامنے تو کچھ نہیں کہا البتہ رات میں جب کپڑے استری کرنے کھڑی ہوئی تو دبے لفظوں میں نبیلہ سے کہنے لگی۔

"بھابی...... ! میں جاؤں گی کیسے......؟" نبیلہ اپنا بستر صاف کرنے میں لگی تھی، سمجھی نہیں وہ کس حساب سے کہہ رہی ہے جب ہی بڑے آرام سے بولی۔

"بس سے......!"

"افوہ...... ! بس سے تو جاؤں گی لیکن اکیلی کیسے......؟"

"ہائیں......؟" نبیلہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر سیدھی کھڑی ہوئی پھر اسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"ہنسنے کی نہیں ہو رہی۔" وہ منہ موڑ کر جلدی جلدی استری کرنے لگی۔

"تم نے بات ہی ایسی کی کہ ہنسی آ گئی ورنہ کس کم بخت کا ہنسنے کو دل چاہتا ہے۔" نبیلہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بولی اور قدرے توقف کے بعد پھر کہنے لگی۔

"واقعی...... ! یہ تم پر ظلم ہے اور عبید کو معلوم بھی تھا کہ اس گھر میں لائن سے تینوں عورتیں کچھ نہیں کر سکتیں پھر بھی اس طرح چھوڑ کر چلے گئے۔"

"میرا خیال ہے بھیا گئے ہی اسی لئے ہیں کہ ہم کچھ کرنا سیکھ جائیں۔" نبیلہ کے لہجے کا تاسف محسوس کر کے اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"نہیں ربیعہ...... ! یہ تو خود کو بہلانے والی بات ہے۔"

"اچھا چھوڑیں یہ بتائیں...... آپ کے خیال میں مجھے نوکری مل جائے گی......؟" اس نے خوبصورتی سے موضوع بدلا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں......؟ ویسے تمہارا اپنا کیا خیال ہے......؟"

"کیوں......؟"

"اس لئے کہ وہاں اور بھی لڑکیاں ہوں گی اور ظاہر ہے میں جب ڈھنگ سے بات ہی نہیں کر سکوں گی تو......" اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"بے وقوف ہو تم...... ! خواہ مخواہ ڈرتی ہو۔ بس ذرا سا اپنے اندر اعتماد پیدا کرلو پھر تمہاری طرح کوئی بول نہیں سکتا۔" نبیلہ نے اس کی ہمت بندھائی۔

"سچ کہہ رہی ہیں......؟"

"بالکل سچ......!"

"بس تو کل میری نوکری پکی۔" وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ پر آ لیٹی۔

ooo

وہ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ گئی تھی لیکن جو اس کی حالت تھی یہ وہی جانتی تھی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور چہرے سے گرم بھاپ نکل رہی تھی۔ بار بار ٹھنڈے ہاتھوں سے چہرہ تھپتھپاتی اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد بھی کر رہی تھی۔ حقیقتاً بڑا مشکل وقت تھا خصوصاً اس کے لئے۔ کتنی بار دل چاہا یہیں سے واپس پلٹ جائے لیکن حالات اب ایسے ہو گئے تھے کہ اگر ایک مہینہ اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ بنا تو یقیناً فاقوں کی نوبت آ جائے گی۔ پھر اگلے مہینے نبیلہ کے ہاں ولادت بھی ہونے والی تھی۔

(پتا نہیں کیا ہوگا......؟)۔ وہ یہی سوچ کر لرز رہی تھی کہ اس کا نام پکارا گیا۔ چونک کر کھڑی ہوئی اور اندر جاتے ہوئے سچ مچ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

"تشریف رکھیے......!"

بیٹھنے کو کہا گیا تو وہ محض خود کو گرنے سے بچانے کی خاطر فوراً بیٹھ گئی۔ اس کے بعد پتا نہیں کیا کیا سوال ہوئے وہ غائب دماغی سے جواب دیتی رہی۔ پھر اس نے محسوس کیا اچانک خاموشی چھا گئی ہے۔ کچھ ڈرتے ڈرتے پلکیں اُٹھائیں تو سامنے بیٹھا شخص پُرسوچ انداز میں اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ مزید نروس ہو گئی اور راہ فرار بھی ڈھونڈنے لگی لیکن خود سے اُٹھ کر جانے کی ہمت نہیں تھی۔

"ہوں......!" کتنی دیر بعد "ہوں" کی صورت گہری سانس کھینچی پھر اسے مخاطب کیا گیا۔

"مس ربیعہ......!" وہ خود پر قابو پانے میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے "جی" کی آواز نکال سکی۔

"آپ پلیز...... ! وہاں تشریف رکھیں، میں ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔" اس نے اشارے کی سمت بائیں طرف دیکھا پھر اُٹھ کر وہیں آ بیٹھی۔ عجیب سی اُلجھن، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہاں کیوں بٹھایا گیا ہے......؟ اور مزید کیا بات کرنی ہے......؟ جبکہ دوسری لڑکیاں تو سوال جواب کے بعد باہر جا رہی تھیں۔ وہ بے دھیانی میں

اس شخص کو دیکھنے لگی۔ اچھا خاصا ادھیڑ عمر، کنپٹیوں پر بال سفید البتہ چہرے پر تفکرات کی لکیریں نہیں تھیں۔ پھر جس شائستگی سے وہ لڑکیوں سے بات کر رہا تھا، اس سے دھیرے دھیرے اس کے اندر کا خوف کم ہونے لگا۔ جب تمام لڑکیوں کے انٹرویو ہو چکے تب پھر اس کی باری آئی۔

"آ یئے بی بی......! یہاں آ جائیں۔" اور اس بار وہ قدرے سہولت سے اٹھ کر ان کے سامنے آ بیٹھی تو انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"یہ بتایئے یہاں آتے ہوئے آپ اتنا ڈر کیوں رہی تھیں......؟"

"اب تو نہیں ڈر رہی۔" وہ جتنی بے ساختگی سے بولی اتنا ہی بے ساختہ ان کا قہقہہ تھا۔

"ویری گڈ......!" کچھ دیر تک اسی انداز میں اثبات میں سر ہلاتے رہے پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے۔

"ایسا ہے بی بی......! کہ جس جاب کے لئے آپ نے اپلائی کیا ہے اس کے لئے آپ بالکل سوٹ نہیں کرتیں۔ مجھے بہت ایکسپرٹ لڑکی چاہئے۔"

"جی......؟" اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا تو قدرے توقف سے کہنے لگے۔

"آپ کو میں ایک اور جاب آفر کر سکتا ہوں لیکن شاید اس کے لئے آپ راضی نہ ہوں......؟" اس نے فوراً سر اٹھا کر یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ آپ بتائیں تو سہی۔ اور اس کے اس انداز سے وہ سمجھ گئے کہ وہ واقعی ضرورت مند ہے۔ اچھی تنخواہ کے عوض ان کی آفر قبول کر لے گی اور کیونکہ پہلے سے ان کے ذہن میں باقاعدہ کوئی پلان نہیں تھا۔ بس ابھی اسے دیکھ کر ہی ایک خیال آیا تھا۔ جب ہی انہوں نے فوراً کچھ کہنے سے گریز کیا اور انٹرکام پر چائے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئے تو اس نے بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور خود ہی سوچنے لگی۔

(پتہ نہیں کیا کام ہے......؟ جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ میں راضی نہیں ہوں گی)۔

کچھ دیر بعد دروازے پر آہٹ سن کر وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ ان کے پیچھے چپڑاسی چائے لیے آ رہا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تو وہ چائے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"پلیز......!" اس نے خاموشی سے کپ اپنی طرف کھسکا لیا اور ایک دو سپ لینے کے بعد انہیں دیکھا تو وہ پھر اسی پُرسوچ انداز میں اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اس کے دیکھنے پر کہنے لگے۔

"ہاں بی بی......! پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ اس وقت میں جو کہنے جا رہا ہوں وہ بات صرف آپ کے اور میرے درمیان رہے گی خواہ آپ ایگری کریں یا نہ کریں......او۔کے......؟" اس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا تھا کہ پتا نہیں ایسی کیا بات ہے......؟ اور قدرے توقف سے وہ کہنے لگے۔

"میرا ایک بیٹا ہے۔ سال بھر پہلے تک وہ بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ ویل ایجوکیٹڈ اینڈ ویل ایٹی کیٹڈ۔ اپنے حلقے میں بے حد مقبول میرا خیال ہے۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ ایک بڑے خاندان کا لڑکا جو خوبصورت بھی ہو، تعلیم یافتہ بھی ہو اور دولت مند بھی کس طرح لوگ اسے سراہتے ہوں گے۔ لہٰذا مختصراً میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سال بھر پہلے وہ اپنے کسی دوست کی لیبارٹری میں اس کے ساتھ کھڑا تھا کہ وہاں اس کے ساتھ ایک حادثہ

ہو گیا۔ کسی کیمیکل کی تیاری کے دوران بوتل پھٹ گئی اور میرا بیٹا جو قریب ہی کھڑا تھا، سارا کیمیکل اڑ کر اس کے چہرے کو بری طرح جھلسا گیا۔ پھر گو کہ علاج سے وہ ٹھیک تو ہو گیا لیکن اس کے چہرے کی ہیئت ہی بدل گئی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے کہ عام آدمی اسے دیکھ کر اگر ڈرتا نہیں تو منہ ضرور پھیر لیتا ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے یوں جیسے بیٹے کا دُکھ رگ رگ میں سرایت کر رہا ہو۔ وہ اسی خاموشی سے ان پر نظریں جمائے بیٹھی رہی جبکہ اندر دل کی رفتار اور مدھم ہوئی جا رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے بچپن میں کہانی کے دوران اچانک خوفناک جن کی آمد پر اس کی کیفیت ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہوئے۔

"وہ جو بہت مقبول تھا لوگ اس سے محبت بلکہ جان دینے کے دعوے کرتے تھے، وہ سب اس سے دور ہو گئے اور دوستوں کی بے اعتنائیوں نے اسے بری طرح توڑ کر رکھ دیا ہے اور بات صرف دوستوں کی نہیں عام آدمی بھی اسے دیکھ کر منہ موڑ لیتا ہے۔ اپنے لئے لوگوں کا یہ رویہ دیکھ کر وہ اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا۔ ابھی بھی وہ کہیں آتا جاتا نہیں ہے۔ نہ ہی گھر میں کسی کی آمد پسند کرتا ہے عجیب بدمزاج سا ہو گیا ہے۔ اکھڑا اکھڑا اپنے آپ سے اور ساری دُنیا سے خفا سا لگتا ہے۔ حالانکہ سرجری سے اس کا چہرہ ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوتا۔"

وہ یوں بول رہے تھے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب اسے کیوں بتا رہے ہیں......؟ ابھی وہ خود سے قیاس کرنے لگی تھی کہ وہ کہنے لگے۔

"اس کی تنہائی کے خیال سے میں نے سنی کو اپنی پاس رکھ لیا ہے۔ سنی میرا نواسہ ہے، چھ سال کا چھوٹا بچہ اور میرا بیٹا اس کے ساتھ قدرے خوش رہتا ہے۔"

"ایکس کیوز می سر......!" وہ بے حد الجھن محسوس کر رہی تھی۔ بالآخر بول پڑی۔

"میری جاب کیا ہے......؟"

"آپ کو میرے گھر جانا ہے اور آغا کو دیکھ کر نہ تو ڈرنا ہے اور نہ منہ موڑنا ہے بلکہ اپنے رویے سے آپ کو اسے یقین دلانا ہے کہ وہ قابل نفرت نہیں ہے۔"

"جی......؟" وہ کچھ بھی سمجھ نہیں سکی، اور وہ اس خیال سے کہ کہیں وہ صاف انکار نہ کر دے، کہنے لگے۔

"یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے......؟ پھر آپ کو جاب کرنی ہے اور یہی آپ کی جاب ہے۔"

"جاب......؟" وہ پریشان ہو گئی۔ بھلا یہ کیا جاب ہوئی......؟ اور وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے شاید اپنی بات ٹھیک سے سمجھا نہیں سکے تھے اسی خیال کے تحت کہنے لگے۔

"دیکھیں بی بی......! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کو کہیں اور جاب نہیں ملے گی لیکن بہت مشکل سے ملے گی۔ اس لئے کہ ایک تو آپ سمپل گریجویٹ ہیں، دوسرے آپ کے پاس تجربہ نہیں...... پھر نہ کوئی کورس کیا ہے آپ نے...... تو اس حساب سے کوئی پرائیویٹ اسکول ہی آپ کو ٹیچر رکھ سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں پرائیویٹ اسکول کی جاب سے جاب لیس ہونا بہتر ہے جس سے ایک اکیلے انسان کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ خیر یہ الگ بات ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس جاب سے آپ نہ صرف کچھ سیکھ لیں گی بلکہ تجربے کا سرٹیفکیٹ

بھی آپ کے پاس آ جائے گا۔"

"ایکس کیوزمی سر......! میں آپ کی بات بالکل نہیں سمجھ رہی۔ بھلا آپ کے گھر آنے جانے میں میں کیا سیکھوں گی......؟" اس نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا تو انہیں قدرے اطمینان ہوا کہ اس نے صاف انکار نہیں کیا۔ گہری سانس کھینچ کر بولے۔

"بی بی......! آفس ٹائم صبح نو سے شام پانچ بجے تک ہے اور یہ سارا وقت آپ کو میرے گھر نہیں رہنا۔ آپ صبح آفس آئیں گی۔ یہاں میں کسی بھی شعبے میں بطور ہیلپر آپ کو لگا دوں گا خواہ پبلک ڈیلنگ خواہ کمپیوٹر آپریٹر جو بھی شعبہ آپ کو مناسب لگے۔ آپ بڑے آرام سے سیکھ سکتی ہیں۔ پھر اول تو نہیں آپ کی جاب پکی ہو جائے گی کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں یا پھر آپ کی مرضی...... بہر حال اس تمام وقت میں سے آپ کو ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے گھر جانا ہوگا۔"

اب وہ ان کی پوری بات سمجھ گئی اور پُرسوچ انداز میں ذرا سا سر ہلایا لیکن ہامی نہیں بھری بلکہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے......؟ اور اسے شش و پنج میں دیکھ کر وہ کہنے لگے۔

"میں آپ کو مجبور نہیں کر رہا۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ اگر دل مانے تو کل آ جایئے گا میں آپ کو باقی تفصیل سمجھا دوں گا۔"

"جی......!" اس نے اچانک خود کو آزاد محسوس کیا اور فوراً جانے کی اجازت چاہی۔ پھر باہر آ کر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا بلکہ یوں تیز تیز قدم اُٹھانے لگی جیسے جلد سے جلد یہاں سے دور چلی جانا چاہتی ہو۔ عجیب سی دہشت سوار ہوگئی تھی اس پر اور خوف لگ رہا تھا کہ کہیں وہ اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہے۔

○ ○ ○

گھر میں داخل ہوئی تو پھر جان میں جان آئی اور فوراً سوچ لیا کہ دوبارہ وہاں نہیں جائے گی۔

"کیا ہوا......؟" اماں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ کندھے سے بیگ اُتار کر ایک طرف اُچھالتے ہوئے بولی۔

"سانس تو لینے دیں۔" پھر گرنے کے انداز میں پلنگ پر تقریباً آدھی لیٹ گئی اور لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بولی۔

"نوکری اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔ پتا نہیں قسمت میں کتنی خواری لکھی ہے۔"

"لو...... ابھی تو آج پہلی بار گئی ہو اور ابھی سے قسمت کو کوس رہی ہو۔" اماں نے ناگواری سے ٹوکا پھر کہنے لگیں۔

"مجھے پتا ہے نوکری آسانی سے نہیں ملتی لیکن انسان کوشش تو کرتا ہے۔ گھر بیٹھے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"لو پانی پیو......!" نبیلہ اس کی آواز سن چکی تھی پانی لے کے چلی آئی تو اماں بگڑ گئیں۔

"تم اور سر چڑھا ؤ اسے...... کوئی ایسا تیر مار کر نہیں آ رہی۔"

"آپ تو خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ اب اگر نوکری نہیں ملی تو اس میں میرا کیا قصور......؟ ہاں نہیں تو......" وہ نبیلہ کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئی اور اسی طرح

بڑبڑاتی رہی۔ کچھ دیر بعد نبیلہ اس کے پاس آ کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ جب اس کا بڑبڑانا ختم ہوا تب کہنے لگی۔

"تمہیں اماں کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ ایک تو عبید کی فکر...... دوسرے گھر کی پریشانی......"

"ہاں......! ایک وہی تو جیسے پریشان ہیں ہمیں تو کوئی فکر نہیں......؟" وہ تنگی سے بولی تو نبیلہ اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"پریشانی تو بے شک ہم سب کی ہے پھر بھی ہمیں انہیں حوصلہ دینا چاہئے۔ انہیں غصہ اس بات پر نہیں آیا کہ تمہیں نوکری نہیں ملی بلکہ تمہارے مایوس ہونے پر وہ خفا ہوئی ہیں اور میں بھی یہی کہوں گی کہ اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"ایک تو مجھ سے اب زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا۔ خیر ڈیلیوری کے بعد میں کچھ کروں گی۔"

"آپ کیا کریں گی......؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"سلائی ہی کر لوں گی۔ اگر قسمت میں اسی طرح لکھا ہے تو یونہی سہی، عبید تو پتا نہیں......" نبیلہ کی آنکھیں اچانک آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آواز ساتھ چھوڑ گئی تو وہ جلدی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"رونا نہیں بھابی......! بھیا اگر بدل گئے ہیں تو غم نہیں کریں۔ دیکھئے گا ایک دن کتنا پچھتائیں گے۔"

اور اس ایک لمحے میں وہ فیصلہ کر کے بولی۔

"اور آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے جاب مل گئی ہے۔"

"کیا......؟" نبیلہ نے بے یقینی سے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اماں کو تو میں یونہی تنگ کر رہی تھی۔ مجھے کل ہی سے جانا ہے۔"

"تو جاؤ......! پہلے اماں کو بتاؤ۔"

"آپ بتا دیں مجھے تو وہ ڈانٹیں گی۔" وہ نبیلہ کو بھیج کر خود لیٹ گئی اور نئے سرے سے ساری باتیں سوچنے لگی تو اب اس کے ذہن میں کتنے سوال اُٹھنے لگے تھے۔

○ ○ ○

وہ ایک بار پھر ان کے سامنے بیٹھی تھی اور انہیں جیسے اس کے آنے کا یقین تھا جب ہی نہ چونکے نہ حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے برعکس بڑے آرام سے پوچھنے لگے۔

"ہاں تو مس ربیعہ......! آپ نے اپنے لئے کس شعبے کا انتخاب کیا......؟"

اور وہ کل سے سارا وقت جاب کے بارے میں سوچتی رہی تھی لیکن اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ جب ہی بے وقوفوں کی طرح دیکھنے لگی۔ تب وہ خود ہی کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے آپ کے لئے کمپیوٹر ٹھیک رہے گا۔ جلدی سیکھ جائیں گی۔ میرے پاس مس یاسمین کام کر رہی ہیں۔ آپ ان کے پاس بیٹھ جائیں۔ پھر تین ساڑھے تین بجے میرے گھر چلی جایئے گا۔"

"یس سر......! لیکن......" اب جب یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ ان کی ملازم ہے تو کچھ پوچھتے ہوئے جھجک سی گئی۔

"ہاں ہاں کہئے......!" انہوں نے حوصلہ دیا تو کہنے لگی۔

"دوسر.....! آپ کے گھر میں میرا تعارف کیا ہوگا.....؟"

"آپ سنی کی ٹیوٹر بن کر جائیں گی۔ میں اپنی مسز کو فون کر دوں گا کہ میں سنی کے لئے ٹیوٹر بھیج رہا ہوں.....اور کوئی بات.....؟"

"نو سر.....!" وہ کہتے ہوئے اٹھنے لگی کہ انہوں نے روکا۔

"ایک منٹ.....!" پھر دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔

"اس میں میرے بیٹے کی حالیہ تصویر ہے، اچھی طرح دیکھ لیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے اچانک سامنے دیکھ کر دوسرے لوگوں کی طرح آپ بھی بلا ارادہ ہی سہی منہ موڑ لیں۔"

"جی.....؟" پتا نہیں کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ان کے سامنے تصویر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کہیں اس کی کوئی غیر اختیاری حرکت ان کے لئے دکھ کا باعث بنے یا انہیں ناگوار گزرے۔ اسی خیال کے تحت اس نے لفافہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر پوچھنے لگی۔

"مس یاسمین کہاں بیٹھتی ہیں.....؟"

"میں انہیں بلاتا ہوں۔" انہوں نے انٹرکام پر مس یاسمین کو بلایا اور اس کے آنے پر اس کے تعارف کے ساتھ بتایا کہ وہ اس کے پاس بیٹھے گی۔ پھر وہ یاسمین کے ساتھ ہی ان کے کمرے سے نکل آئی۔

پہلا دن تھا۔ وہ بس یاسمین کو کمپیوٹر کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے وہ کھیل ہی لگ رہی تھی اور دلچسپ کھیل تھا کہ بٹن دبانے سے کبھی کوئی فگر سامنے آتا کبھی کوئی چارٹ اور کبھی جیسے سارا کچھ گڈمڈ ہو جاتا۔ ایک دو بار اس کا دل چاہا وہ آنکھیں بند کر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلانا شروع کر دے۔ اس کے بعد دیکھے کیا ہوتا ہے.....؟

"تم نے ابھی گریجویشن کیا ہے.....؟" یاسمین نے پوچھا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر بولی۔

"نہیں.....! گزشتہ سال۔"

"ایک سال کیا کرتی رہیں.....؟"

"کچھ نہیں.....اطمینان سے گھر بیٹھی رہی۔"

"گھر میں بھی کہیں اطمینان ہوتا ہے.....؟" اسکرین پر نظریں جمائے یاسمین نے کہا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

"کیا مطلب.....؟ اور کہاں ہوتا ہے اطمینان.....؟"

"گھر میں بہرحال نہیں ہوتا۔ سو جھمیلے.....خواہ مخواہ کی ٹینشن.....بچوں کا شور.....بھاوجوں کی چخ چخ.....اماں کا ٹوکنا.....ابا کا چلانا.....شام میں بھائی آئیں تو ان کی بک بک.....خدا کی پناہ.....! ایک لمحہ اطمینان کا نہیں ہوتا۔" اس نے ایک منٹ میں اپنے گھر کا نقشہ کھینچ دیا اور وہ کیا کہتی ہنس بھی نہیں سکی۔ تب یاسمین اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"تمہارے گھر میں یہ سب نہیں ہوتا کیا.....؟"

"نہیں.....! میرے گھر میں اتنے افراد نہیں ہیں۔"

"خوش قسمت ہو۔" کتنے آرام سے اس نے خوش قسمت قرار دے دیا اور اس بار وہ ذرا ہنس کر رہ گئی۔

پھر جب تین بجے وہ آفس سے نکلی تو ڈرائیور گاڑی لیے موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ بیٹھ گئی اور جیسے ہی گاڑی چلی اس نے بیگ میں سے تصویر والا لفافہ نکال لیا۔ صبح سے اس کا دھیان اس طرف تھا لیکن آفس میں دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی کیونکہ خود اسے غیر اختیاری حرکت سرزد ہونے کا خدشہ تھا اور ابھی بھی کتنی دیر تک وہ بس لفافے کو ہی گھورتی رہی۔

پھر جب یہ خیال آیا کہ کہیں اسی میں راستہ تمام نہ ہو جائے، اس نے دھیرے دھیرے تصویر نکال لی اور کیونکہ اسی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی تو سچ مچ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ایک لمحے کے بعد ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سینے کے اندر دور دور تک کوئی آواز نہیں تھی گویا دل جیسے بند ہو گیا تھا اور اپنے زندہ ہونے کا یقین کرنے کے لئے ہی اس نے آنکھیں کھولیں تو پھر وہی چہرہ سامنے تھا جو کہیں سے بھی انسان کا چہرہ نہیں لگ رہا تھا اور یہ تصویر تھی ابھی اُسے حقیقت میں اس کا سامنا کرنا تھا جو واقعی اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ دل چاہا گاڑی رکوا کر یہیں اتر جائے اور اس جاب کا خیال دل سے نکال کر سیدھی گھر کی راہ لے۔ یوں بھی وہ خاصی بزدل واقع ہوئی تھی اور اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے یہ خیال آیا کہ آخر اسی کا انتخاب کیوں کیا گیا.....؟ اور بھی تو لڑکیاں تھیں اس کے مقابلے میں بہت ایکٹو۔

اس نے شیشے سے باہر نظر دوڑائی۔ پتا نہیں کون سا علاقہ تھا اور وہ یہیں سے واپسی کا سوچنے لگی تھی کہ عالمگیر صاحب کی بات یاد آئی۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کو جاب نہیں ملے گی لیکن بہت مشکل سے ملے گی کیونکہ ایک تو آپ سمپل گریجویٹ ہیں دوسرے وغیرہ وغیرہ۔ یعنی واقعی خواری اور وہ نئے سرے سے تگ و دو کر سکتی تھی لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے ابھی جو جاب مل گئی تھی، وہی غنیمت تھی۔ گہری سانس کھینچتے ہوئے اس نے دوبارہ تصویر پر نظریں جما دیں۔ تبھی گاڑی ایک موڑ مڑ کر رک گئی اور ڈرائیور نے اتر کر اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے جلدی سے تصویر کو لفافے میں ڈال کر لفافہ بیگ میں رکھ لیا اور نیچے اتر کر اس عالی شان بنگلے کو دیکھنے لگی۔

"چوکیدار.....! مس صاحب کو بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ۔" ڈرائیور نے چوکیدار کو پکار کر کہا تو وہ جیسے زبردستی خود کو گھسیٹتی ہوئی چوکیدار کے پیچھے چل کر اندر آئی۔ وہ قصداً ادھر ادھر دیکھنے سے گریز کر رہی تھی اور سر بھی جھکا ہوا تھا جب ہی اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کن مرحلوں سے گزر کر بیگم صاحب کے کمرے تک پہنچی ہے۔

"تم ربیعہ ہو.....؟" اس آواز پر ہی اس نے سر اٹھایا تو سامنے خاصی گریس فل خاتون موجود تھیں، قدرے ٹھٹھک کر ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے سلام کر دیا۔

"جیتی رہو.....! آؤ بیٹھو۔" انہوں نے کہا تو وہ ان کے بیڈ کے کنارے خاصے تکلف سے بیٹھ گئی۔

"تم سنی کو پڑھاؤ گی۔" بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا انداز سوالیہ نہیں تھا۔ اس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلا دیا۔ یوں بھی وہ کچھ مرعوب سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے ملازمہ کو بلا کر اسے سٹنگ روم میں لے جانے کو کہا پھر اس سے کہنے لگیں۔

"تم چلو.....! میں سنی کو بھیجتی ہوں۔"

وہ چپ چاپ اُٹھ کر ملازمہ کے پیچھے چل پڑی۔ پھر سٹنگ روم میں بیٹھتے ہی اس نے کافی محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرہ بہت سادہ تھا یعنی نہ فرنیچر کی بہتات نہ کوئی ڈیکوریشن پیس۔ البتہ گلاس وال سے پرے کا منظر انتہائی دلکش تھا جہاں سے غالباً ابھی کچھ دیر پہلے وہ گزر کر آئی تھی لیکن اس وقت دھیان نہیں دیا تھا۔ برآمدے اور چار اسٹیپ پر وائٹ ماربل کا فرش تھا۔ اس سے آگے سرخ اینٹوں کی روش پھر بہت خوبصورت لان...... وہ اس دلکشی کو دل ہی دل میں سراہ رہی تھی کہ سنی اس کے سامنے آ کر بولا۔

"ہیلو ٹیچر......!" وہ خوبصورت سے بچے کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرائی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھاتے ہوئے بولی۔

"مجھے تمہارا ہیلو کہنا بھی اچھا لگا ہے لیکن آئندہ ہم ایک دوسرے کو سلام کیا کریں گے...... ٹھیک......؟"

"آپ روزانہ آئیں گی۔" بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں......! کیوں......؟ کیا تمہیں پڑھنا اچھا نہیں لگتا......؟"

"اچھا لگتا ہے۔"

"بس تو میں روزانہ تمہیں پڑھانے آؤں گی۔ اب جلدی سے بتاؤ کون سی کلاس میں پڑھتے ہو۔"

"ون میں۔"

"ویری گڈ......!" اس نے سنی کا گال تھپک کر شاباش دی پھر اس کا بیگ کھولنے لگی تھی کہ عقب سے آواز آئی۔

"سنی......! یہ کون ہیں......؟" اسے پہلا خیال اس کا آیا اور بیگ پر آپ ہی آپ اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ جبکہ اندر کی وہی کیفیت تھی کہ دل اگر بند ہوا نہیں تھا تو ہونے والا تھا۔

"ماما......! یہ میری ٹیچر ہیں۔" سنی نے شوق سے بتایا۔

"اچھا......!" پتا نہیں اس کی ذرا سی ہنسی کس کے لئے تھی۔ پھر غالباً وہ وہیں سے پلٹنے لگا کہ سنی پکار کر بولا۔

"ماما......! آپ ٹیچر سے نہیں ملیں گے......؟"

"نہیں......!" اس کے لہجے کی تلخی اس نے صاف محسوس کی۔ دل ہی دل میں شکر کرنے لگی تھی کہ سنی مچل کر بولا۔

"کیوں ماما......؟ اتنی اچھی ٹیچر ہیں۔ آپ آ کر انہیں ہیلو کہیں۔" پھر غالباً اس کی بات یاد آنے پر کہنے لگا۔

"ہیلو نہیں سلام کریں۔"

"چلئے...... آپ میرا سلام کہہ دیں۔" اس نے شاید بچے کا دل رکھا اور بچے کی سمجھ میں نہیں آیا اس کا سلام کیسے کہے۔ تب اس کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ٹیچر......! سلام کریں ناں......!" اور ظاہر ہے بچے کا تو بہانہ تھا۔ اصل میں تو شاید وہ اسی کی ٹیچر تھی۔ اس کے لئے بھیجی گئی تھی پھر کب تک نظریں چراتی۔ اس خیال کے تحت اچانک ہی جانے کیسے ہمت کر کے وہ اپنی

جگہ سے کھڑی ہو گئی اور پوری اس کی طرف گھوم کر بولی۔

"السلام علیکم......!" وہ ایک لمحہ کو اپنی جگہ حیران ہوا۔ پھر غالباً اس سے اپنا آپ چھپانے کی خاطر فوراً اس کی طرف سے پیٹھ موڑ گیا اور جس لمحے سے وہ خوفزدہ تھی وہ گزر چکا تھا۔ یوں کہ پتا بھی نہیں چلا۔ تب وہ سہولت سے بولی۔

"سلام کا جواب تو دیتے جائیے......!"

"ہاں......! وعلیکم السلام......!" اس نے چونک کر کہا اور تیز قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔ تب گہری سانس کے ساتھ وہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے سنی کو دیکھ کر قصداً مسکرائی جبکہ دھیان اس کی طرف تھا۔ سنی نے خود ہی اپنا بیگ کھول کر ڈائری نکالی اور اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

"ٹیچر......! میری ڈائری دیکھیں۔"

اس نے چونک کر اس کے ہاتھ سے ڈائری لے لی۔ پھر اسی کے مطابق اسے ہوم ورک کروانے لگی۔ اس کام میں اس کا بالکل دل نہیں لگا۔ اگر اسے ایسا کوئی شوق ہوتا تو وہ بڑے آرام سے گھر بیٹھ کر بچوں کو ٹیوشن پڑھا سکتی تھی۔ البتہ کمپیوٹر کا کھیل اسے اچھا لگا تھا۔ اس نے سوچا وہ جتنی جلدی ہو سکا کمپیوٹر سیکھ کر کہیں اور جاب تلاش کرے گی۔ بہر حال بڑی بے دلی سے اس نے آدھے گھنٹے میں ہی بچے کو فارغ کر دیا۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ سے اجازت لینے کی غرض سے ان کے کمرے کی طرف آئی تو اندر سے اس کی آواز آ رہی تھی۔

"سنی کو میں خود پڑھا دوں گا۔ آپ اس لڑکی سے کہیں آئندہ یہاں نہیں آئے۔"

"بیٹا......! سنی تمہارے ساتھ صرف شرارت کرتا ہے پڑھتا نہیں ہے۔ کیا پہلے تم کوشش نہیں کر چکے......؟"

"وہ تو میرا اپنا موڈ نہیں تھا۔ اب سنجیدگی سے پڑھاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے......! تم بھی پڑھا لینا اور گھنٹہ بھر یہ بھی۔"

"نہیں ماما......! اور کوئی نہیں بس آپ اسے منع کر دیں۔" وہ بچوں جیسے ضدی لہجے میں بولا اور ان کی مزید کوئی بات سنے بغیر کمرے سے نکلا تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور وہ بالکل غیر ارادی طور پر سر جھکا گئی۔ یوں بھی زیادہ دیر تک اس پر نظریں جمانا ممکن نہیں تھا۔ جب وہ قریب سے نکل کر چلا گیا تب وہ کمرے میں داخل ہو کر بولی۔

"میرے لئے کیا حکم ہے بیگم صاحبہ......؟"

"تم اس کی باتیں سن چکی ہو اب میں کیا کہوں......؟" انہوں نے کچھ بھی کہنے سے معذوری ظاہر کی تو اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہ کیوں منع کر رہے ہیں......؟"

"بس بیٹا......! اصل میں وہ کسی کا گھر میں آنا پسند نہیں کرتا۔ سمجھتا ہے سب اس کا مذاق اُڑائیں گے۔" انہوں نے تاسف سے بتایا تو وہ کچھ دیر رُک کر بولی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں خود ان سے بات کر لوں۔"

"تم......؟" انہوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر رُک کر بولیں۔

"وہ تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرے گا۔ میرا مطلب ہے ہوسکتا ہے تم پر چیخنے چلانے بھی لگے اور تم سے فوراً نکل جانے کو بھی کہہ سکتا ہے۔"

"پھر بھی میں ایک کوشش کر لیتی ہوں۔" وہ ان کی باتوں پر اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولی اور یہ اس کی مجبوری تھی ورنہ اس کا اپنا دل چاہ رہا تھا کہ فوراً یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ کبھی پلٹ کر نہ آئے۔

"تمہاری مرضی......!"

ان کی اجازت ملتے ہی وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔ لاؤنج میں کھڑے سنی سے اس نے اس کے ماما کا پوچھا اور اس کے کمرے کی طرف آ گئی۔ کمرے کا دروازہ لاک نہیں تھا پھر بھی اس نے ہلکے سے ناک کیا اور کم آن کی آواز پر دل مضبوط کر کے اندر داخل ہوئی۔ غالباً اس کا اسٹڈی روم تھا۔ دیوار گیر الماریوں میں ترتیب سے کتابیں سجی تھیں۔ کمرے کے درمیان میں بڑی سی ٹیبل جس کے اطراف چھ کرسیاں رکھی تھیں وہیں وہ بیٹھا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ اسی طرح بیٹھی تھی اور وہ عقب سے آیا تھا۔ اب وہ عقب میں کھڑی تھی۔ بڑی دقتوں سے خود کو بولنے پر آمادہ کیا تو اس قدر کہہ سکی۔

"سنیں......!" اس کا چونکنا وہ دیکھ رہی تھی۔ پھر ہاتھوں کی مٹھیاں زور سے بھینچ کر اس نے ٹیبل پر رکھیں جیسے خود پر ضبط کر رہا ہو اور اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو کر بولا۔

"فرمایئے......!"

"کیا آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا......؟" وہ جلدی میں یہی کہہ سکی۔

"مجھے کسی کا بھی آنا اچھا نہیں لگتا۔"

"میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔" اس نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ ایک دم کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا اور وہ مسلسل اس کوشش میں مصروف تھی کہ نظریں اس کے چہرے پر جمائے رکھے لیکن بار بار زاویہ بدلنا پڑتا۔ تب وہ قدم بڑھا کر اس کے مقابل آ کر بولا۔

"کہاں تک خود پر جبر کریں گی آپ......؟ مجھے بتائیں کیا مجبوری ہے آپ کے ساتھ......؟ کیا ضرورت ہے......؟ میں یونہی پوری کر دوں گا۔"

وہ اچانک کم مائیگی کے احساس میں گھر کر تاسف سے بولی۔

"میں جانتی ہوں آپ بڑے آدمی ہیں۔ ہزاروں کی ضرورتیں پوری کرتے ہوں گے لیکن معاف کیجئے گا آغا جہانگیر......! میں بھیک لینے سے پہلے مرجانا پسند کروں گی۔"

"میں بھیک نہیں دے رہا۔"

"بنا محنت کے لیا ہوا ایک پیسہ میرے لئے بھیک ہوگا۔" وہ اپنی بات کہہ کر جانے لگی کہ اس نے پکار لیا۔

"سنیں مس......!" وہ رک گئی لیکن اس کی طرف پلٹی نہیں۔ اچانک آنکھوں میں جو نمی اتر آئی تھی اسے صاف کرنے لگی اور کچھ دیر انتظار کے بعد وہ کہنے لگا۔

"آپ کی مرضی...... شوق سے سنی کو پڑھائیں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ زیادہ دن تک یہ جاب جاری نہیں رکھ سکیں گی۔"

"آپ کس بنا پر اتنے یقین سے کہہ رہے ہیں......؟"

"میری طرف دیکھیں۔" اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اسی طرح کھڑی رہی۔ تب وہ قدرے تلخی سے بولا۔

"آپ میں تو مجھے دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں ہے مس......! جبکہ میں یہاں ہر قدم پر نظر آؤں گا۔"

(اُف......!)۔ پتا نہیں کس امتحان میں ڈال رہا تھا......؟ حوصلہ تو واقعی اس میں نہیں تھا۔ پھر اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

"آپ کو میری آزمائش مطلوب ہے۔ کہئے کہاں تک دیکھوں......؟" نظریں اس کے چہرے پر تو جما دیں لیکن اندر دل کا عالم یہ تھا کہ ابھی اُچھل کر حلق سے باہر جا گرے گا اور اس نے سوچ لیا آر یا پار...... کتنی دیر گزر گئی پھر وہ خود ہی رخ موڑ گیا تو اس کے چوڑے شانوں کے پیچھے اسے اپنا وجود بہت چھوٹا سا لگا۔ اب مزید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ سست روی سے اس کے کمرے سے نکل آئی اور سنی کو اگلے دن آنے کا کہہ کر باہر آ گئی۔

○○○

گھر میں داخل ہوئی تو غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ گھر میں اگرچہ پہلے بھی شور تو نہیں ہوتا تھا پھر بھی اماں کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں اور انہیں اپنے آپ بولنے کی عادت بھی تھی جبکہ اب ایک دم خاموشی تھی۔ اس نے پہلے اماں کے کمرے میں آ کر جھانکا تو وہ جا نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔ تب وہ اُلٹے پیروں نبیلہ کے پاس آ گئی۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے پتا نہیں سو رہی تھی یا یونہی لیٹی تھی۔

"بھابی......!" اس نے آہستہ سے پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ وہ سو نہیں رہی تب آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"یہ کون سا سونے کا وقت ہے......؟" اس نے کہتے ہوئے نبیلہ کی آنکھوں سے بازو ہٹایا تو وہ ٹھٹک گئی۔ شدتِ گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پہلے ہی آغا جہانگیر کو دیکھ کر اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ مزید دل سہم سا گیا۔ نبیلہ کے بازو پر اس کے ہاتھ کی گرفت آپ ہی آپ مضبوط ہو گئی اور اس سے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ خود کو ہر قسم کی صورتِ حال کے لئے تیار کرنے لگی۔ اچانک فضا کتنی بوجھل ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سے قاصر رہا تب نبیلہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوا ہے بھابی......؟ اماں نے کچھ کہا ہے......؟"

نفی میں سر ہلاتے ہوئے نبیلہ کی آنکھیں پھر چھلکنے لگیں اور اس نے تکیے کے نیچے سے لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"کس کا خط ہے......؟" اس نے لفافہ لیتے ہوئے یونہی پوچھا پھر خط نکال کر جلدی جلدی پڑھنے لگی۔ بھیا کا خط تھا اور انہوں نے لکھا تھا۔

"پیاری اماں......!

اُمید ہے گھر میں خیریت ہوگی۔

اپنے بارے میں کیا لکھوں اچھے دنوں کی تلاش میں نکلا تھا لیکن جانے خدا کو کیا منظور

ہے۔ سنگاپور تک تو خیریت سے پہنچ گیا تھا۔ میرے ساتھ تین چار لڑکے اور بھی تھے۔ سارا دن ہم نے سنگاپور میں گزارا اور طے یہ ہوا تھا رات میں ایجنٹ ہمیں جنگل کے راستے ملائیشیا لے جائے گا۔ بہرحال وقت مقررہ پر ایجنٹ ہم پانچوں کو لے کر چل پڑا۔ راستے اس کے جانے پہچانے تھے۔ اس لئے بھی ہم مطمئن تھے۔ پھر رات کے کسی پہر ہم نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور سو گئے۔ بس یہیں سے ہماری بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ صبح آنکھ کھلی تو ایجنٹ غائب۔ خود تو بھاگا ہی ساتھ ہمارے پاسپورٹ اور جس کے بیگ میں جتنی رقم تھی سب لے گیا۔

آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ ہم کس مشکل میں گھر گئے۔ نہ آگے جا سکتے تھے نہ واپسی کا راستہ تھا۔ پھر بھی اللہ کا نام لے کر چل پڑے اور ملائیشیا میں داخل ہوتے ہی غیر قانونی داخلے کے جرم میں گرفتار ہو گئے۔ ایک سال کی سزا سنائی گئی۔ چھ ماہ گزر چکے ہیں اتنا ہی عرصہ باقی ہے۔ میں نے آپ کو خط اس لئے نہیں لکھا کہ آپ لوگ پریشان ہوں گے لیکن آج اچانک خیال آیا کہ یہ پریشانی تو اور زیادہ ہو گی کہ میری کوئی اطلاع نہیں۔ پتا نہیں کیا گناہ ہوا تھا یا شاید آپ کی نافرمانی کرنے کی سزا مل رہی ہے۔ اچھا بھلا گھر بار چھوڑ کر نکل آیا۔ میرے ساتھ بلکہ مجھ جیسے سب لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اپنی مٹی کا کھا کر جوان ہوتے ہیں اور جب اسے کچھ دینے کا وقت آتا ہے تو منہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔

ہو سکے تو آپ مجھے معاف کر دیں اور میرے لئے دعا کریں۔ نبیلہ اور رجیہ کیسی ہیں میں ان دونوں سے بھی شرمندہ ہوں۔

آپ کی دعاؤں کا محتاج ..... حمید۔"

اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس نے خط تمام کیا اس کے بعد وہ کتنی دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھی رہی۔ بھیا کے بارے میں تشویش تو تھی لیکن اس قسم کی کوئی بات تو بھولے سے بھی نہیں سوچی تھی۔ کتنی مشکل میں تھے وہ اور ستم یہ کہ یہاں سے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں جب انسان بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نبیلہ کو دو حرف تسلی کے کیسے کہے۔ بہت کوشش کرنے کے بعد بھی وہ ایک لفظ نہیں کہہ سکی تو اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور سیڑھی پر بیٹھ کر پیشانی گھٹنوں پر ٹکا لی۔ آنسو جیسے چھلکنے کو بے تاب تھے اور اب اس نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کتنی دیر بعد اماں نے آ کر جھانکا۔ چولہے پر چائے کا پانی سوکھ چکا تھا اور اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔

"رجیہ.....!" اماں نے اس کے کندھوں سے تھام کر بلایا تو وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ آواز سن کر نبیلہ بھی وہیں آ گئی اور اب اماں ہی کو انہیں سنبھالنا تھا۔ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں کو چپ کرایا پھر ڈانٹنے لگیں۔

"شکر کرو.....! اللہ نے کسی بڑے امتحان میں نہیں ڈالا۔ کچھ وقت گزر گیا ہے کچھ گزر جائے گا۔ دعا کرو اللہ ساتھ خیریت کے اسے واپس لائے.....اور دیکھو.....! خبردار کسی کو بتانا مت۔ لوگوں کو تو یوں بھی کوئی موقع چاہئے ہوتا ہے۔ جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتی ہوئی کچن سے نکل آئیں۔

○ ○ ○

اس کی نظریں کی بورڈ پر حرکت کرتی یاسمین کی انگلیوں پر جمی تھیں لیکن ذہن اپنی ہی پریشانیوں میں الجھا تھا۔ کتنی سوچیں تھیں اور ہر سوچ کے اختتام پر سوالیہ نشان۔

"تمہیں کیا پریشانی ہے.....؟" یاسمین نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ حیران بھی ہوئی کہ اسے کیسے پتا چلا کہ وہ پریشان ہے۔

"نہیں بتانا چاہتیں تو مت بتاؤ۔" اس کے خاموش رہنے پر یاسمین نے اس انداز سے کہا جیسے اسے کوئی پروا نہیں۔ تب وہ ذرا سا ہنس کر بولی۔

"مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے بھلا.....؟"

"خیر.....! یہ تو نہ کہو..... یہاں ہر شخص پیدائش کے وقت سے ہی اپنے ساتھ ایک عدد پریشانی لے کر پیدا ہوتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس ایک پریشانی سے نجات کی کوشش میں وہ مزید پریشانیاں اپنے سر لاد لیتا ہے۔" یاسمین بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر خود ہی ہنسی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں.....؟"

"نہیں.....! لیکن تم نے ہر شخص غلط کہا ہے۔ یہ سوغاتیں تو ہم مڈل کلاس والوں کے حصے میں آتی ہیں جبکہ بڑے لوگ....."

"آں ہاں.....!" یاسمین فوراً ٹوکتے ہوئے بولی۔

"بے وقوف ہو تم.....! بڑے لوگوں کے دکھ بھی بڑے ہوتے ہیں اور ان کی ایک پریشانی ہماری سو پریشانیوں پر بھاری ہوتی ہے۔ اس حساب سے تو سمجھو ہم خوش نصیب ٹھہرے۔"

"واقعی.....!" وہ قائل ہو کر بولی۔ تبھی انٹرکام پر باس کی طرف سے اس کا بلاوا آ گیا تو ذہن کو پوری طرح حاضر کرتے ہوئے ان کے کمرے میں آ گئی۔ وہ فون پر بات کر رہے تھے۔ اچٹتی نظر اس پر ڈالی ضرور لیکن بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ جب فارغ ہو گئے تب اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"ہاں بی بی.....! کل آپ کو کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی.....؟"

"نو سر.....!" وہ یہی کہہ سکتی تھی۔

"گڈ.....!" انہوں نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔

"ایک بات یاد رکھئے گا..... سب کچھ ایک دم نہیں ہو جاتا۔ دھیرے دھیرے اور جب موقع دیکھیں اس سے بات کریں اور جب وہ آپ کو اپنا دوست سمجھنے لگے تب آپ اسے چہرے کی سرجری پر آمادہ کر سکتی ہیں۔ اس سے پہلے اگر کوئی بات کریں گی تو وہ آپ سے اکھڑ جائے گا۔ لہٰذا بہت محتاط رہئے گا۔"

"جی.....!"

"اور ہاں.....! گھر آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اب آپ خود سے چلی جایئے گا۔" وہ کچھ نہیں بولی تب انہوں نے جانے کے لئے کہا تو وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ انتہائی بے دلی سے بیگ اٹھایا اور بڑے سے

دوپٹے کو پھیلا کر اوڑھ رہی تھی کہ یاسمین پوچھنے لگی۔

''جا رہی ہو......؟''

''ہاں......! یہاں کی ڈیوٹی ختم۔'' وہ بے دھیانی میں کہہ گئی۔

''کیا مطلب......؟ پارٹ ٹائم بھی کہیں جاب کر رہی ہو۔''

''ارے نہیں......!'' وہ ہنسی اور وضاحت کئے بنا باہر آ گئی۔

پھر سنی کو کوئی گھنٹہ بھر اس نے پڑھایا۔ کچھ دیر بیگم صاحب کے پاس بھی بیٹھی لیکن اس تمام وقت میں وہ نظر نہیں آیا اور نہ صرف اس دن بلکہ اگلا پورا ہفتہ اس پر نظر نہیں پڑی۔ غالباً وہ جان بوجھ کر اس کی آمد پر خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا تھا اور اس طرح تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اس کا کام صرف سنی کو پڑھانا ہوتا تو حقیقتاً وہ اس کا سامنا نہ ہونے پر شکر کرتی لیکن وہ تو بھیجی ہی اس کے لئے گئی تھی اور وہی غائب۔ اس روز سنی کو ہوم ورک کرواتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔

''سنو......! تمہارے ماما کہاں ہیں......؟''

''ماما اپنے اسٹڈی روم میں ہیں۔'' سنی نے لکھنے میں مصروف رہ کر جواب دیا تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''تم ہوم ورک کرو میں ابھی آتی ہوں۔''

''آپ ماما کے پاس جا رہی ہیں......؟'' سنی کے پوچھنے پر وہ ذرا مسکرائی۔

''ہاں......! مجھے ان سے ایک کتاب لینی ہے۔ بس ابھی آتی ہوں۔''

وہ اس کا گال تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ خاصی نروس سی ہو رہی تھی اور کچھ عجیب سا بھی لگ رہا تھا لیکن جائے بنا چارہ بھی نہیں تھا۔ بہت ہلکے سے دروازے پر دستک دی اور کم ان کی آواز پر اندر داخل ہوئی تو وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس کی آمد غیر متوقع تھی جب ہی پہلے حیران ہوا پھر ناگواری سے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تو وہ بہت سنبھل کر بولی۔

''شاید آپ کو میرا آنا ناگوار گزرا ہے......؟''

''فرمایئے......! کیا کام ہے......؟'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''کام تو کوئی نہیں البتہ ایک بات پوچھنی تھی۔'' اس نے بے اختیار اس کی طرف چہرہ موڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو صرف اس پر سے نظریں ہٹانے کی خاطر وہ ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''اوّل روز آپ نے کہا تھا کہ آپ ہر جگہ نظر آئیں گے لیکن اس کے بعد سے نظر ہی نہیں آئے۔ میرا مطلب ہے اگر آپ نے میری وجہ سے خود کو پابند کر لیا ہے تو......'' وہ قصداً خاموش ہو گئی اور ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا تو وہ صاف گوئی سے بولا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ ہی کی وجہ سے میں خود کو مقید کر لیتا ہوں۔''

''تو اس کا مطلب ہے میں یہاں نہ آیا کروں......؟''

''میں آپ کو منع نہیں کر رہا۔''

''تو اور کیسے منع کیا جاتا ہے......؟ آپ زبان سے نہ کہیں لیکن آپ کا رویہ تو یہی ظاہر کر رہا ہے۔'' خلاف مزاج وہ بڑی جرأت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''آپ سنی کی ٹیچر ہیں صرف اسی سے مطلب رکھیں۔ دوسروں کے رویے سے آپ کو کیا غرض......؟'' وہ قدرے اکھڑے لہجے میں بولا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے......! مجھے صرف سنی سے مطلب رکھنا چاہئے لیکن کیا آپ کو سنی سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''کیوں نہیں......؟''

''پھر تو آپ کو آ کر دیکھنا چاہئے کہ میں اسے کیا پڑھا رہی ہوں......؟ بیگم صاحبہ تو غالباً اس وقت سو رہی ہوتی ہیں اور آپ کو بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اس طرح تو شاید میں خود اپنے کام سے انصاف نہیں کر سکوں گی۔ ظاہر ہے جب کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوگا......''

''لیکن میں......'' وہ اس کی بات پر الجھ گیا۔ انداز ایسا تھا جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔ تب وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے......! آپ اس کمرے سے نکلنا نہیں چاہتے تو کل سے میں سنی کو یہیں بیٹھ کر پڑھا دیا کروں گی۔'' وہ اپنی بات ختم کرتے ہی کمرے سے نکل آئی۔

(اب کل جو ہوگا دیکھا جائے گا)۔ سنی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔ پھر توجہ سے اسے پڑھانے لگی۔ بچہ خاصا ذہین تھا منٹوں میں سبق یاد کر لیتا۔ پھر اس سے سوال کرنے لگتی۔ اسی وقت پوچھنے لگا۔

''ٹیچر......! آپ کا گھر کہاں ہے......؟''

''میرا گھر......؟'' اور گھر کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ آج اماں نے جلدی آنے کو کہا تھا کیونکہ صبح ہی نبیلہ کی طبیعت کچھ خراب تھی اور اماں کا خیال تھا اسے ہاسپٹل لے جانا پڑے گا۔ بس وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ سنی سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہا اور باہر نکل آئی۔ تمام راستہ اپنی یادداشت کو کوستی رہی کہ دن میں ایک بار بھی اسے خیال نہیں آیا اور اب پتا نہیں اماں اور نبیلہ کہاں ہوں گی۔ پھر گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اندر آئی تو اماں کچن سے نکل رہی تھیں اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولیں۔

''بھتیجا مبارک ہو......!''

''بھتیجا......؟'' وہ یکدم ہلکی پھلکی ہو گئی پھر فوراً پوچھا۔

''بھابی کہاں ہیں......؟''

''اندر...... اللہ کا شکر ہے وقت پر دائی مل گئی تھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔'' اماں تفصیل بتانے لگیں لیکن اس کا دھیان تو مولود کی طرف تھا۔ اچھا اچھا کرتی ہوئی اندر بھاگ آئی اور بیگ ایک طرف پھینک کر پہلے بچے کو بازوؤں میں اٹھایا پھر نبیلہ کو دیکھ کر شرارت سے ہنسی اور اس کے جھینپنے پر اسی انداز میں بولی۔

''سچ کہوں گی بھابی......! بچہ تو آپ پر ہے نہ بھیا پر۔''

''پھر کس پر ہے......؟''

''یہ اپنے دادا پر ہے۔ بالکل ابا کی شکل کا لگ رہا ہے۔'' وہ بچے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر اس کے نرم نرم

گال پر ہونٹ رکھ دیے۔

"اے پہلے منہ ہاتھ تو دھولو۔" اماں نے ٹوکا تو وہ مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا......؟ کیا بغیر وضو کے اسے پیار نہیں کیا جا سکتا......؟"

"لو...... میں نے وضو کرنے کو کب کہا......؟"

"تو اب کہہ دیجئے۔"

"باتیں بنانے کے بجائے جا کر کچن دیکھو۔ صبح سے کمر اکڑ گئی ہے۔" اماں کمر پکڑ کر بیٹھ گئیں تو اس نے بچے کو ان کی گود میں ڈال دیا پھر خصوصاً نبیلہ کے کھانے کا پوچھ کر کچن میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد بچے کے رونے کی آواز آئی تو اسے لگا کتنے دنوں سے اس گھر میں چھایا جمود ٹوٹنے لگا ہے۔ فضا بھی رنگ بدل رہی تھی۔ جب اسے بھیا کا خیال آیا اور یہ کہ اگر وہ یہاں ہوتے تو اس خوشی کا رنگ بھی کچھ اور ہوتا اور نبیلہ بھی یقیناً ان کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہی ہو گی۔ پتا نہیں کیا ارمان ہوں گے۔ اس کے دل میں وہ سوچتے ہوئے اندر آئی اور دراز میں سے اپنی جمع پونجی نکال کر اماں کے آگے رکھتے ہوئے بولی۔

"اماں......! کچھ مٹھائی وغیرہ منگوا لیجئے ناں......؟" اور اماں ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

"لو...... میری بھی مت ماری گئی ہے۔ کتنی بار پڑوس کے بچے کو بازار بھیجا مٹھائی منگوانا بھول گئی۔"

"اب منگوا لیجئے......! بلکہ آپ خود لے آئیں۔" وہ اماں کو بھیج کر نبیلہ کے پاس آ بیٹھی اور اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

○○○

اگلے دن اس کا آفس جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اماں نے بھی کہا کہ چھٹی کر لو لیکن نئی نئی جاب تھی۔ ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اس لئے دل نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا۔

آفس آئی تو معلوم ہوا یاسمین چھٹی پر چلی گئی ہے۔ وہ خاصی بددل ہوئی کیونکہ وہ تو ابھی سیکھنے کے مراحل میں تھی اور جب یاسمین ہی نہیں تھی تو اس کا کیا کام......؟ کچھ دیر تک یونہی فارغ بیٹھی رہی پھر سر سے چھٹی لینے کی غرض سے ان کے کمرے میں چلی آئی اور ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کہنے لگی۔

"سر......! یاسمین تو نہیں آئی...... کیا میں بھی چلی جاؤں۔"

"جانا چاہیں تو چلی جائیں لیکن میرے گھر سے ہو کر جائیے گا۔" انہوں نے سہولت سے اسے اس کا اصل کام یاد دلایا اور وہ بہت جھنجھلاتی ہوئی باہر نکلی۔

(بھلا یہ کون سا وقت ہے جانے کا......؟ اس وقت تو سنی بھی اسکول میں ہو گا اور کیا بہانا کرے گی......؟)

تمام وقت یہی سوچتی رہی۔ گیٹ سے داخل ہوئی تو وہ لان میں کھڑا نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں رول کیا ہوا اخبار تھا اور جانے کس خیال کی گرفت میں تھا کہ پیشانی کی لکیر گہری ہو گئی تھی۔ وہ متوجہ کرنے کے لئے ذرا سا کھانسی تو وہ چونک کر دیکھنے لگا اور بوکھلاہٹ میں وہ یہی کہہ سکی۔

"وہ سنی......؟"

"سنی تو اس وقت اسکول ہوتا ہے۔" خلافِ عادت اس نے نرمی سے جواب دیا لیکن وہ اپنی بوکھلاہٹ پر

قابو نہیں پا سکی۔

"جی......! مجھے معلوم ہے۔"

"پھر......؟" اس نے پوچھا پھر فوراً احساس ہونے پر کہنے لگا۔

"آپ پلیز......! اندر چلیں۔"

"نہیں بس......! یہیں ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے......؟"

"میرا مطلب ہے میں ذرا جلدی میں ہوں بس یہ بتانے آئی تھی کہ آج میں سنی کو پڑھانے نہیں آ سکوں گی۔" اپنی بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھا تو وہ قدرے تعجب کے اظہار کے ساتھ بولا۔

"کمال ہے......! صرف یہی بتانے کے لئے آپ نے اتنی زحمت کی......؟"

"میں جاؤں......؟" اسے جانے کی جلدی تھی۔

"ایز یو لائک......!" وہ ذرا سے کندھے اچکا کر لاتعلق سا ہو گیا تو وہ جلدی سے پلٹ کر باہر نکل آئی۔

اچانک ہی اس شخص کا دکھ محسوس ہونے لگا اور بلا ارادہ اس کے بارے میں سوچنے لگی کہ پتا نہیں پہلے کیا ہوگا...... اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے حلقے میں بہت مقبول تھا اور اب ایک دم سے تنہا ہو کر پتا نہیں وہ زندہ کیسے تھا......؟ وہ [illegible] سے ہمدردی محسوس کرنے لگی۔

پھر سارا دن وقفے وقفے سے اس کا دھیان آپ ہی آپ اس کی طرف چلا جاتا۔ کبھی اس کے کل کو سوچتی جب زندگی اپنی تمام تر خوبصورتیوں سمیت اس پر مہربان تھی۔ گو کہ وہ اس وقت اس سے نہیں ملی تھی پھر بھی سوچ سکتی تھی کہ وہ جو چاہتا ہوگا پا لیتا ہوگا۔ سب کچھ اسے حاصل ہوگا اور آج وہ کتنا تہی دست تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی غالباً لوگوں کے رویوں نے اسے اس درجہ مایوس کیا تھا کہ وہ خود پر زندگی کے دروازے بند کر رہا تھا۔

○○○

ابھی تک تو یہ جاب اس کی مجبوری تھی لیکن اس روز وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اس گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ سنی اپنا بیگ لے کر آیا تو وہ بڑے آرام سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے اسٹڈی روم میں لے آئی اور وہ جس نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی وہ واقعی حیران ہو گیا اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتا وہ بول پڑی۔

"ہم آپ کو ڈسٹرب نہیں کریں گے۔"

وہ سر جھٹک کر دوبارہ کتاب میں مصروف ہو گیا۔ تب وہ مخمل کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی اور سنی کو دائیں طرف بٹھا کر فوراً ہی اس کی ڈائری دیکھنے لگی۔

"ٹیچر......! آپ کل کیوں نہیں آئی تھیں......؟" سنی بیگ میں سے کاپیاں نکالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کل مجھے کچھ کام تھا۔" اس نے جواب دینے کے ساتھ ڈائری اس کے سامنے رکھ دی اور ایک ایک سبجیکٹ کا ہوم ورک سمجھانے لگی۔ پھر جب سنی لکھنے میں مصروف ہو گیا تو اس کی نظریں شیشے کی الماریوں میں بھٹکنے لگیں۔ موٹی موٹی جلدوں میں پتا نہیں کون سے اسرار بند تھے......؟ اس کا دل چاہا قریب جا کر دیکھے لیکن پتا نہیں وہ اجازت دے گا یا نہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ حد درجہ لاتعلق نظر آیا۔ جیسے

اس کے علاوہ کمرے میں کوئی موجود ہی نہ ہوا اور بہت کوشش کے بعد بھی وہ اسے متوجہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تو سارا دھیان سنی پر مرکوز کر دیا۔ وہ ہوم ورک کر چکا تھا۔ دھیمی آواز میں اسے نظم (Poem) یاد کرانے لگی۔

Thank you!
For the world so sweet.
Thank you!
For the food we eat.
Thank you!
For the birds that sing.
Thank you!
For every thing.

پُرسکون خاموشی میں اس کی دھیمی دھیمی آواز نے خوبصورت ارتعاش پیدا کر دیا تھا اور بنا حرکت کئے وہ کتاب پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔ ہلکے ہلکے سر ہلاتے ہوئے اس کا پڑھنے کا انداز بے حد دلنشیں تھا۔ سنی کو دہرانے کا اشارہ کرتی پھر اس کے ایک ایک لفظ پر اس کا سر اسی انداز سے ہلتا۔ آنکھیں سنی کے معصوم چہرے کو بڑے پیار سے تک رہی تھیں۔ ہونٹوں کا کبھی پھیلنا کبھی سکڑنا اور کبھی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جانا، وہ کوشش کے باوجود اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ یہ تو نہیں تھا کہ وہ پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ سال بھر پہلے کتنی لڑکیاں اس کی دوست تھیں اور ان میں نیلا اور تینی کے ساتھ تو اس کی اچھی خاصی انڈرسٹینڈنگ بھی تھی لیکن انہیں دیکھ کر بھی وہ کبھی اس طرح بے اختیار نہ ہوا تھا اور شاید اس نے اپنے چہرے پر اس کی نظریں محسوس کر لی تھیں۔ کچھ عجیب سا لگا اور سنی کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس طرح سامنے کی کہ درمیان میں پردہ سا حائل ہو گیا تھا۔ وہ ذرا سا چونکا اور خود کو سخت قسم کی سرزنش کرنے لگا۔ تبھی اس کی آواز آئی۔

"شاباش......!" وہ سنی سے مخاطب تھی۔ "تم بہت اچھے بچے ہو۔ بہت جلدی یاد کر لیتے ہو۔ اب ذرا یہ بتاؤ کہ اس نظم (Poem) میں تمہیں کیا بتایا گیا ہے......؟"

"تھینک یو گاڈ!" بچے نے اپنی عمر اور سمجھ کے حساب سے کہا تو وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں......! ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس نے ہمیں اتنی بہت ساری چیزیں دی ہیں۔ اتنے پیارے رنگوں سے سجی یہ دنیا، اتنی پیاری زندگی......"

"لیکن ٹیچر! ماما تو کہہ رہے تھے یہ دنیا اچھی نہیں ہے۔" سنی نے اس کی بات درمیان میں اُچک لی۔

"آپ کے ماما غلط کہہ رہے تھے۔" وہ فوراً کہہ گئی اور اس نے جس انداز سے کتاب کو زور سے بند کیا اس سے وہ اندر ہی اندر سہم گئی کہ اب جانے اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی اور جب ادھر سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تب ہمت کر کے بولی۔

"ذرا اپنے ماما سے پوچھو سال بھر پہلے انہیں دنیا کیسی لگتی تھی......؟" سنی نے نا سمجھی کے عالم میں اپنے ماموں کو دیکھا پھر اسے دیکھنے لگا۔ بولا کچھ نہیں۔ تب وہ جو ایک کتاب سے درمیان میں پردہ تانے بیٹھی تھی، اسے

ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا......! ہم انسان بڑے ناشکرے ہیں۔ جب تک خوبصورت جوان اور توانا ہوتے ہیں، دنیا کے ساتھ بلکہ دنیا کو اپنے ساتھ چلا رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت تک دنیا ہمیں بڑی اچھی لگتی ہے اور اس کی رنگینیوں میں کھو کر ہم تھینک یو گاڈ کہنا ہی بھول جاتے ہیں۔ پھر جب کسی وجہ سے ہم دنیا کا ساتھ نہیں دے پاتے تو اسے برا کہتے ہیں۔ چ چ......! یہ تو اچھی بات نہیں ہے نا......؟" سنی اس کی باتیں نہیں سمجھ رہا تھا پھر بھی آخر میں اس کے پوچھنے پر یونہی سر ہلانے لگا اور وہ سنی کو کب سنا رہی تھی، اس کی آڑ میں اس سے مخاطب تھی۔

"آپ کے ماما کو کم از کم آپ کے سامنے دنیا کو برا نہیں کہنا چاہئے۔ اس لئے کہ آپ کے سامنے طویل زندگی ہے۔ اس میں آپ کو بہت کچھ پانا ہے اگر ابھی سے آپ کا معصوم دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا تو اپنے ماما کی طرح آپ بھی ایک کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤ گے اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ باہر نکلو، سارے رنگ آپ کے ہیں لیکن ایک بات یاد رکھنا بیٹا! کہ ان رنگوں میں کھو کر بھی تھینک یو گاڈ کہنا نہیں بھولنا......او کے......؟"

وہ سنی کا گال تھپک کر ہلکے سے مسکرائی اور جانے اس کی اپنی زندگی پر اس وقت کون سا رنگ تھا کہ مسکراتے ہوئے بھی وہ بے حد اُداس اور تنہا سی لگ رہی تھی۔ بندہ خود تاریک راہوں پہ کھڑا ہو اور دوسروں کو روشنی کی بشارت دے۔ کمال تو تھا۔ وہ اچانک اس کے سامنے خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگا۔ کچھ مضطرب سے انداز میں اُٹھتے ہوئے بولا۔

"سنی......! آپ کی ٹیچر ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ دنیا تو آج بھی اسی طرح خوبصورت ہے بس ہم......" اس کے دیکھنے پر وہ ہونٹ بھینچ کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ تب اس نے گھڑی پر نظر ڈالی پانچ بج رہے تھے۔

"چلو بیٹا......! اپنی کتابیں سنبھالو میں جا رہی ہوں۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی اور سنی سے ہاتھ ملا کر دروازے تک آئی تھی کہ اس نے پکار لیا۔

"سنیں ٹیچر......!" اس نے رُک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو خفتاً اتنا بولا۔

"تھینک یو......!" وہ نہیں سمجھی اور وضاحت سننے کے لئے پوری اس کی طرف گھوم گئی تب اسے اپنی بات کہنی پڑی۔

"آپ نے بروقت احساس دلا دیا ورنہ میں انجانے میں اس معصوم ذہن کو......آپ پلیز......! بیٹھیں نا......! میں چائے منگواتا ہوں۔" وہ اپنی پہلی کامیابی پر ذرا سا مسکرائی پھر معذرت کرتے ہوئے بولی۔

"سوری......! چائے کے لئے رُکی تو دیر ہو جائے گی۔"

"ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔"

"سوری اگین......! میں گاڑی میں جانا افورڈ نہیں کر سکتی۔"

"آپ سمجھیں نہیں......میں ٹیکسی کی بات نہیں کر رہا۔" وہ اس کے اُلجھنے پر محظوظ ہو کر بولی۔

"میں سمجھ گئی ہوں لیکن اپنی بات آپ کو نہیں سمجھا سکتی......او کے......! خدا حافظ......!" وہ بڑے آرام سے اسے اُلجھتا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

○○○

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ جو اتنی ڈرپوک اور بزدل ہوا کرتی تھی، وہ اس خوبی سے حالات سے نبرد آزما تھی کہ کسی کسی وقت اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہوتی کہ وہ خود اندر سے شکستہ اور مایوس ہونے کے باوجود کس طرح دوسروں کو حوصلہ دینے کھڑی ہو جاتی ہے۔ بھیا کے لئے وہ خود بہت فکر مند تھی۔ گو کہ اب ان کے خط باقاعدگی سے آتے تھے لیکن وہ آئندہ کا سوچتی تھی یعنی عزیز رشتہ دار سب اتنا جانتے تھے کہ بھیا باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ کسی کے علم میں نہیں تھا کہ وہاں وہ اسیری کے دن کاٹ رہے ہیں اور ان کی واپسی پر ظاہر ہے لوگ اسی حساب سے ان کی پذیرائی کریں گے جیسے باہر سے آنے والوں کی کی جاتی ہے۔ پھر ان سے چھوٹے موٹے تحائف کا مطالبہ بھی کیا جائے گا اور وہ جو خود تہی دست ہوں وہ کسی کو کیا دیں گے بھلا......؟

(پتا نہیں اماں کی دوررس نگاہیں ان حالات تک رسائی حاصل کر سکی تھیں یا نہیں......؟)۔ وہ ضرور سوچتی اور کڑھتی تھی اس کے باوجود جب بھی نبیلہ کو آزردہ یا مایوس دیکھتی اسے سمجھانے بیٹھ جاتی۔ اس طرح اس کی اپنی زندگی میں دور دور تک کوئی دیا نہیں جلتا تھا۔ کچھ لوگ جو اس انتظار میں تھے کہ اس کا بھائی باہر سے اس کے لئے بہت سامان لے کر آئے گا وہ یقیناً بھیا کے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہی منہ موڑ لیں گے اس لئے کسی خوش فہمی کا دامن تھام کر کچھ دیر کو ہی سہی اپنی اندھیری راہوں میں کوئی دیا نہیں جلایا تھا۔ اس کے باوجود آغا جہانگیر کے راستے میں چراغ رکھ دی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ان چراغوں کی روشنی میں جب وہ اپنا راستہ پالے گا تو پھر سے اپنی اس دنیا میں گم ہو جائے گا اور یہاں کچھ زیادہ حقیقت پسندی سے سوچتے ہوئے وہ کچھ غلطی کر رہی تھی۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ چراغوں کی لو اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے۔

اگر دنیا پھر سے حسین نظر آنے لگی ہے تو سارا حسن صرف اس کے وجود کا مرہون منت ہے۔ اگر زندگی سے پیار ہونے لگا ہے تو صرف اس کے لئے لیکن وہ اپنے جذبوں پر بند باندھنے پر مجبور ہے بلکہ بے حد خوفزدہ کہ ایسا نہ ہو کبھی انجانے میں ہی اظہار لبوں تک آ جائے اور جواب میں اگر لحاظ مروت کا دامن تھام کر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی تب بھی اس کی ایک نظر اسے مار ڈالنے کے لئے کافی ہوگی۔ سارا دن اسے سوچتے اور اس کے انتظار میں گزرتا اور جب وہ آتی تو خود پر بیزاری سے پہرے بٹھا دیتا۔ کبھی بے اختیار بولنے میں پہل کرتا تو کبھی رک رک جاتا اور وہ کیونکہ بہت کم اسے براہ راست دیکھتی تھی اس لئے سمجھ ہی نہیں پاتی تھی۔ قصداً بھی سر جھکا کر کبھی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اور اکثر سامنے رکھے گلدستے پر نظریں جما کر وہ روانی سے بول جاتی تھی۔ بہر حال اس عرصے میں وہ اس کے ساتھ ہلکے پھلکے موضوعات پر بڑے آرام سے بات کرنے لگا تھا اور ظاہر ہے کسی کو پڑھانے کا تو بہانہ تھا ورنہ اس کا اصل کام اسے مایوسیوں سے نکال کر یہ یقین دلانا تھا کہ وہ قابل نفرت نہیں ہے۔ اس لئے اب وہ بڑے آرام سے کسی کو پندرہ منٹ میں ہوم ورک کروا کر فارغ کر دیتی پھر اس کے ساتھ کوئی موضوع چھیڑ دیتی اور ہر معاملے میں خود اس کی اپنی معلومات صفر ہوتی کیونکہ اس نے بہت محدود زندگی گزاری تھی جبکہ اس کی نہ صرف معلومات بلکہ مشاہدہ بھی بے حد وسیع تھا پھر بھی وہ ظاہر نہیں کر رہا تھا بلکہ کم بولتا اور اسے زیادہ موقع دیتا۔ پتا نہیں شاید وہ بولتی ہوئی اچھی لگتی تھی۔ اس وقت بات کرتے کرتے وہ اچانک اس سے پوچھنے لگی۔

"آپ اتنے الگ تھلگ سے کیوں ہو گئے ہیں......؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو خود ہی کہنے لگی۔

"غالباً لوگوں کے رویوں سے دلبرداشتہ ہو کر آپ نے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے لیکن یہ کوئی اچھی بات تو

نہیں ہے......؟"

"یہ آپ اس لئے کہہ رہی ہیں کہ یہ سب آپ کے ساتھ نہیں ہوا۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ مجھے کیسی کیسی نظروں کا سامنا کرنا پڑا...... پھر لوگوں کے ریمارکس......" اس کے اندر ڈھیر ساری تلخی بھری تھی جو اس کے لہجے میں در آئی اور وہ بہت خاموشی سے اسے سننے لگی۔

"شروع میں میں یوں الگ تھلگ نہیں ہو گیا تھا۔ کیونکہ مجھے تنہا رہنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ خود سے دوستوں کے پاس چلا جاتا لیکن مجھے دیکھ کر سب منہ موڑ لیتے اور پہلے میں نے اس بات کو اتنا محسوس نہیں کیا کیونکہ میں خود بھی آئینے میں اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ جب تک میرے چہرے کے زخم اچھی طرح نہیں بھر جاتے سرجری ممکن نہیں ہے۔ بس پھر زخم بھرنے تک ایسے ایسے واقعات ہوئے کہ میں الگ تھلگ ہو گیا۔ اب آپ کہیں گی یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔"

"جی......!" وہ بیچ بیچ میں شپٹا گئی اور قدرے توقف سے وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"اب کیا اچھا ہے کیا برا......؟ یہ تو میں نہیں جانتا۔ بس میں نے اپنی الگ دنیا بسا لی ہے۔ تنہائیاں بھی اچھی لگنے لگی ہیں۔ ایک عمر شور اور ہنگاموں میں گزری اور جیسا کہ آپ نے کہا تھا کہ رنگینیوں میں کھو کر انسان تھینک یو کہنا بھول جاتا ہے تو میں بھی بھولا رہا، یاد اس وقت آیا جب سب ساتھ چھوڑ گئے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم سب کسی نہ کسی حادثے سے دوچار ہونے کے بعد ہی خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اس سے پہلے تو وہی پہلی کلاس میں رٹا ہوا سبق زبانی دہراتے ہیں کہ اللہ ایک ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، وہ بڑی قدرت والا ہے اور ہم مانتے اس کی قدرت کو اسی وقت ہیں جب ہمارے ساتھ کوئی انہونی ہو جاتی ہے۔" اس کے لہجے میں لفظوں کے دکھ بول رہے تھے۔ پھر ایک نظر اس پر ڈال کر کہنے لگی۔

"بہر حال...... آپ اپنی اس الگ دنیا میں مطمئن سہی پھر بھی آپ کو دوسروں کا خیال ضرور کرنا چاہئے۔ زندگی صرف اپنے لئے جینے کا نام نہیں ہے پھر آپ تو اپنے والدین کا واحد سہارا ہیں۔ دوسروں کے غلط رویوں کا بدلہ ان سے کیوں لے رہے ہیں......؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا......؟" وہ جو سگریٹ سلگا رہا تھا، ایک دم سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں کوئی مشکل بات نہیں کر رہی۔ آپ کو خود سمجھنا چاہئے کہ آپ کی کنارہ کشی آپ کے والدین کے لئے کس قدر تکلیف کا باعث ہے۔ بیٹا جوان ہو جائے تو باپ خود کو پھر سے توانا محسوس کرنے لگتا ہے اور ماں کی تو ایک ہی آرزو ہوتی ہے۔" وہ بات کے اختتام پر قصداً اسے دیکھ کر مسکرائی اور وہ اپنے آپ پر ہنسا۔

"میں...... میں کیا کر سکتا ہوں......؟"

"سب کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ خود کو اس زنداں سے باہر نکالئے۔"

"نہیں......!" وہ کسی بچے کی طرح خوفزدہ ہوا اور وہ باقاعدہ اس کے سامنے جم گئی۔

"کیوں نہیں......؟"

"مجھ میں مزید تضحیک کا نشانہ بننے کا حوصلہ نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے اپنی کمزوری کا اعتراف

کیا۔

"اتنے کم حوصلہ لگتے تو نہیں آپ......؟" وہ جانے کس بنا پر کہہ گئی پھر فوراً سنبھل کر بولی۔

"بہرحال......! اس طرح نہیں تو پہلے سرجری کروالیں۔"

"نہیں......!"

اور اس بار وہ زچ ہو کر بولی۔

"کیوں نہیں......؟"

"بس نہیں......!" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"اپنے اس چہرے کے ساتھ میں نے دُنیا کو پہچانا ہے۔"

"تو پھر اسی چہرے کے ساتھ دُنیا کا سامنا کریں۔ ویسے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ سب لوگ آپ کے دوستوں جیسے نہیں ہوتے...... صرف ظاہری خوبصورتی پر مرنے والے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر دوسرا شخص زندان میں نظر آتا۔" اس نے ایک لحظہ کو اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر سامنے گملے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"آپ پرواہ کیوں کرتے ہیں......؟ جو آپ کو دیکھ کر منہ موڑے آپ بھی منہ موڑ لیں۔ آپ صرف اپنے والدین کی پرواہ کرتے ہوئے ان کی آرزوؤں کی تکمیل کریں۔"

وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور اب جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا جب ہی کاغذی پھولوں کو چھیڑنے میں لگ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا۔

"میں اپنے ڈیڈی کا بازو بن سکتا ہوں لیکن ممی کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ میرے خیال میں کوئی ذی ہوش لڑکی مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔" وہ بے دھیانی اور روانی میں کہہ گئی تو وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ کر بولا۔

"آپ......! آپ کریں گی مجھ سے شادی......؟"

وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی اور سینے کے اندر دل پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔

"جواب دیں ربیعہ......! میرے ساتھ چل سکتی ہیں......؟" اس کا انداز بے حد جارحانہ تھا اور اس کے ہاتھ کو اتنے زور سے دبایا کہ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا، ہونٹ کاٹتے ہوئے چہرہ دوسری طرف موڑ گئی تب اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے تاسف سے بولا۔

"جب آپ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں ربیعہ......! تو سمجھ لیں کوئی نہیں دے سکتا۔"

وہ پھر سے مایوسیوں کے پاتال میں اتر رہا تھا اور اس مقام پر وہ اتنی بے بس تھی کہ ایک لفظ نہیں کہہ سکی۔ بمشکل تمام خود کو سہارا دے کر کھڑی ہوئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آئی۔

○○○

تین دن سے وہ نہ آفس جا رہی تھی اور نہ ہی کسی کو پڑھانے۔ گھر میں بھی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی بے کلی تھی۔ بے نام سی اُداسیاں اور ذہن یکسوئی سے کچھ سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔ شاید اس کے گمان میں

بھی نہیں تھا کہ بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک آ جائے گی۔ وہ تو اپنی ڈیوٹی نبھا رہی تھی۔

لیکن نہیں اب اس پر ادراک ہو رہا تھا اور بے نام سی اُداسیاں بھی گواہ تھیں کہ یہ صرف اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ ڈیوٹی تو صرف آفس کی حد تک تھی۔ اس کے بعد کوئی اور ہی جذبہ تھا جو کشاں کشاں اس کے گھر کی طرف لے جاتا تھا اور اس جذبے کو وہ کوئی نام کیا دیتی خود سے بھی پوشیدہ رکھتی رہی تھی کہ وہ تو پھر سے دُنیا کی رنگینیوں میں گم ہو جائے گا تب وہ کہاں اسے ڈھونڈتی پھرے گی اور اگر ڈھونڈ بھی لیا تو وہ کہاں پہچانے گا بھلا......؟ شاید اپنی یادداشت کھنگالتے ہوئے کہہ دے۔ آپ منی کی ٹیچر ہیں۔ بے حد آزردگیوں میں گھری وہ مسلسل اسی نہج پر سوچ رہی تھی کہ نبیلہ نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں......؟ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ......؟" اس نے گہری سانس کھینچ کر اندر کی آزردگی سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور خالی خالی نظروں سے نبیلہ کو دیکھا تو وہ پوچھنے لگی۔

"کیا جاب چھوٹ گئی ہے......؟"

"نہیں تو......!"

"پھر آفس کیوں نہیں جا رہیں......؟"

"بس......! کچھ اُکتاہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچا ایسا نہ ہو غلطیوں پر غلطیاں کرتی جاؤں اور ہمیشہ کے لئے چھٹی ہو جائے اس سے پہلے خود ہی ہفتے بھر کی چھٹی لے لی۔" اس نے خوبصورتی سے بات بنانے کی کوشش کی لیکن نبیلہ بغور اسے دیکھ رہی تھی پُر سوچ انداز میں بولی۔

"مجھے لگتا ہے تم کوئی غلطی کر چکی ہو۔" اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"اب تو خمیازہ بھگت رہی ہوں۔"

"کیا مطلب......؟ کس بات کا خمیازہ بھگت رہی ہو......؟" نبیلہ کچھ بھی نہیں سمجھی پھر بھی تشویش کا اظہار کیا تو وہ قصداً زور سے ہنس پڑی اور اسی طرح ہلکے پھلکے انداز میں بتانے لگی۔

"بس بھابی......! شروع میں غلطی ہو گئی جو میں نے باس کی بات مان لی تھی۔ گو کہ انہوں نے مجھے سوچنے کو وقت دیا تھا لیکن ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ گھر کے حالات کے پیش نظر مجھے فوراً ہامی بھرنی پڑی ورنہ شاید منع کر دیتی کیونکہ یہ جاب میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بہرحال اپنی اسی غلطی کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔" اس بار وہ بات بنانے میں کامیاب ہوئی تو نبیلہ اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ تم پر ظلم ہے۔ جاب کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ ایسا کرو چھوڑ دو۔ ایک دو مہینے میں تمہارے بھیا بھی آنے والے ہیں۔"

"ہاں وہ تو ہے......" وہ کڑوا سچ بولنے جا رہی تھی کہ ایک دم ہونٹ بھینچ لئے اور نبیلہ نادان نہیں تھی، دُکھ سے بولی۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ ان کے آنے سے کون سا ہمارے درد دور ہو جائیں گے۔"

"ارے......! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ بھیا آ جائیں گے یہ کیا کم خوشی کی بات ہے۔" پھر اس کے بازو میں چٹکی کاٹتے ہوئے بولی۔

''بہت ودھلی ہیں آپ...... ! خط میں تو لکھ رہی تھیں میر انتظار ہو...... تم ہی لوٹ کے آجاؤ۔''

''اس میں دوغلا پن کیا ہے...... ؟''

''بتاؤں کیا ہے...... ؟'' اس نے گدگدانے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن نبیلہ اٹھ کر بھاگ گئی۔

رات میں سونے کے لئے لیٹی تو پھر وہی سوچیں تھیں اور دُکھ صرف اس بات کا نہیں تھا کہ وہ ہار رہی تھی اس شخص کا خیال زیادہ بے چین کر رہا تھا جو اچانک اس کا ہاتھ تھام گیا تھا اور اس کے منہ موڑ لینے پر پتا نہیں اس پر کیا بیتی ہوگی۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا وہ کہ جب آپ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں ربیعہ! تو سمجھ لیں کوئی نہیں دے سکتا۔

(اور میں تمہارا ساتھ کیسے دے سکتی ہوں آغا...... ! میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں) اسے اپنی کم مائیگی کا احساس رُلا گیا تھا۔ کتنی دیر بے آواز آنسوؤں سے تکیہ بھگوتی رہی پھر سوچا وہ اسے ساری صورت حال سچ بتا دے گی کہ وہ پھٹیچر تنخواہ دار ملازم ہے جو یونی اسے سوچی گئی، وہ وہی نبھارہی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح اسے دیکھ کر منہ نہیں موڑ سکتی اور یہ ساری باتیں اس کے سامنے کہنے کے لئے بہت ہمت چاہئے تھی جو اس میں نہیں تھی۔ تب اس نے ٹیلی فون کا سہارا لیا۔ اگلی صبح اماں سے آفس فون کرنے کا کہہ کر قریبی پی سی او سے رنگ کر ڈالا۔

''آغا جہانگیر اسپیکنگ...... !'' خاصا عجلت بھرا انداز تھا اور وہ اس کی آواز سن کر ہی سب بھول گئی۔ بمشکل کہہ پائی۔

''جی میں ربیعہ...... !'' دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر وہ انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ کہے تب بات بڑھے لیکن وہ کچھ نہیں بولا اور اس کی اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو کہنے لگی۔

''ایسا ہے کہ میں دو تین روز سنی کو پڑھانے نہیں آسکوں گی۔''

''پچھلے تین روز سے بھی آپ نہیں آرہیں اور مزید کوئی چھٹی نہیں ہوگی...... آپ کو آج آنا ہے۔'' وہ قدرے سخت انداز میں حکم صادر کر کے فون بند کر گیا اور وہ پریشان ہوگئی۔ پھر خود کو کوستی رہی کہ ناحق فون کیا۔ آرام سے تین دن بعد جاتی اور اس وقت وہ جو کہتا سن لیتی۔ اب اگر نہیں جائے گی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔

دوپہر تک وہ نہ صرف اس کے لہجے کو سوچتی رہی جس میں تحکم اور کرختگی تھی بلکہ یہ بھی کہ پتا نہیں اب اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے اور اس معاملے میں وہ خاصی بزدل تھی۔ جیسا کہ باس نے بتایا تھا کہ خلاف مزاج بات ہو جانے پر وہ چیخنے چلانے لگتا ہے اور اسے لگ رہا تھا جیسے اب وہ مرحلہ آگیا ہے۔

تمام راستہ وہ خود کو اس نئی صورت حال کے لئے تیار کرتی رہی۔ پھر بھی جب اس کے گھر میں داخل ہوئی اندر سے بہت سہمی ہوئی تھی۔ سنی اپنا بیگ لے کر اس کے اسٹڈی روم کی طرف جانے لگا تو اس نے بہت خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر دھیمی آواز میں بولی۔

''آؤ...... ! ادھر سٹنگ روم میں چلتے ہیں۔''

سنی نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا چپ چاپ اس کے ساتھ آگیا پھر جب بیٹھا تو پوچھنے لگا۔

''ٹیچر...... ! آپ کیوں نہیں آرہی تھیں...... ؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' وہ سرسری انداز میں کہہ کر اس کی ڈائری دیکھنے لگی۔

''لیکن ماما تو کہہ رہے تھے آپ ڈر گئی ہیں۔'' سنی نے سادگی سے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

''کس سے...... ؟''

''پتا نہیں...... !'' سنی نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر ڈائری اس کے سامنے رکھ کر بولی۔

''چلو...... آپ اپنا ہوم ورک کرو۔'' سنی لکھنے میں مصروف ہوگیا اور وہ دل ہی دل میں دُعائیں مانگنے لگی کہ اس سے سامنا نہ ہو کیونکہ وہ ہرگز بھی خود میں اتنی ہمت نہیں پارہی تھی۔ عجیب مشکل تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی وہ ہر شے کو ٹھوکر مارتا ہوا اس کے سامنے آکھڑا ہوگا پھر کہے گا۔ جواب دو کیا تم میرے ساتھ چل سکتی ہو...... ؟ اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہاں یا نہیں کہنا آسان تھا۔ بات ہی ختم ہو جاتی جبکہ وہ تیسرے راستے پر کھڑی تھی جہاں کبھی مصلحتیں دامن تھامتیں کبھی مجبوریاں اور کبھی کوئی خواہش چپکے سے سرگوشی کر جاتی۔ بہر حال مسلسل دھڑکے سے پریشان ہو کر اس نے کچھ ڈرتے ہوئے سنی سے پوچھا۔

''سنو بیٹا...... ! آپ کے ماما کہاں ہیں...... ؟''

''آفس...... !'' سنی نے بدستور مصروف رہ کر مختصر جواب دیا اور اسے بیچ بیچ اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا۔

''کیا...... ؟ کیا کہا آپ نے...... ؟ کہاں ہیں آپ کے ماما...... ؟''

''ماما آفس گئے ہیں۔'' اس کے بے تابانہ پوچھنے پر سنی نے معصومیت سے اسے دیکھا پھر اسی انداز میں بولا۔

''تھینک یو گاڈ...... ! ماما آفس جاتے گئے ہیں۔ ٹیچر آپ بھی کہیں ناں...... !''

''ہاں تھینک یو گاڈ...... !'' وہ چونک کر بولی اور صوفے کی بیک پر سر رکھا تو اچانک آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کوئی نیا انوکھا احساس تھا۔ شاید پالینے سے بھی بڑھ کر جس کی گرفت میں آکر وہ کچھ دیر کو سب بھول گئی۔ گلاس وال سے پرے پھولوں پر خوبصورت رنگوں کی تتلی منڈلا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی نے اس منظر کو قدرے دُھندلا دیا تھا پھر بھی وہ اسی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ تبھی ڈرائیو وے پر گاڑی آن رکی۔ پھول، تتلی پس منظر میں چلے گئے اور وہ منظر پر آگیا۔ آف وائٹ سفاری سوٹ میں اس کا دراز قد اور نمایاں ہو گیا تھا۔ قدم مضبوطی سے جماتا وہ اس طرف آرہا تھا اور وہ جیسے اپنی جگہ پتھر ہوگئی تھی۔ حواس تک ساتھ نہیں دے رہے تھے بس سینے کے اندر ایک دل تھا جو اس کے ہر قدم کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ پھر عین اس کے سامنے آکر وہ رُک گیا اور سنی کو مخاطب کر کے بولا۔

''سنی...... ! آپ جاؤ...... ! باقی ہوم ورک شام میں کر لینا۔''

''لیکن ماما...... ! ٹیچر تو چلی جائیں گی۔''

''میں کرادوں گا۔ تین دن سے بھی تو میں کروا رہا تھا...... جاؤ شاباش...... !''

سنی اپنی کتابیں بیگ میں رکھ کر کھڑا ہوا تو اس کے ساکت وجود میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ بے حد سہمی ہوئی نظروں سے سنی کو جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ دروازے سے نکل گیا تب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

''ربیعہ...... !'' بالآخر اسے متوجہ کرنا پڑا اور متوجہ ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ مخمل پر سے اس

نے اپنا بیگ اُٹھایا۔ پھر جیسے ہی جانے کے لئے قدم بڑھایا وہ بول پڑا۔

"میں نے آپ کو جانے کے لئے تو نہیں کہا۔"

"یہ طے نہیں ہے کہ آپ کہیں گے تب ہی میں جاؤں گی۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"لیکن وقت تو طے ہے۔ آپ پانچ بجے سے پہلے نہیں جا سکتیں اور ابھی صرف چار بجے ہیں۔"

(اُف.....!)۔ وہ جانے کیا چاہتا تھا.....؟ وہ خاصی جز بز ہو کر بولی۔

"جب سنی کو پڑھنا نہیں تو میں کیا کروں.....؟"

"اس سے پہلے کیا کرتی تھیں.....؟ سارا وقت تو آپ کا سنی کو پڑھانے میں نہیں گزرتا تھا.....؟"

ہلکے سے طنز کے ساتھ اس نے جتایا تو وہ روہانسی ہو گئی۔

"پلیز.....! مجھے جانے دیں۔"

"مجھ سے خائف ہیں۔ اطمینان رکھیں میں آپ کا محاسبہ نہیں کروں گا گو کہ یہ میرا حق ہے پھر بھی میں آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ ایک ٹوٹے ہوئے شخص کو مزید توڑ کر کیا ملا آپ کو؟" اس کے لہجے کی شکستگی چھپائے نہ چھپی اور اسے زیادہ دکھ اسی بات کا تھا۔ بہت بے قرار ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ذرا سے کندھے اُچکا کر بولا۔

"جا سکتی ہیں آپ.....!"

وہ بہت بوجھل قدموں سے باہر نکل آئی۔ پھر ابھی اس کی چھٹی باقی تھی لیکن جس کی وجہ سے گھر بیٹھ رہی تھی اس سے تو سامنا ہو گیا تھا پھر مزید چھٹی کا کیا فائدہ تھا اُلٹا فراغت پریشان ہی کر رہی تھی۔ اس لئے اگلے دن وہ آفس چلی آئی۔ اسے دیکھ کر یاسمین نے تعجب کے اظہار کے ساتھ کہا۔

"ہائیں.....؟ تمہیں تو ہفتے کو آنا تھا.....؟"

"تمہارے خیال سے چلی آئی کہ تم بور ہو رہی ہو گی۔" اس نے مسکرا کر محبت جتائی لیکن وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"میرا خیال مت کرو بی بی.....! مجھے تنہائی بہت عزیز ہے۔"

"بہت ناشکری ہو تم.....! ایمان سے اگر میرے گھر میں اتنے افراد ہوتے تو میں....."

"شکر کر نہیں ہیں۔" یاسمین نے فوراً ٹوک دیا پھر ایک فائل اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"لو اب آ ہی گئی ہو تو اسے دیکھ لو اور ذرا دھیان سے دیکھنا۔ غلطی ہو گئی تو وہ گوریلا ہرگز نہیں چھوڑے گا۔"

"کون گوریلا.....؟" صفحے پلٹتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"ارے ہاں.....! تم نے تو نہیں دیکھا۔ خیر آج دیکھ لینا۔ اپنے باس کے صاحبزادے ہیں..... مسٹر آغا جہانگیر۔" یاسمین نے بتایا تو صفحہ پلٹتے ہوئے اس کا ہاتھ وہیں رُک گیا اور ابھی یہ صورتِ حال کو سوچتے جا رہی تھی کہ یاسمین اس کی طرف جھک کر بولی۔

"اُف.....! کیا بتاؤں تمہیں کیا شخص ہے.....؟ دیکھ کر جھرجھری آ جاتی ہے۔ سچ مجھ سے تو نہیں دیکھا جاتا فوراً منہ موڑ لیتی ہوں۔" اسے جیسے کسی نے سرد خانے میں دھکیل دیا۔ بہت چاہنے اور کوشش کے باوجود یاسمین کو ٹوک نہیں سکی جو باقاعدہ اس کا نقشہ کھینچنے لگی تھی پھر فاتا باس کو آتے دیکھ کر اپنے کام میں مصروف

ہو گئی اور اس سے اب کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاتھوں میں سکت ہی نہیں رہی تھی جو صفحہ سامنے کھلا تھا نظریں اسی پر اِدھر سے اُدھر بھٹکتی رہیں۔ کتنی دیر گزر گئی۔ چپڑاسی چائے لے آیا وہ بھی پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور اسی بات نے یاسمین کو چونکایا۔ کیونکہ چائے کے معاملے میں وہ ذرا تکلف نہیں کرتی تھی جیسے ہی آتی فوراً کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیتی۔

"خیریت.....؟ یہ تمہاری چائے کیسے رکھی رہ گئی.....؟" یاسمین نے کہتے ہوئے اسے دیکھا پھر اس کے گم صم انداز پر اس کا ہاتھ ہلا کر پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا ہے.....؟ تم ٹھیک تو ہو.....؟" اس نے ایسے ہی انداز میں ذرا سا اثبات میں سر ہلا دیا۔

"نہیں.....! مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"میں ٹھیک ہوں.....!" اس نے گہری سانس کھینچی پھر قصداً مسکرا کر بولی۔

"مجھے تمہاری باتوں نے چکرا دیا تھا۔"

"پھر تو تم فوراً گھر چلی جاؤ کیونکہ اسے دیکھ کر تو تمہارا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

"بکواس.....!" اس نے ناگواری سے ٹوکا پھر کمپیوٹر پر ڈسک لگا رہی تھی کہ انٹرکام پر باس کا بلاوا آ گیا۔

وہ ڈسک یاسمین کو تھما کر باس کے کمرے میں آ گئی اور انہوں نے بھی وہی کہا۔

"ابھی آپ کی دو دن کی چھٹی باقی تھی۔"

"یس سر.....! لیکن اب مجھے چھٹی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھی بات ہے..... بیٹھیں.....!" وہ بیٹھ گئی تو کہنے لگے۔

"مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ نے آغا کو گھر سے باہر نکلنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ آفس آنے لگا ہے اور گو کہ ابھی لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ کھنچا کھنچا سا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گا۔"

"جی.....!" ان کے خاموش ہونے پر اسے یونہی کہنا پڑا۔

"اور ہاں.....! میں آپ کے آفس ورک سے بھی بہت خوش ہوں۔ بہت جلدی سیکھ لیا آپ نے اب آپ....." دروازہ کھلنے سے ان کی بات اُدھوری رہ گئی اور وہ ادھر دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

"آؤ آغا.....! ابھی میں تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا۔"

(اُف!)۔ اس کا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سچ مچ اسے لگا جیسے ابھی اس کا ساتھ چھوڑ جائے گا۔

"کس سلسلے میں.....؟" وہ کہتا ہوا اسی جگہ جا بیٹھا جہاں اوّل روز جب وہ انٹرویو کے لئے آئی تھی تو باس نے اسے بٹھایا تھا اور بیٹھتے ہی نظر اس پر پڑی تو اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ پھر اسی انداز میں رُک کر بولا۔

"آ..... آپ.....! سنی کی ٹیچر۔"

"سنی کی نہیں تمہاری.....!" ہر دو کی کیفیت سے بے خبر باس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ کاش وہ اتنی باہمت ہوتی کہ انہیں مزید کچھ کہنے سے روک سکتی اور اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ دھند کے اس پار وہ شخص اپنے باپ سے تفصیل سنتے ہوئے سناٹے میں نظر آ رہا تھا اور واقعی یہ ستم ظریفی تھی کہ جب جذبے اپنا آپ منوا چکے تھے۔ باس وہی پرانی کہانی لے بیٹھے تھے۔ وہ بمشکل تمام خود کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور

کرسی پر گرتے ہی وہ دوپٹے کے پلو سے پلکوں تک آئی نمی صاف کرنے لگی۔

''کیا ہوا ربیعہ......؟'' یاسمین نے نرمی سے پوچھا تو وہ عاجزی سے بولی۔

''مجھے اس وقت نہیں چھیڑنا ورنہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں گی۔''

یاسمین کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ رونے نہ لگے، اپنے کام میں مصروف ہوگئی اور وہ اس بری طرح بکھر گئی تھی کہ خود کو سمیٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ کاش وہ کل ہی آغا کو ساری حقیقت بتا دیتی۔ کتنا فرق پڑتا اس کے نہ بتانے اور باس کے بتانے سے۔ گو کہ حقیقت تو وہی تھی جو باس اسے بتا رہے تھے لیکن اس میں اس کے جذبے شامل نہیں تھے اور اب دکھ صرف اس بات کا نہیں تھا کہ وہ کبھی اسے یقین نہیں دلا سکے گی زیادہ دکھ پھر اس کا تھا کہ وہ بے اعتبار ہوگیا تھا، صرف اس کا بلکہ کبھی کسی کا یقین نہیں کرے گا۔ کتنی دیر بعد یاسمین نے پھر اسے دیکھا وہ اذیتوں کے پل صراط عبور کرتی نظر آ رہی تھی۔ تب اس نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

''سنو......! ایسا کرو تم گھر چلی جاؤ۔''

''نہیں......!'' وہ بتا چونکے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی اور اس سے پہلے کہ یاسمین اپنی بات دہراتی وہ ان کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ یاسمین نے فوراً اپنی نظریں اسکرین پر جما دیں۔ انداز سے ظاہر تھا کہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی اور وہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن پلکیں اٹھا کر نہیں دیں اور وہ پتا نہیں کیا سوچ کر آیا تھا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر یاسمین سے پوچھنے لگا۔

''کیا ہو رہا ہے......؟''

''سر! یہ باس نے کچھ لیٹرز بھجوائے تھے وہ۔'' اتنی بولڈ ہونے کے باوجود پتا نہیں کیوں یاسمین بوکھلا گئی۔

''اور یہ آپ کے ساتھ کون ہیں......؟''

''ربیعہ......! سر یہ چھٹی پر تھیں آج آئی ہیں۔'' یاسمین نے پیپر ویٹ کے نیچے رکھے کاغذات میں جانے کیا تلاش کرتے ہوئے جواب دیا تو وہ ایک دم ٹیبل پر اپنے دونوں ہاتھ جما کر قدرے آگے جھکتا ہوا بولا۔

''مس یاسمین......! ادھر دیکھیں۔''

''جی......!'' یاسمین نے ٹپٹا کر دیکھا لیکن پھر فوراً نظروں کا زاویہ بدل لیا تو وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

''ڈریں نہیں......! میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ نقصان تو وہ پہنچاتے ہیں جو بظاہر سادہ اور معصوم نظر آتے ہیں...... کیوں مس ربیعہ......؟'' اچانک اس کی طرف مڑا اور وہ جو اسے ہی دیکھ رہی تھی اس کی اچٹتی ہوئی نظروں سے کٹ کر رہ گئی۔

''او کے......! سی یو......!'' وہ ایسے ہی چبھتے ہوئے لہجے میں کہہ کر چلا گیا تو یاسمین جھرجھری لے کر بولی۔

''کہیں تم سچ مچ مر تو نہیں گئیں......؟''

''مرنا اپنے اختیار میں کہاں......؟'' اس کا انداز اور لہجہ کھویا کھویا تھا۔

''ہائیں......؟'' یاسمین بے حد حیران۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولی۔

''کون سی دنیا میں ہو......؟''

''اسی دنیا کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے گہری سانس کھینچ کر اپنے اندر کی آزردگی کم کرنے کی کوشش

کی پھر ہلکے سے بڑبڑائی۔

''ٹھیک یو گاڈ......! فار ایوری تھنگ۔'' پھر روزانہ تو وہ تین بجے آفس سے نکل جاتی تھی اس کے بعد باس کے گھر جانا ہوتا تھا لیکن اس روز وہ تین بجے کے بعد بھی بیٹھی رہی کیونکہ اس کے خیال میں اب اس کا کام ختم ہوگیا تھا۔ دو ایک بار یاسمین نے ٹوکا بھی کہ اس کی چھٹی کا وقت ہوگیا ہے اور وہ بس ہوں ہاں کر کے رہ گئی۔ آخر یاسمین نے جھنجلا کر پوچھا۔

''کیا باس نے تمہارا ٹائم بڑھا دیا ہے......؟''

''آخر تمہیں میرے بیٹھنے سے تکلیف کیا ہے......؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''لو...... میں تو ایک بات پوچھ رہی ہوں۔ میری بلا سے قیامت تک یہیں بیٹھی رہو۔'' یاسمین نے برا مان کر اس کی طرف سے رخ موڑ لیا تب احساس ہونے پر وہ فوراً اس کا بازو تھام کر بولی۔

''سوری یار......! اصل میں میں......''

''بس......! اس وقت مجھے نہیں چھیڑو ورنہ میں تمہارا حشر خراب کر دوں گی۔'' یاسمین نے اس کی بات دوسرے انداز میں لوٹائی تو وہ ہنس پڑی۔

''ٹھیک ہے نہیں چھیڑوں گی...... بس اتنا بتا دو ناراض تو نہیں ہو ناں......؟''

یاسمین نے گھورنے پر اکتفا کیا۔ تب وہ اپنا بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلتی ہوں...... باس سے کہوں گی میرا کمیں اور انتظام کر دیں۔ تمہیں میرا وجود برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکلی تو سوچا باس سے پوچھ لے کہ اب اس کے لئے کیا حکم ہے۔ ان کے کمرے میں آئی تو وہ موجود نہیں تھے اور ان کے پی اے سے معلوم ہوا کہ وہ سائٹ پر گئے ہیں۔ تب اگلے دن پر ٹالتی ہوئی وہ باہر آگئی۔ گو کہ دھوپ میں شدت نہیں تھی لیکن گرمی عروج پر تھی اور آج تو اسے گھر جانا تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی ساڑھے تین ہو چکے تھے۔ پہلا خیال یہی آیا کہ جلدی جانے پر اماں ٹوکیں گی لیکن اب وہ کیا کر سکتی تھی۔ کہیں ادھر ادھر بیٹھ کر تو وقت گزارنے سے رہی۔ لہٰذا سر جھٹک کر اسٹاپ کی طرف چل پڑی اور ابھی چند قدم ہی بڑھی تھی کہ آغا نے گاڑی اس کے بالکل قریب آن روکی اور باقاعدہ اتر کر بولا۔

''آیئے ٹیچر......! آج سے آپ کو لے جانے کی ذمہ داری میری۔'' وہ اسے دیکھ کر ہی گھبرا گئی تھی۔ اس کی بات پر تو پریشان ہوگئی۔ بمشکل تھوک نگل کر بولی۔

''نہیں......! میں چلی جاؤں گی۔''

''لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا کہ میں تو گاڑی سے جاؤں اور میری ٹیچر......''

''میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔'' اسے ٹوک کر بتانا پڑا۔

''کیوں......؟ میرا مطلب ہے یہ وقت تو آپ کا میرے لئے مخصوص ہوتا ہے یا آپ کے خیال میں اب مجھے ٹیچر کی ضرورت نہیں رہی۔'' بظاہر کتنے ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی اپنے اندر کیا آتش فشاں لئے کھڑا ہے اور وہ ہرگز بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ خود کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے دور سے آتی بس کو دیکھنے لگی۔ تب اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے وہ قدرے تحکم سے بولا۔

"بیٹھ جائیں...... ! مجھے ابھی آپ کی ضرورت ہے۔ آئی مین ٹیچر کی جو مجھے دُنیا کا سامنا کرنا سکھا سکے۔"
لگتا تھا سارے حساب بے باق کر دے گا۔ تھوڑی کوشش سے وہ خود کو سہارا دینے میں کامیاب ہو گئی تو براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"سوری...... ! آپ اپنے لئے کسی اور ٹیچر کا انتظام کر لیں۔"

"کہاں ملے گی ایسی ٹیچر جو مجھے، میری آنکھوں میں دیکھ کر بات کرے؟" وہ ذرا سا سر اونچا کر کے ادھر اُدھر نظریں جھکاتے ہوئے بولا تو اسے لگا وہ کہیں ڈھے جائے گی۔ پھر قدرے توقف سے اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"بہر حال...... ! جب تک دوسری ٹیچر کا انتظام نہیں ہوتا تب تک تو آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا ورنہ ممکن ہے میں دوبارہ اپنی اس تنہا دُنیا میں لوٹ جاؤں۔"

وہ سمجھ گئی کہ وہ ہر گز اسے نہیں بخشے گا جب ہی ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے...... ! آپ چلیں میں ابھی آ رہی ہوں۔"

"آ رہی ہوں سے کیا مطلب...... ؟ گاڑی میں بیٹھیں ورنہ......" وہ غالباً اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا اور اس کا ارادہ بھانپ کر وہ خود ہی جلدی سے بیٹھ گئی۔ پھر اپنی طرف کا شیشہ اُتارتے ہوئے پہلی بار اس نے غور کیا کہ گزرتے ہوئے لوگوں کی نظریں آغاز کے بعد فوراً اس پر ٹھہرتی ہیں اور ان نظروں میں ترحم، تاسف، تمسخر اور جانے کیا کچھ ہوتا ہے۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔ پتا نہیں سب کیا سمجھ رہے تھے اور اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ بہت اطمینان سے بیٹھا اور دھیمی رفتار سے ڈرائیو کرنے لگا۔ وہ سخت اُلجھن میں گرفتار ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے کتنے آوارہ لڑکوں نے اسے انتہائی واہیات ناموں سے پکارا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ ہی گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی تب اندر ہی اندر بڑبڑ ہو کر وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"اگر اسی رفتار سے چلتے رہے تو پانچ تو راستے میں بج جائیں گے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"کیوں......؟"

"کیونکہ آپ مجھے گھر سے نکلنے پر آمادہ کر چکی ہیں اب یہ بتایئے ان لوگوں کو میں کیسے فیس کروں جو مجھے چونک کر دیکھتے ہیں...... ؟ پھر مختلف ناموں سے پکارتے ہوئے گزر رہے ہیں۔"

"میرے خدا......!" وہ اس کا دُکھ محسوس کر کے بے اختیار رو پڑی۔

"ارے......!" وہ ذرا سا ہنسا۔

"یہ سب آپ کو تو کچھ نہیں کہہ رہے......؟"

"بس کریں آغا...... ! مجھے یہیں اُتار دیں۔" وہ سسک کر بولی تو اس نے گاڑی ایک طرف کر کے روک دی۔ وہ یہی سمجھی اس کے اُترنے کے لئے روکی ہے جب ہی دروازہ کھولنے لگی لیکن اس نے ایک بار پھر اسی طرح اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور قدرے رُک کر تلخ لہجے میں بولا۔

"دیکھ لیا آپ نے...... ! کیسے کیسے زخم لگاتے ہیں لوگ...... ؟ لیکن خدا کی قسم رہبہ...... ! کبھی کسی زخم سے اتنی ٹیس نہیں اُٹھی جتنی ٹیس آپ کے لگائے ہوئے زخم سے اُٹھی ہے۔"

وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔

"میرے ساتھ اتنا بھیانک مذاق کیوں کیا آپ نے...... ؟ اگر مجھے دوبارہ اسی اندھیر نگری میں دھکیلنا تھا تو میرے راستے میں چراغ کیوں جلائے...... ؟ یا میں ہی حد درجہ نادان تھا جو ان چراغوں کی لو آپ کی آنکھوں میں دیکھ کر کچھ اور سمجھ بیٹھا۔ نہیں رہبہ...... ! آپ کو کم از کم میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا...... ؟"

وہ اسی سناٹے میں تھی کہ آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو کر پلکوں سے چھلکنے لگا تو وہ ایک دم خاموش ہو کر ہونٹ بھینچ گیا۔ کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے اور جانے شکستگی کے احساس نے اسے بولنے نہیں دیا یا اس کی حالت کے پیش نظر اس نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس پر سے نظریں ہٹا کر سیدھا بیٹھا تو گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"چلیں...... ! آپ کو گھر چھوڑ دوں...... راستہ بتائیں۔"

وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ اشارے سے گاڑی بیک کرنے کو کہا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر سامنے دیکھنے لگی، پھر تمام راستہ جہاں مڑنا ہوتا وہ اشارہ کر دیتی اور گھر کے سامنے بھی رُکنے کا اشارہ کیا تو وہ بھی خاموشی سے اس کے اُترنے کا انتظار کرنے لگا لیکن اُترنے سے پہلے اسے گویا گویائی مل گئی۔

"آئی ایم سوری آغا...... ! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری ذات کسی کی دل آزاری کا باعث بنے گی۔ آپ کو جو تکلیف ہوئی اس کے لئے میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گی۔" اس کے ساتھ ہی وہ اُتر کر اندر چلی گئی۔ اس نے بہت خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر گاڑی بیک کرتے ہوئے جانے کس خیال کے تحت بولا تھا۔

"ٹھیک ہو رہبہ......؟"

اور وہ بے حد مضمحل اور بہت ہاری ہوئی سی اندر آئی تھی۔ اماں ننھے عذیر کو گود میں لئے اسی کی زبان میں بول رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ دوسرے پلنگ پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی جبکہ دھیان مسلسل اسی کی طرف تھا جو ایک اس کا غم دل میں بسا کر باقی سارے غموں سے بے پرواہ ہو گیا تھا اور اچانک اسے لگا وہ پھر غلطی کر گئی ہے۔ ابھی بھی اس سے کہہ دیتی کہ اس کی آنکھوں میں جلتے چراغوں کی لو دیکھ کر جو وہ سمجھا وہی سچ ہے۔

"ہائیں...... ؟ تم کب آئیں......؟" نبیلہ نے اندر آتے ہوئے اسے دیکھ کر پوچھا تو وہ اپنے خیال سے چونک کر بولی۔

"ابھی آئی ہوں۔"

"چائے پیئو گی......؟"

"اگر بنی ہوئی ہے تو دے دیں بلکہ میں خود لے لیتی ہوں۔" وہ اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔ کیتلی میں چائے گرم تھی۔ وہ کپ میں ڈال کر وہیں بیٹھ گئی اور پھر سے اسے سوچنے لگی تو وہ جیسے سامنے آن کھڑا ہوا۔

("آپ کریں گی مجھ سے شادی......؟" اُف......!)۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں تب بھی وہ موجود تھا۔

("جواب دیں رہبہ...... ! میرے ساتھ چل سکتی ہیں......؟") اور خود کو مجبور اور بے بس محسوس کر

ہوئے اس نے منہ موڑا تھا۔ بالکل غیر اختیاری عمل تھا اور وہی اس کے دل میں ترازو ہو گیا جب ہی تو کہہ رہا تھا۔ جب آپ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں تو مجھے لیس کوئی نہیں دے سکتا۔ اور وہ ساری مسافتیں اس کے ساتھ طے کر سکتی تھی لیکن وہی اپنی کم مائیگی کا احساس کہ وہ مڈل کلاس کی عام سی لڑکی پھر کچھ مسائل میں گھری ہوئی ہے اور اس کے والدین بھلا کہاں اسے اہمیت دیں گے۔ کاش وہ اسے بتا سکتی کہ اس نے اس کی طرف سے منہ نہیں موڑا تھا بلکہ اپنی مجبوریاں اپنی حیثیت اور کچھ مصلحتوں کو سوچتے ہوئے۔ وہ منہ موڑنے پر مجبور ہوئی تھی۔

(لیکن شاید اب تو وہ یقین بھی نہیں کرے گا......؟)۔ دُکھ سے سوچتے ہوئے اس کی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔

○ ○ ○

پھر اگلے روز باس نے خود ہی اسے گھر جانے سے منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ چھٹیوں کے باعث اپنے والدین کے پاس چلا گیا ہے جبکہ آغا زکو اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پتا نہیں وہ خود آغا کی طرف سے مطمئن ہو کر کہہ رہے تھے یا اس نے یہ بات کہلوائی تھی کہ اسے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ بہر حال نہ صرف حیرت ہوئی تھی بلکہ اسے بے حد دُکھ بھی ہو رہا تھا۔

(ٹھیک تو ہے...... میں محض تنخواہ دار ملازم ہی تو ہوں جہاں ضرورت ہوگی وہیں بھائی جاؤں گی اور جب کہیں ضرورت نہیں ہوگی تو......)۔ دُکھ کے ساتھ اس کے اندر ڈھیروں تلخی بھر گئی۔ اس کا دل چاہا ایک بار باس سے یہ ضرور پوچھے کہ اس کام کے لئے آخر انہوں نے اسی کا انتخاب کیوں کیا تھا......؟ کیا مجبوریاں اس کے چہرے پر لکھی تھیں......؟ لیکن وہ اتنی بھی مجبور نہیں تھی۔ کسی بھی طرح گھر کی گاڑی کو دو تین مہینے مزید کھینچا جا سکتا تھا اور اس عرصے میں وہ کہیں اور جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی لیکن پہلے ہی مقام پر باس نے اس کا گھیراؤ کر کے ایک طرح سے اسے کہیں اور جانے سے روک دیا تھا۔ آپ سمپل بی اے ہیں...... کوئی تجربہ نہیں...... نہ کوئی کام آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ یہیں اُلجھ رہی تھی کہ آخر اس کا گھیراؤ کیوں کیا گیا......؟

''شاید اس لئے کہ میں شکل ہی سے بزدل اور کم ہمت نظر آتی ہوں۔ اپنا نقصان ہونے پر کوئی سوال اُٹھانے کا حوصلہ نہیں مجھ میں۔'' کرسی کی بیک پر سر ٹکائے وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ غالباً اسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور یاسمین کتنی دیر سے اسے نوٹ کر رہی تھی۔ قصداً نہیں ٹوکا کیونکہ وہ کچھ بتاتی ہی نہیں تھی لیکن اب اس کی خود کلامی سن کر خاموش نہیں رہ سکی۔

''اپنے بارے میں تمہاری رائے بالکل ٹھیک ہے۔ شکل ہی سے بزدل اور کم ہمت نظر آتی ہو۔'' یاسمین نے قدرے جلے بھنے انداز میں کہا تو وہ ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم کسی کو اپنا نہیں سمجھتیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ اتنے مہینوں کے ساتھ کے باوجود تم اجنبی بنی ہوئی ہو۔ اگر تمہارے خیال میں میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی تب بھی کہہ لینے سے کم از کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو ہی جاتا ہے...... یا تو تم میرے سامنے پریشان ہونا چھوڑ دو یا صاف بتاؤ کہ تمہارا پرابلم کیا ہے......؟'' یاسمین غالباً بھری بیٹھی تھی باقاعدہ اس کی کلاس لے ڈالی۔

''کبھی روتی شکل بنا کر بیٹھ جاتی ہو...... کبھی گم صم...... اور دھیان تو تمہارا مسلسل کہیں اور رہتا ہے۔ اگر اس طرح کام کرو گی تو بہت جلد تمہاری چھٹی ہو جائے گی...... سمجھیں تم......؟''

''جی نہیں...... ! باس تو میرے کام کی تعریف کر رہے تھے۔''

''جناب...... ! اسے اپنی نہیں میری تعریف سمجھو اور دعائیں دو مجھے کہ تمہارا سارا غلط صحیح کر کے بھیجتی ہوں۔'' وہ پھر ایک دم خاموش ہو کر یاسمین کو دیکھنے لگی تو وہ تپ کر بولی۔

''بس...... ! ایک تو تم پل میں حواس کھو بیٹھتی ہو۔ ذرا سا اور بولوں گی تو رونے لگو گی۔ کچھ انسان بنو رہیو...... ! اگر کسی مجبوری کے تحت گھر سے نکلی ہو تو حالات کا مقابلہ کرنا سیکھو۔ ہمیشہ یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دینا کہ میں تو ہوں ہی بزدل اور کم ہمت، عقلمندی نہیں ہے۔'' اس نے اسی خاموشی سے سر جھکا لیا تو یاسمین کو غصے کے باوجود اس پر رحم آ گیا۔ کچھ نرم پڑ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''اگر تمہارے ساتھ کسی نے زیادتی کی ہے تو مجھے بتاؤ۔ ایمان سے سر توڑ دوں گی اس کا۔''

''نہیں تو...... ! میرے ساتھ کون زیادتی کرے گا بھلا......؟''

''ہاں...... ! تمہیں دیکھ کر تو سب کی پدرانہ شفقت جاگ اُٹھتی ہے۔'' جس بے ساختگی سے یاسمین نے کہا ایسی ہی بے ساختہ اس کی ہنسی تھی۔

''واہ...... ! کیا خوبصورت ہنسی ہے۔ کبھی راستے میں مت ہنسنا۔''

اور اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ یاسمین کی بات پر نہیں بلکہ گلاس وال سے پرے آغا جہانگیر کو دیکھ کر وہ جانے کب سے وہاں کھڑا تھا۔ نظریں اس پر ہی تھیں لیکن جیسے ہی اسے دیکھتے پایا فوراً پہلے نظروں کا زاویہ بدلا پھر ذرا سا رخ موڑا اور پھر باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا پھر یاسمین کو دیکھ کر بولی۔

''ٹھیک ہے یاسمین...... ! تم نے میری بہت مدد کی باوجود اس کے کہ تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔''

''مجھے واقعی تم سے ہمدردی نہیں ہے بس ہمیشہ تمہارے گھر والوں کا خیال آیا۔ ویسے تمہارے گھر میں کون کون ہے......؟'' یاسمین نے بڑی خوبصورتی سے اس کا گھیراؤ کر لیا وہ واقعی جاننا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ پرابلم کیا ہے......؟

''اماں، بھابی ان کی گود میں چند ماہ کا بچہ اور میں۔'' اس نے بتایا تو یاسمین سوچتے ہوئے بولی۔

''بھابی کی گود میں چند ماہ کا بچہ ہے اور تمہارے بھیا کہاں ہیں......؟''

''ساری پریشانی بھیا کی طرف سے ہی تو ہے۔'' اس نے بھی جیسے موقع غنیمت جانا۔ اپنی پریشانیوں بلکہ دُکھوں کا رخ بھی بھیا کی طرف موڑ دیا۔ مختصر صورت حال کہہ سنائی۔ جسے سن کر یاسمین افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''واقعی یہ تو خاصی پریشانی کی بات ہے۔ پردیس کا معاملہ ہے وہاں وہ اکیلا بیچارہ، یہاں تم لوگ بے بس۔''

''کیا کریں......؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''ہیں کہاں......؟''

''ملائیشیا میں۔''

''ملائیشیا......؟'' یاسمین کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں اسے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

''میرے ایک چچا ملائیشیا میں رہتے ہیں۔ ایسا کرو تم اپنے بھائی کا نام اور جس پتے پر انہیں خط لکھتی ہو، وہ لکھ دو پھر میں چچا کو خط لکھتی ہوں۔ شاید وہ کچھ کر سکیں۔''

''تمہارے سگے چچا ہیں......؟'' ایک کاغذ پر بھیا کا نام اور پتہ لکھتے ہوئے اس نے یونہی پوچھ لیا پھر کاغذ اسے تھماتے ہوئے بولی۔

''ایمان سے اگر یہ کام ہو جائے تو میں تمہارا......''

''بس بس......! زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' یاسمین کے ٹوکنے پر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

○ ○ ○

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس نے اماں اور نبیلہ کو بھی بتا دیا تھا کہ یاسمین اپنے چچا کے ذریعے بھیا کی رہائی کی کوشش کر رہی ہے اور اسی روز سے وہ دونوں کسی اچھی خبر کی منتظر رہنے لگی تھیں۔ نبیلہ تو باقاعدہ دن گننے لگی تھی کہ فلاں تاریخ کو یاسمین نے خط لکھا جو فلاں تاریخ تک پہنچے گا اس کے بعد جوابی تاریخ۔ لیکن اس کے اندر کی اُداسی جوں کی توں تھی کیونکہ اس روز کے بعد سے اس نے آغا کو نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں اس نے آفس آنا کیوں چھوڑ دیا تھا......؟ اور جب یہ خیال آتا کہ کہیں اس نے پھر سے تو خود کو گھر تک محدود نہیں کر لیا، اس کا دکھ سوا ہو جاتا۔ کتنی بار سوچا یاسمین سے پوچھے لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اگر انہیں پتا ہوتا تو خود سے بتاتے اس کے پوچھنے پر پتا نہیں کیا سمجھیں یہی سوچ کر رہ جاتی اور کبھی خود کو ٹوکتی کہ جب اسے اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تو پھر وہ کیوں اس کے بارے میں اتنا سوچتی ہے لیکن یہ اس کے اختیار میں کب تھا۔ ساری سوچوں پر پہرے بٹھا سکتی تھی ایک اس کے خیال سے دامن بچانا مشکل تھا۔

○ ○ ○

دن بڑے بوجھل بڑے بے کیف سے گزر رہے تھے دل کا موسم اچھا نہ ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا اس کے ساتھ یہی معاملہ تھا یوں لگتا جیسے سارے جہاں پر اُداسیوں کا راج ہو ایسے میں اگر کوئی راستے میں بھی ہنستا ہوا نظر آتا تو وہ چونک کر دیکھنے لگتی اس روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بظاہر سرسری انداز میں یاسمین سے کہہ دیا۔

''سنو......! اتنے دنوں سے آغا جہانگیر نظر نہیں آئے۔''

''نام مت لو...... افسانوی ہوٹل کے جن کی طرح حاضر ہو جائیں۔'' اپنے تئیں یاسمین نے اسے ڈرایا لیکن وہ بڑے آرام سے بولی۔

''ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے......؟''

''بڑی بہادر بن رہی ہو...... اس روز تو اسے دیکھ کر کہہ رہی تھیں کہ مجھے مت چھیڑنا ورنہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں گی۔'' یاسمین نے اس کی نقل اُتاری تو وہ حیران ہو کر بولی۔

''یہ میں نے آغا کو دیکھ کر کہا تھا......؟''

''اور کیا......؟ اسی وقت تم باس کے کمرے سے آئی تھیں اور وہ بھی وہیں موجود تھا۔ پھر یہاں آیا تب بھی تمہاری سٹی گم ہو گئی تھی۔'' یاسمین جو بھی اسی حساب سے کہہ رہی تھی۔ تب وہ ذرا سا ہنسی۔

''اچھا......! مجھے یاد نہیں ہے۔ بہرحال ہیں کہاں وہ......؟''

''سنا ہے باہر چلے گئے ہیں۔''

''کیا......؟'' وہ جیسے تپتی دھوپ میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ کس قدر تپش تھی۔ تن من سب جلنے لگا تھا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے......؟ بڑے لوگ ہیں دُنیا ان کی مٹھی میں......'' یاسمین اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اپنی کہے گئی اور وہ کب سن رہی تھی۔ اس کے اندر یہاں وہاں سناٹا ہی سناٹا تھا۔ بس کہیں ہلکی سی آواز تھی۔ جب آپ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں تو سمجھ لیں کوئی نہیں دے سکتا۔

(تو کیا وہ مایوس ہو کر چلا گیا؟) اچانک ہی خیال آیا اور دل میں ایسا درد اُٹھا کہ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''کہاں جا رہی ہو......؟'' یاسمین نے اسی مصروف انداز میں پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہاں سے نکل کر واش روم میں آ گئی۔ بس تنہا ہونے کی دیر تھی آنکھوں کے پیمانے یوں چھلکے کہ اسے بند باندھنا مشکل ہو گیا۔ کتنی دیر تک وہ مسلسل ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی رہی پھر واش بیسن کا نل کھول کر پانی کے چھینٹے مارے۔ آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا اپنے ساتھ اسے بھی بہا لے جائیں گے بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا پھر آئینے میں دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ایسی حالت میں یاسمین کا سامنا کرنا اور مشکل لگ رہا تھا۔ مختلف بہانے سوچتی ہوئی واپس آئی تو یاسمین موجود نہیں تھی اس نے شکر کا سانس لیا اور جلدی سے ایک کاغذ پر اپنی اچانک طبیعت خرابی کی چند لائنیں گھسیٹ کر اس کے پیپر ویٹ کے نیچے دبایا پھر بیگ اُٹھا کر باہر نکل آئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو ماحول کا رنگ روزانہ سے مختلف نظر آیا نبیلہ برآمدے میں کھڑی عذیر کو ہاتھوں پر اچھالتے ہوئی اس کے ساتھ خود بھی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی اور اماں کچن میں غالباً سوجی بھون رہی تھیں۔ جس کی مہک پورے آنگن میں پھیلی تھی اور وہ ذہنی طور پر اتنی اپ سیٹ تھی کہ خود سے کچھ قیاس نہیں کر سکی۔ نبیلہ کے قریب آئی اور اس سے پہلے کہ کچھ پوچھتی وہ اسے دیکھ کر تشویش سے بولی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے......؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے بے اختیار ہتھیلیوں سے آنکھیں ڈھانپ لیں۔ جو سارے راز افشا کر رہی تھیں۔

''آؤ......! اندر چل کر لیٹو۔'' نبیلہ نے عذیر کو ایک بازو میں لیا اور دوسرا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اندر لے آئی تو اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اماں کہاں ہیں......؟''

''حلوہ بنا رہی ہیں۔''

''آج کوئی خاص دن ہے کیا......؟''

''تمہارے لئے تو خاص ہی ہے۔'' نبیلہ کی شوخی پھر لوٹ آئی۔ فوراً لفافہ لا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ سمجھ گئی بھیا کا خط ہے۔ نکال کر پڑھنے لگی انہوں نے لکھا تھا کہ ایک نیک دل پاکستانی کی مدد سے وہ رہا ہو گئے ہیں اور ابھی فی الحال اسی کے ساتھ رہ رہے ہیں گو کہ ابھی بھی ان کا قیام غیر قانونی ہے لیکن بہت جلد وہ اسی شخص کی مہربانی اور کوشش سے وہیں کا پاسپورٹ بنوا لیں گے۔ اس کے بعد وہ جب تک چاہیں وہاں رہ سکتے ہیں اور

بہت زیادہ عرصہ تو نہیں پھر بھی ایک دو سال ضرور رہیں گے۔ پھر ان سب کو تسلی دی تھی کہ اب ان کی طرف سے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے اور یہ کہ ملازمت ملتے ہی خرچ کے لئے رقم بھیج دیں گے اور واقعی یہ خوشی کی بات تھی۔ نبیلہ کھلکھلا رہی تھی۔ اماں میٹھا بنانے میں لگی تھیں اور وہ کیا کرے جس کا دل ابھی بھی خاموش تھا۔ خط بند کر کے دوبارہ لفافے میں رکھا پھر نبیلہ کو دیکھ کر بمشکل مسکرا سکی۔

"مبارک ہو بھابی...... ! اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔" تبھی اماں حلوہ لیے اندر چلی آئیں۔ اسے دیکھا تو تعجب سے پوچھا۔

"تم اتنی جلدی کیسے آ گئیں......؟"

"طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔"

"چلو اچھا ہوا آ گئیں...... بھائی کا خط پڑھا تم نے......؟"

اماں کس قدر خوش نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گہری سانس کے ساتھ ہاں کہا پھر ان کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر ایک چمچ منہ میں ڈالا اور پلیٹ نبیلہ کو تھما کر لیٹ گئی۔

"بخار ہو رہا ہے کیا......؟" اماں نے تشویش ظاہر کی۔

"ہاں...... ! کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"ابھی تو ڈاکٹر ہوگا...... دوا لے آؤں کیا......؟"

"نہیں...... ! شام میں دیکھیں گے بس اب میں سو رہی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی کروٹ بدل گئی۔ تھکا ہوا ذہن تھا پھر آنکھیں بھی بھاری ہو رہی تھیں۔ جب ہی جلدی نیند آ گئی۔

پھر شام سے پہلے یاسمین کے آنے پر اماں نے اسے اٹھا دیا۔ اس وقت اس کا جسم بری طرح تپ رہا تھا۔ شاید اندر کی تپش نے باہر کی راہ دیکھ لی تھی۔ چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا اور یاسمین جانے کیا سوچ کر اور کس موڈ میں آئی تھی اسے دیکھ کر واقعی پریشان ہو گئی۔

"تمہیں اچانک کیا ہو جاتا ہے......؟ صبح تو اچھی بھلی تھیں۔"

(میں کب اچھی بھلی تھی......؟) اس نے سوچا پھر اسے دیکھ کر قصداً مسکرا کر بولی۔

"بس...... ! جب کام کرنے کو دل نہیں چاہتا تو بیمار ہو جاتی ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔" یاسمین نے کہا تو اس کی ذہنی رو بہک گئی۔

"اب آپ کہیں گی یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"کیا اچھا ہے کیا برا۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔" وہ اسی کی بات یاد کرتے ہوئے بے دھیانی میں دہرا رہی تھی کہ یاسمین اس کے جانتا کہنے پر زور سے ہنسی اور اس کے چونک کر دیکھنے پر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"یہ تم جانتا کب سے ہو گئیں......؟"

"جانتا......؟" وہ اپنی بات پر غور کرتے ہوئے بولی۔

"رانجھا رانجھا کردی میں آپے ہی رانجھا ہو گئی۔"

"ہاں آں...... ! یہی میں تم سے پوچھنے آئی ہوں کہ کون ہے رانجھا......؟ اور کہاں ہے......؟" یاسمین

نے ہاں کو اس انداز سے لمبا کھینچا جیسے اس پر جتا رہی ہو کہ وہ واقعی اسی مقصد سے آئی ہے اور وہ بغیر چونکے بولی۔

"پتا نہیں کہاں ہے......؟"

"دیکھو...... ! مجھ سے چھپانے کی کوشش مت کرو۔ آج تمہارے آنے کے بعد سے میں مسلسل تمہارے بارے میں سوچتی رہی ہوں کہ آخر تمہیں بیماری کیا ہے......؟ بیٹھے بیٹھے گم ہو جانا...... کام سے لاپرواہی...... بات بے بات پلکیں نم کر لینا اور یہ ساری باتیں ایک ہی بیماری کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ ہے عشق...... ہے نا......؟"

یاسمین بڑے یقین سے کہہ کر تائیدی نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تو وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی لیکن ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھو۔" بڑی عاجزی تھی اس کے لہجے میں یاسمین نے ٹھٹک کر دیکھا پھر اس کا ہاتھ دبا کر بولی۔

"چلو...... ابھی نہیں پوچھتی۔" تبھی نبیلہ چائے لے کر آئی تو اسے دیکھ کر یاسمین پوچھنے لگی۔

"تمہارے بھیا کا کوئی خط وغیرہ آیا......؟"

"ہاں...... ! آج ہی آیا ہے۔" اس نے کہا پھر ساری تفصیل بتا کر احسان مندی سے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑی۔

"بس...... ! میں نے کچھ نہیں کیا...... ایک خط ہی تو لکھا تھا چچا کو...... دنیا کے سارے کام ایسے ہی تو ہو رہے ہیں بس ایک خط لکھا جاتا ہے۔ کسی کو رہائی ملتی ہے...... کسی کو اسیری...... کسی کو نوکری اور......" یاسمین نے بھرپور قہقہہ لگایا پھر اسے چھیڑ کر بولی۔

"عقلمند ہوتی جا رہی ہو۔"

"تمہاری صحبت کا اثر ہے۔"

"میری یا......" نبیلہ کی موجودگی کے باعث اس نے فوراً بات بدل دی۔

"اچھا خیر...... ! اب تم جلدی سے ٹھیک ہو کر آفس آؤ کیونکہ میں تمہاری اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔"

"لیکن میں تو جاب چھوڑنے کا سوچ رہی ہوں۔"

"ہائیں......؟ ابھی تو میں نے تمہیں عقلمند کہا ہے پھر یہ بے وقوفی کی باتیں کرنے لگیں۔ خبردار...... ! گھر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" یاسمین نے پہلے اسے ڈانٹا پھر سمجھاتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہ کرنے سے کچھ کرتے رہنا اچھا ہوتا ہے۔ یہ مت سوچو کہ اب بھیا کی نوکری لگ جائے گی تو تم آرام سے بیٹھ جاؤ گی۔ مجھے دیکھو میرے ماشاءاللہ چار بھائی ہیں۔ سب اچھا کماتے ہیں اور مجھے ماہانہ جیب خرچ بھی دیتے ہیں پھر بھی میں جاب کر رہی ہوں آخر گھر بیٹھ کر کیا کروں......؟"

"ٹھیک ہے...... ! پھر میں کوئی اور جاب تلاش کروں گی۔" اس نے کہا تو یاسمین چونک کر بولی۔

"کیا مطلب......؟ یہاں کیا تکلیف ہے تمہیں......؟" پھر وہ خود ہی قیاس کر کے بولی۔

"میرا خیال ہے تم آغا جہانگیر سے ڈر گئی ہو......؟"

"بکواس......!" وہ چڑ گئی۔

"تم نے آغا کو ہوا بنا لیا ہے...... انسان ہے وہ...... اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم ہر وقت اس کا مذاق اُڑاتے رہیں۔"

"اُفوہ...... ! میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا۔"

"اسے بھی مت کہو...... مجھے دُکھ ہوتا ہے۔" یاسمین خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر کندھے اُچکا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا...... ! میں چلتی ہوں اور تم بھی فوراً ٹھیک ہو کر آفس آ جاؤ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔" وہ شاید سمجھ گئی تھی خاصی مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئی تو بیک سے کمر ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آغا کا نہیں اس کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔ تب اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ اتنے سے وقت میں وہ کتنا فاصلہ طے کر آئی تھی کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا محال لگ رہا تھا۔

پھر دو دن بعد سے اس نے دوبارہ آفس جانا شروع کر دیا تو وہ وہی روٹین شروع ہو گئی۔ لیکن اب اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ گو کہ اس نے آغا کو دو تین بار ہی آفس میں دیکھا تھا پھر بھی اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ یوں جیسے وہ اوّل روز سے اس کے ساتھ رہا ہو اور اب اچانک کہیں چلا گیا اور ایسا تھا تو لیکن آفس میں تو اس کا ساتھ نہیں تھا۔

یاسمین کو اس نے "الف" سے "ے" تک سب بتا دیا تھا اور اب اس کی گالیاں ہی سننے کو ملتیں۔ پھر روزانہ وہ اسے سمجھانا اپنا فرض سمجھتی۔

"تم جیسی احمق لڑکی میں نے اپنی زندگی میں پہلے کہیں نہیں دیکھی۔ آغا سے ہمدردی تو کی جا سکتی ہے محبت نہیں...... چھوڑ دو اس کا خیال...... تمہارے لئے کمی نہیں ہے۔" وہ جانتی تھی جو بھی سنے گا یہی کہے گا اور اسے خود پر اختیار نہیں تھا جبھی یاسمین کی باتیں بس سن لیتی، جواب میں ایک لفظ نہیں کہتی تھی۔

یونہی دن گزرتے چلے گئے۔ اب تو گھر کی طرف سے بھی کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ بھیا جاب سے لگ چکے تھے اور انہوں نے ڈرافٹ بھی بھجوایا تھا اور اماں نے جو پہلے مجبوری کے تحت اسے جاب کرنے کے لئے کہا تھا اب چھوڑنے کو کہتیں لیکن اب وہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ بقول یاسمین گھر بیٹھ کر کیا کرنا ہے۔ وہ بھی یہی سوچتی کہ فراغت سے تو وقت کاٹے نہیں کٹے گا اس سے مصروفی اچھی کہ کسی طور وقت گزر رہا تھا۔

انہی دنوں یاسمین کی شادی طے پا گئی۔ وہ خود نہ صرف حیران تھی بلکہ بڑے مزے سے بتا رہی تھی۔

"واقعی جس کام کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے وہ اسی وقت پر ہو کر رہے گا۔ اب دیکھو میری شادی کی فکر سب کو تھی لیکن دُور دُور تک امکان نہیں تھا۔ یوں آناً فاناً رشتہ طے ہوا اور اب میں جا رہی ہوں اور ہاں میری شادی میں آنا نہیں بھولنا۔ ہو سکتا ہے وہیں کہیں تمہارا بھی چانس بن جائے۔" اس نے صرف ہنسنے پر اکتفا کیا۔

○○○

پھر یاسمین کے جانے کے بعد کچھ دن وہ اکیلی رہی اس کے بعد ایک اور لڑکی آ گئی اور اب کیونکہ وہ سینئر تھی اور اکثر واپسی میں بھی دیر ہو جاتی اور اماں اب ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی تھیں کہ وہ جاب چھوڑ دے کیونکہ انہیں دنوں اس کے لئے ایک اچھا پرپوزل آیا تھا جو بعد میں لڑکے نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ جاب کرنے والی لڑکی سے

شادی نہیں کر سکتا۔ اپنی اپنی سوچ ہے لیکن اماں کو فکر لاحق ہو گئی کہ وہ جب تک جاب کرتی رہے گی اس کی شادی نہیں ہو سکتی اور وہ اب جلد ہی اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اِدھر بھیا کے خطوں میں بھی یہی تذکرہ ہونے لگا تھا جس سے وہ پریشان ہو گئی۔

اس وقت بھی وہ کچھ ایسی ہی پریشان سوچوں میں گھری تھی کہ برابر بیٹھی لڑکی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"ربیعہ...... ! آپ کا فون ہے۔"

"میرا......؟" وہ حیران ہوئی اور پریشان بھی کیونکہ گھر سے کبھی فون نہیں آیا تھا۔ فطری طور پر کچھ اندیشوں میں گھر کر ریسیور اٹھایا۔ پھر پہلے دل ہی دل میں الٰہی خیر کہنے کے بعد ہیلو کہا۔

"ہیلو ربیعہ...... ! کیسی ہیں آپ......؟" کتنی مدتوں سے سماعتیں اسی ایک آواز کو سننا چاہتی ہیں۔

بے حد جیسے ڈھلے انداز میں اس نے سر بیک سے ٹکایا اور رُک کر بولی۔

"السلام علیکم آغا...... ! آپ کیسے ہیں......؟"

"ارے...... ! آپ نے پہچان لیا...... ورنہ میں تو سمجھا تھا......" ہمیشہ سے مختلف اس کا لہجہ خوشگوار تھا اور جانے کیوں بات اُدھوری چھوڑ گیا۔

اس کا دل چاہا پوچھے "کیا سمجھے تھے آپ......؟" لیکن خاموش رہی اور اس نے بھی کچھ دیر غالباً اس کے اسی سوال کا انتظار کیا پھر کہنے لگا۔

"میں نے آپ کو اس لئے فون کیا کہ کل میری برتھ ڈے ہے اور آپ کو آنا ہے۔"

"اور اگر میں نہ آ سکوں......؟"

"ہر صورت آنا ہے...... سمجھیں آپ......؟" اس نے فوراً ٹوک کر تحکم سے کہا اور فون بند کر دیا تو وہ کتنی دیر تک اس کے لہجے پر غور کرتی رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کس حیثیت سے بلایا ہے۔

اس رات کتنی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ خود اپنی بے خبری پر حیران تھی کہ نہ اسے آغا کے باہر جانے کا پتا چلا تھا اور اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کب آیا ہے۔ اگر آج وہ فون نہ کرتا تو ابھی بھی بے خبر ہی رہتی۔ حالانکہ کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جس میں اس کا خیال نہ آیا ہو اور ہر رات وہ اس کے تصور سے باتیں کرتے سوتی تھی۔ پھر اس کے جانے اور آنے سے بے خبر کیوں رہی۔

"مجھے کیا فرق پڑتا ہے وہ کہیں بھی رہے......؟ میری گرفت صرف اس کی پرچھائیں پر ہے۔" اس نے خود سے کہا تھا۔

اگلے دن وہ صبح اماں سے کہتی ہوئی گئی تھی کہ آج وہ دیر سے آئے گی کیونکہ اس کی برتھ ڈے میں جانا طے تھا اور سارا دن وہ اسے دینے کے لئے گفٹ سوچتی رہی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ اپنی حیثیت کا تعین نہیں کر پائی تھی اور اس نے بھی واضح نہیں کیا تھا۔ دوست، ملازم یا ٹیچر۔

بہر حال آف ٹائم کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک آفس میں بیٹھی رہی۔ جب شام کے سائے اُترنے لگے تب اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کے دل نے جیسے پہلی بار دھڑکنا سیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی اس کا رویہ کیسا ہو گا اور اس رُخ پر اس نے سوچا بھی نہیں۔ بس اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کھوئے ہوئے راستے کا نشان مل گیا ہو

لیکن جب اس کے گھر کے باہر گاڑیوں کی لمبی قطار دیکھی تب وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ بنگلے پر نظر ڈالی برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ بڑے لوگوں اور اتنی بڑی تقریب میں بھلا اس کا کیا کام......؟ یہی سوچتے ہوئے وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ اگر اسے انتظار ہوتا تو انتظار میں ملتا جبکہ کھلے گیٹ کے راستے پر نظر ڈالتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ پھر اس نے اپنے قدم واپسی کے لئے موڑ لیے۔ تبھی سنی بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"ٹیچر......!" وہ اس معصوم پکار پر رُک گئی اور پلکیں جھپک کر آنکھوں کی دھند صاف کرنے لگی۔

"ٹیچر......! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا، ماما نے کہا تھا آپ ضرور آئیں گی۔" سنی نے سادگی سے کہا تو اس نے ایک نظر گیٹ کے اندر ڈال کر پوچھا۔

"تمہارے ماما کہاں ہیں......؟"

"اندر ہیں...... آپ آیئے ناں......!" سنی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا تو وہ جیسے اس ننھی سی طاقت سے کھنچی چلی آئی۔ ہال کمرے میں داخل ہوتے ہی سنی یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ میں ماما کو بلاتا ہوں اور وہ اتنے لوگوں اور اتنی سج دھج دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ چکاچوند رنگ و بو کا سیلاب تھا۔

"ایکس کیوز می......!" عقب سے کسی نے غالباً اسے راستے سے ہٹنے کے لئے کہا تو وہ دروازے سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ چلتی ہوئی کونے میں آ کھڑی ہوئی اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اتنے لوگوں کے باوجود بے ہنگم شور نہیں تھا۔ ہلکی ہلکی ہنسی، ہلکی ہلکی آوازیں اور وہ جسے ڈھونڈ رہی تھی، اس کی آواز کی بازگشت کہیں اندر سے اُبھری تھی۔

(ایک عمر شور اور ہنگاموں میں گزری اور جیسا کہ آپ نے کہا تھا کہ رنگینیوں میں کھو کر انسان ٹھیک ہو گا؛ کہنا بھول جاتا ہے تو میں بھی بھولا رہا۔ یاد اس وقت آیا جب سب ساتھ چھوڑ گئے) اور وہ سوچنے لگی کہ یہ سب دوبارہ اس کی محفل میں کیسے شریک ہو گئے......؟ وہ تو بہت تنہا ہو گیا تھا۔ پھر ایک جگہ اس کی نظریں ٹھہر گئیں اور دل میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا۔ شاید اس لئے کہ وہ اس سے بہت دُور ہو گیا تھا۔

سرجری کے بعد اس کے چہرے پر کوئی ہلکا سا نشان بھی نہیں تھا اور وہ اسے اس کی آنکھوں اور انداز سے پہچان رہی تھی۔ ساتھ ہی بہت آہستہ آہستہ اس کے قدم دروازے کی طرف اُٹھنے لگے اور اِدھر اُدھر سے آتی آوازیں اس کے درد میں اضافہ کر رہی تھیں۔

"آغا کو دیکھا......؟"

"پہلے سے زیادہ ہینڈسم......!"

(چھٹیوں کے باعث سنی اپنے والدین کے پاس چلا گیا ہے اور آغا کو اب آپ کی ضرورت نہیں رہی)۔ باس نے کہا تھا اور اس وقت بھی اسے دُکھ ہوا تھا اور اب تو یقین بھی ہو گیا تھا کہ واقعی اسے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے حلقے میں کس قدر خوش اور مگن نظر آ رہا تھا۔ دروازے تک آتے آتے وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ پھر جلدی سے باہر نکل کر آئی اور ستون کی آڑ میں رُک کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی لیکن دھند چھٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تب وہ ایسی ہی دھندلائی آنکھوں سے چل پڑی۔

گیٹ سے نکل کر گاڑیوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرتی ہوئی روڈ تک آئی تو قدموں کی رفتار تیز کر

دی۔ ایک طویل مدت بعد یوں لگا جیسے سب اس کے تعاقب میں چلے آ رہے ہوں۔ وہ تیز تیز بھاگنے لگی۔ لیکن پیر لڑکھڑا گیا اور سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ گر گئی۔ پکی سڑک تھی۔ ہتھیلیاں چھل گئیں اور گھٹنوں میں الگ چوٹ آئی۔ اُٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی، انتہائی بے بسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا کسی کو مدد کے لئے پکارے تبھی ایک گاڑی قریب آن رُکی۔ بیچ سڑک پر بیٹھی وہ اپنی حالت پر کڑھتی ہوئی جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی کہ وہ گاڑی سے اُتر کر اس کے قریب پنجوں میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"دیکھ لیا مجھ سے بھاگنے کا نتیجہ۔" اس نے چونک کر سر اُونچا کیا اور اسے دیکھ کر جانے کیوں سہم سی گئی۔

"اب کیوں ڈرتی ہو......؟ اب تو میں خوفناک نہیں ہوں......؟" وہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ تب اس سے پہلے وہ کھڑا ہوا اور اس کی کلائی تھام کر اسے اُٹھا دیا پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر بولا۔

"مجھے پتا ہے تم میرے بغیر چل سکتی ہو لیکن میں تمہارے بغیر نہیں چل سکتا۔" وہ اسے بازو سے تھام کر گاڑی میں دھکیلتا ہوا اتنے آرام سے کہہ گیا۔ وہ ششدر اسے دیکھے گئی جو اس کی طرف کا دروازہ بند کر کے اب سامنے سے چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ پھر اس کے برابر بیٹھا تو ایک نظر اس پر ڈال کر پوچھنے لگا۔

"اس طرح کیوں چلی آئیں......؟ مجھ سے ملے بغیر۔"

"آپ کو کیا فرق پڑتا ہے......؟" وہ قدرے روٹھے لہجے میں کہہ کر رُخ موڑ گئی۔

"بے وقوف لڑکی......! اگر فرق نہیں پڑتا تھا تو تمہارے پیچھے کیوں بھاگا چلا آتا......؟ اِدھر دیکھو میری طرف۔" وہ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ہمیشہ سے اس کے ساتھ اتنا فری رہا ہو۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ دل کا عجیب عالم تھا اور سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔

"سنو......! کیا تم مجھ سے خفا ہو......؟" قدرے توقف سے اس نے اس انداز میں پوچھا جیسے اگر وہ ہاں کہہ دے گی تو اسے بہت دُکھ ہو گا اور اب وہ اسے دُکھ نہیں دے سکتی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"نہیں......! میں کبھی آپ سے خفا نہیں ہو سکتی۔" وہ کچھ دیر تک اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا پھر دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر پہلے ایک نظر آسمان پر ڈالی پھر اسے دیکھ کر دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تھینک گاڈ......! اینڈ تھینک یو ربیعہ......!" اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی اس کے گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

"آپ مہمانوں کو چھوڑ کر آ گئے اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"اور جو تم مجھے چھوڑ کر جا رہی تھیں یہ اچھی بات ہے......؟" وہ محظوظ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولا تو وہ سر جھکا کر رہ گئی اور قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔

"پتا ہے اس وقت تم نے مجھے کتنا مایوس کیا ہے۔ میں اس شدت سے تمہارا منتظر تھا تمہاری راہوں میں پھول بچھانا چاہتا تھا اور تم ایسی ہی آفس سے تھکی ہاری اُٹھ کر چلی آئیں ذرا حلیہ دیکھو اپنا۔ اس جلسے میں میں تمہیں اپنی مہمانِ خاص کے طور پر متعارف کرتا تو سوچو لوگ کیسی کیسی شکلیں بناتے اور کیسی کیسی نظروں سے دیکھتے۔"

''تو آپ کو......''

''ایک منٹ......!'' وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ وہ فوراً ٹوک کر بولا۔

''کوئی بات کہنے سے پہلے اس وقت کو یاد کرو جب لوگ میرا تمسخر اڑاتے اور مجھے مختلف ناموں سے پکارتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اس وقت بتاؤ تم کیوں روئی تھیں......؟''

''جی......!'' وہ قدرے الجھ کر دیکھنے لگی تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولا۔

''میں بتاتا ہوں۔ تمہیں میرے دکھ نے رلایا تھا۔ تم سے میری اذیت برداشت نہیں ہوئی تھی اور اسی وقت میں نے جان لیا تھا کہ میرے دکھ کو چننے سے لگا کر تم بہت زیادہ عرصہ مجھ سے منہ نہیں موڑ سکتیں۔ تمہیں لوٹ کر میرے پاس آنا تھا اور اس سے پہلے کہ تم آتیں میں سرجری کے لئے باہر چلا گیا۔ صرف تمہاری خاطر کہ اپنے ساتھ ساتھ میں تمہیں اذیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لوگ میرا مذاق اڑاتے اور روتیں تم......اور ربیعہ......! میں ہمیشہ تو تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔'' قدرے توقف کے بعد پھر کہنے لگا۔

''بہرحال......! جیسے تم نے میرے دکھ کو محسوس کیا تو ابھی لوگوں کے رویے سے تمہیں جو دکھ ہوتا، وہ مجھے مار ڈالتا۔ نہیں ربیعہ......! میں ہرگز کسی کو تمہاری طرف ایسی نظر نہیں ڈالنے دوں گا جس میں تمہارے لئے تحقیر کا ہلکا سا شائبہ بھی ہو۔ البتہ رشک اور حسد پر میں پہرے نہیں بٹھا سکتا......سمجھیں تم......؟'' اور وہ سب سمجھ گئی تھی۔ یہ بھی کہ اس نے کس حیثیت سے اسے بلایا تھا اور اس لحاظ سے تو واقعی اس کا حلیہ ٹھیک نہیں تھا۔

''اور سنو......!'' وہ اس کے گھر کے سامنے گاڑی روک کر بولا۔

''ابھی تمہیں دوبارہ میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''اس وقت......؟'' اس نے قدرے گھبرا کر پھیلاتی تاریکی کو دیکھا۔

''ہاں......! کیونکہ میں سب کو بہت تجسس اور انتظار میں چھوڑ آیا ہوں۔ جاؤ جلدی سے چینج کر کے اور فریش ہو کر آؤ۔''

''نہیں......! اماں اجازت نہیں دیں گی۔''

''چلو......! ان سے میں بات کرتا ہوں۔'' وہ بڑے آرام سے کہتے ہوئے اترنے لگا تو وہ کچھ سہم کر بے اختیار اس کا بازو تھام گئی۔

''نہیں آغا......! میں نے ابھی گھر میں آپ کا ذکر نہیں کیا۔''

''کوئی بات نہیں......میں اپنا تعارف خود کروا دوں گا۔''

وہ اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔ پھر اپنا بازو چھڑا کر نیچے اتر گیا اور اس کے اترنے کا انتظار کئے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر ہلکی سے دستک کے بعد اندر داخل ہو گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے دل میں داخل ہوا تھا اور جس طرح وہ اسے دل سے نہیں نکال سکی اس کے اعتماد اور یقین پر وہ ذرا سا مسکرائی پھر اس کے پیچھے آتے ہوئے احساسِ تشکر میں گھر کر زیرِ لب بڑبڑائی تھی۔

''ٹھیک ہو گاڈ......!''

⊖ ⊖ ⊖

دستک تو دو

''یہ دل......یہ پاگل دل۔'' بہت دھیمے سروں میں گنگناتے ہوئے وہ لابی سے نکلی تو ٹیرس پر خضر کو کھڑے دیکھ کر جھجک گئی۔ گو کہ اس کی گنگناہٹ اتنی دھیمی تھی جسے صرف وہ خود سن سکتی تھی اور قدم بھی بے آواز تھے۔ پھر بھی خضر نے گردن موڑ کر دیکھا اور ان کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی اس سے وہ یہی سمجھی کہ اس کی گنگناہٹ سن چکے ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ یونہی مسکرائے تھے جبکہ وہ خجل سی ہو گئی۔

''السلام علیکم......!'' کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو سلام کیا۔

''وسلام......! کیسی ہو......؟''

''بس......!'' وہ فوراً سنبھل کر آگے بڑھ آئی اور ان سے قدرے فاصلے سے ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ابھی صائمہ آپی نے بتایا ہے کہ آپ اسپیشلائزیشن کے لئے باہر جانا چاہتے ہیں۔''

''ہاں......! کوشش تو کر رہا ہوں دعا کرو کہ......''

''اگر میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو میں یہاں کھڑی ہوتی......؟'' وہ بلا ارادہ اور بے اختیار کہہ گئی۔

''کیا مطلب......؟'' انہوں نے حیران ہو کر وضاحت چاہی تو وہ ''دادی بلا رہی ہیں'' کہتے ہوئے پیچھے بھاگ آئی۔ ابھی قدم آخری سیڑھی پر ہی تھا کہ سامنے سے سونیا آ گئی۔ وہ کترا کر نکلنا چاہتی تھی لیکن اس نے پوچھ لیا۔

''اوپر اشعر ہے......؟'' اس کے لہجے میں ہمیشہ والی رعونت اور نخوت تھی جو وہ جانتی تھی کہ صرف اس کے لئے ہے اور اس نے بہت کوشش کر دیکھی تھی کہ جواباً وہ بھی اس کے لب و لہجے میں بات کیا کرے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ تب اس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ٹھیک جواب کے بجائے کوئی ایسی بات کہتی جس سے سونیا تلملا جائے۔ اب بھی وہ اس کے پوچھنے پر ہاں یا نہیں کہہ سکتی تھی لیکن بڑے آرام سے بولی۔

''تم اوپر جا تو رہی ہو......خود ہی دیکھ لینا۔''

''تمہیں بتانے میں کیا اعتراض ہے......؟'' اس نے سونیا کی تلملاہٹ ایک نظر میں دیکھ لی اور اس میں مزید اضافہ کرنے کے لئے اس کی بات نظر انداز کر کے تقریباً بھاگتی ہوئی برآمدہ عبور کر کے دادی کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں دادی حسبِ عادت دادا کو سونے سے باز رکھنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ اسے دادا پر رحم آیا جو

غنودگی میں "ہوں ہاں" کر رہے تھے۔ پھر وہ گہری نیند میں چلے گئے۔

"لو سو گئے......!" دادی نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر انہیں دیکھا اور پکارنا چاہتی تھیں کہ اس نے روک دیا۔

"سونے دیں دادی......! اتنی تپتی دوپہر ہے آپ بھی کچھ دیر سو لیں۔"

"نہ بی بی......! مجھے پھر رات میں نیند نہیں آتی۔"

"اچھا ہے ناں...... جو باتیں آپ اس وقت دادا سے کرنا چاہ رہی ہیں وہ رات میں اطمینان سے بیٹھ کر کر لیجئے گا ورنہ اس وقت دادا سو جاتے ہیں۔ رات میں آپ کو جلدی نیند آ جاتی ہے اور ساری باتیں یا جو بھی مسئلے مسائل ہیں، وہ وہیں کے وہیں رہ جاتے ہیں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" دادی قائل ہو گئیں۔

"چلئے...... رکھ دیں یہ پاندان وغیرہ اور سو جائیں۔" وہ جلدی جلدی ان کے تخت پر سے چیزیں سمیٹنے لگی پھر تکیہ سیدھا کیا اور پردے برابر کر کے آنے لگی کہ دادی نے پکار لیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو......؟ سوؤ گی نہیں کیا......؟"

"میں ابو جی کے کمرے میں ہوں۔ نیند آئی تو وہیں سو بھی جاؤں گی۔"

"اور اگر نیند نہ آئی تب کیا کرو گی......؟"

"دادی......!" وہ پلٹ کر ان کے پاس آئی۔

"اب آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔ میں چھوٹی بچی نہیں ہوں جو کہیں ادھر ادھر نکل جاؤں گی۔ آپ اطمینان سے سوئیں۔ میں اگر جاؤں گی بھی تو بڑے ابا یا چھوٹے ابا کے پورشن میں، گھر سے باہر تو نہیں جا سکتی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے بچی......! خیر...... جا کر سوؤ۔" اس نے جھک کر ان کی پیشانی چومی اور ان کے کمرے سے نکل کر ابو جی کے کمرے میں آ گئی۔ ابھی لیٹنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ چھوٹے چچا کی سب سے چھوٹی بیٹی بیلی دروازے سے جھانک کر پوچھنے لگی۔

"نشا آپی......! فلم دیکھیں گی......؟"

"اندر آؤ......!" اس نے بیلی کو اندر بلا کر پاس بٹھایا پھر پوچھنے لگی۔

"اس وقت کون فلم دیکھ رہا ہے......؟"

"سب ہیں۔ معظم بھائی، آفتاب بھائی، مینو آپا، سونیا باجی اور اشعر بھائی۔" بیلی ایک ایک کا نام لے کر بتانے لگی۔

"صائمہ آپی اور منظر بھی ہیں......؟"

"نہیں......! وہ نہیں ہیں۔ آپ چلیں ناں......؟"

"نہیں بھئی......! میں تو اس وقت سوؤں گی۔"

"مجھے پتا ہے، آپ سونیا باجی کی وجہ سے نہیں جا رہیں۔" بیلی نے کہا تو اس نے حیران ہو کر دیکھا کہ اتنی سی بچی بھی اس کے اور سونیا کے درمیان کشیدگی کو محسوس کرتی ہے۔

"سونیا باجی تو بس ایسی ہی ہیں۔ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔"

"بری بات......! ایسے نہیں کہتے۔" اس نے فوراً ٹوکا اور پھر ہنستے ہوئے بولی۔

"فلم دیکھنا اچھی بات نہیں ہے۔ آؤ......! تم بھی میرے ساتھ سو جاؤ۔"

"سونیا باجی کی آپ کے ساتھ لڑائی کیوں ہے......؟" بیلی اس کے برابر لیٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"نہیں تو...... ہماری تو کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔" پھر اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے بولی۔

"یہ بتاؤ......! امی کیا کر رہی ہیں......؟"

"سو رہی ہیں اور آپ کی امی کہاں ہیں......؟"

"میری امی......؟" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ سوچنے لگی کہ امی کا آخری خط کب آیا تھا۔ چھ مہینے ہو گئے تھے ان کا خط آئے ہوئے لیکن اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ پتا نہیں کبھی کبھی اسے کیا ہو جاتا تھا کہ وہ آپ ہی آپ امی سے ناراض ہو جاتی حالانکہ اسے پتا تھا کہ وہ کبھی اسے منانے نہیں آئیں گی۔ دل ہی دل میں ان سے شکوے کرتی لڑتی جھگڑتی اور پھر روٹھ جاتی۔ دن، ہفتے، مہینے گزر جاتے اور پھر اچانک کسی دن اس کا دل آپ ہی آپ ان کے لئے گداز ہو جاتا۔ سارے شکوے بھول کر انہیں خط لکھنے بیٹھ جاتی۔

"میری امی آج کل کینیڈا میں ہیں۔" اس نے بیلی کی طرف دیکھا لیکن وہ سو چکی تھی۔ تب وہ گہری سانس لے کر کروٹ بدل گئی۔ ایک نامعلوم سی کسک نے دل کا دامن تھام لیا تھا۔ وہ چپکے چپکے رونے لگی۔

بے نام سی اداسی تھی...... بے نام سی خلش...... اور وہ اپنے رونے کا سبب بھی نہیں جانتی تھی۔ اتنے بہت سارے لوگ تھے اس گھر میں اور سب ہی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

دادا، دادی اس پر جان چھڑکتے تھے۔

بڑے ابا اور بڑی امی کسی طرح بھی اسے اپنی اولادوں، منظر، صائمہ اور اشعر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

چھوٹے ابا اور چھوٹی امی، آفتاب، سونیا، معظم اور مینو کی طرح اس کا خیال رکھتے۔

بڑی پھپھو اور چھوٹی پھپھو کی شادیوں میں ابھی کچھ ہی سال ہوئے تھے اور چھوٹے چچا تو گڈو اور بیلی سے پہلے اس کا نام لیتے تھے اور چھوٹی چچی بھی برا نہیں مانتی تھیں۔ پھر ابو جی تو تھے ہی اتنے حلیم، نرم اور دھیمے کہ وہ گھنٹوں کے حساب سے ان کی باتیں سن سکتی تھی۔ کبھی کبھی اسے امی پر حیرت کے ساتھ افسوس ہوتا کہ وہ اتنے محبت کرنے والے لوگوں کے درمیان کیوں نہیں رہ سکیں۔

ابو جی کو چھوڑتے ہوئے انہیں اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ وہ اس وقت صرف دو سال کی ہی تو تھی اور یہ اس گھر کے لوگوں کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ کبھی امی کو غلط الفاظ میں یاد نہیں کیا۔ اول تو ان کا ذکر ہی نہیں ہوتا تھا اگر کبھی کوئی بات نکل ہی آتی تو بہت سہولت سے موضوع تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ بہر حال گھر کے تمام بزرگوں کی طرح اس کے تمام کزنز کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت اچھا اور دوستانہ تھا سوائے سونیا کے۔ وہ جانتی تھی کہ سونیا اپنے دل میں اس کے خلاف کدورت کیوں رکھتی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ اور سونیا میٹرک میں پڑھتی تھیں۔ ہم عمر اور کلاس فیلو ہونے کے باعث جہاں دونوں میں دوستی تھی وہاں کسی بات پر بحث یا تکرار بھی ہو جایا کرتی تھی اور ایک روز کسی بات پر تکرار اتنی

بڑھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اتفاق سے دوسرے کزنز بھی وہاں موجود تھے اور بجائے دونوں کو خاموش کرانے کے مزید شہ دینے لگے۔ مقصد محض انجوائے کرنا تھا اور اس تکرار میں سونیا نے جب یہ دیکھا کہ زیادہ لوگ اس کی حمایت کر رہے ہیں تو آخر میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"بس بھئی......! تم سے میں تو کیا کوئی بھی نہیں جیت سکتا......؟ آخر تم اس ماں کی بیٹی ہو جو اپنے سامنے سب کو جھکا گئی تھی۔"

یہ سراسر فاؤل تھا اور پہلی بار اسے ماں کا طعنہ ملا تھا۔ وہ سنانے میں کیسے نہ آتی۔ گھر کے باقی سب افراد سونیا کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اسے برا بھلا کہنے لگے کہ اس نے ایسی بات کیوں کی......؟ شور سن کر برابر والے کمرے سے چھوٹے ابا اور چھوٹی امی آ گئے اور جب انہیں معلوم ہوا تو چھوٹی امی نے یہ خیال کئے بغیر کہ سونیا اب بچی نہیں رہی، سب کے سامنے اس کی پٹائی کر دی اور اس سے معافی مانگنے کے لئے بھی کہا۔ تب پہلی بار اس نے خود کو چھپایا تھا۔ دل میں دکھن تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا لائی تھی۔

"چھوٹی امی......! میں نے تو بالکل بھی برا نہیں مانا...... میں اور سونیا تو بس یونہی مذاق میں......"

اس سے زیادہ وہ نہیں بول سکی تھی۔ اس کے بعد گو کہ وہ اس بات کو بھولی نہیں تھی لیکن اسے سونیا سے بھی کوئی گلہ نہیں تھا۔ جبکہ سونیا کے دل میں گرہ پڑ چکی تھی کہ اس کی وجہ سے سب کے سامنے اس کی پٹائی ہوئی۔ وہ عمر ہی کچھ ایسی ہوتی ہے جہاں ہر بات میں یہ خدشہ کہ کسی کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ بہر حال سونیا نے پھر بھی ایسی بات تو نہیں کی لیکن اس کے ساتھ اپنا رویہ بھی ٹھیک نہیں رکھ سکی۔ عجیب لہجہ اپنایا تھا اس نے۔ رعونت، نخوت، خشونت، تحقیر نہ جانے کیا کیا ہوتا تھا اور وہ برا ماننے کے باوجود نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن وہی بات کہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے اور اس نے حد سے زیادہ برداشت کر لیا تھا پھر بھی اس نے اپنی طرف سے پہل کبھی نہیں کی۔ البتہ جوابی کارروائی کرنے لگی تھی۔ پھر اس کے پیش نظر گھر کے باقی افراد تھے جو اسے اتنی محبت دیتے تھے اور اس کا خیال تھا کہ صرف ایک کے رویے پر کڑھتے رہنا باقی سب کی محبتوں کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی انجان شخص اسے بڑے ابا کے پورشن میں دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ وہ انہی کی بیٹی ہے۔ اسی طرح چھوٹے ابا اور چھوٹے چچا کے پورشن میں بھی یہی قیاس کیا جاتا۔

شروع شروع میں اسے یہ باتیں بڑی دلچسپ لگا کرتی تھیں کہ کوئی اسے بڑے ابا کی بیٹی سمجھتا ہے کوئی چھوٹے ابا کی...... اور کوئی چھوٹے چچا کی۔ ایک امی کے نہ ہونے کی وجہ سے کتنا فرق پڑا تھا کہ اس کے لئے کوئی پورشن مخصوص نہیں تھا۔ دادا، دادی کے سامنے والا کمرہ ابو جی کا تھا۔ وہ دن میں جب ابو جی آفس ہوتے تو جب اسے پڑھنا ہوتا یا سونا ہوتا تو اس کمرے میں آ جاتی تھی۔

رات میں دادی کے ساتھ سوتی اور دوسرے فارغ اوقات میں کبھی اوپر صائمہ آپی کے پاس یا چھوٹے ابا کی طرف مینو کے ساتھ یا پھر چھوٹی چچی بلا لیتیں۔ بہر حال کہیں بھی بیٹھ کر اسے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ شروع سے سب ایک ساتھ اسی طرح رہ رہے تھے اور کسی کا بھی اس کے لئے کوئی الگ اور مخصوص انداز اور لب و لہجہ نہیں تھا۔ بڑی امی جس طرح صائمہ آپی سے کہتیں اسی طرح اگر وہ سامنے ہوتی تو اس سے کہہ دیتیں۔

"نشاء......! جلدی سے کھانا نکال دو...... خضر اور اشعر آنے والے ہوں گے۔"

اس طرح چھوٹی امی بھی کرتی تھیں اور ظاہر ہے جب کوئی الگ احساس دلانے والا ہی نہیں تھا تو وہ کیسے خود کو الگ محسوس کرتی۔ بظاہر سب کے ساتھ رچی بسی تھی۔ بظاہر یوں کہ کبھی اس نے کسی کو اپنی طبیعتوں کا احوال نہیں سنایا تھا اور نہ کبھی اچانک بیدار ہونے والے احساسات کا ذکر کرتی تھی۔

تپتی دوپہروں میں جب وہ اپنے ابو جی کے کمرے میں تنہا ہوتی ہے تو اسے اچانک امی کا خیال آتا ہے۔

چھوٹی امی جب اسے اپنے پاس بٹھا کر سونیا کے رویے کی تلافی کرنا چاہتی ہیں تب پتا نہیں کیوں اس کے اندر چھن چھن کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔

دادی کی محبت بھری آغوش میں سمٹ کر بھی وہ آزردہ ہو جاتی ہے۔

اور ادھر کچھ دنوں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی دھڑکنوں کا انداز ہی بدل جاتا ہے۔ جیسے اسے دیکھ کر خضر کی آنکھوں کا رنگ۔

پتا نہیں کیوں وہ یہ ساری باتیں کسی سے نہیں کہتی تھی یا تو وہ بہت گہری تھی یا پھر اسے خود کو پوشیدہ رکھنے کا شوق تھا۔ حالانکہ یہاں سب میں اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ایک دوسرے کے دل کی بات تک جانتے تھے اور وہ بھی سب کے بارے میں جانتی تھی۔

بڑی پھوپھو کے بیٹے آذر بھائی کی شوخ اور صائمہ آپی کی جھکی نظروں کا راز اور اب تو یہ راز بھی نہیں رہا تھا کیونکہ باقاعدہ منگنی کے بعد اب ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔

چھوٹی پھوپھو کے بیٹے عثمان کی آمد پر مینو کا فوراً اپنے کمرے سے نکل کر آنا اور اس کے چھیڑنے پر مینو نے اعتراف بھی کر لیا تھا۔

آفتاب جس لڑکی کے عشق میں گرفتار تھے وہ ان کے ساتھ آفس میں کام کرتی تھی۔

اور اشعر تو باقاعدہ سب کے سامنے سونیا سے پسندیدگی کا اظہار کرتا تھا۔ ایک وہی تھی جو اپنی زندگی کے اس خوبصورت موڑ کو صرف خود محسوس کر رہی تھی اور یہی حال خضر کا تھا۔ شاید ان دونوں کے لئے یہی بہت تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے جذبوں تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ اظہار اور اعتراف کی ان کے نزدیک اہمیت نہیں تھی یا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ کچھ ایسا ہی تھا۔ باقی سب لوگ خاصے متجسس تھے۔ ابھی کل ہی تو اشعر بڑی رازداری سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"سچ بتاؤ نشاء......! تمہارے کیا ارادے ہیں......؟"

"بس......! امتحان ہونے والے ہیں۔ اس کے بعد پڑھائی ختم...... اطمینان سے گھر بیٹھیں گے۔"

"نری احمق ہو...... میں پڑھائی کے بارے میں نہیں پوچھ رہا۔"

"پھر......؟" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"میرا مطلب ہے جہاں صائمہ آپی کی شادی ہوئی۔ یہ سلسلہ چل نکلے گا اور تم جانتی ہو۔ اپنے طور پر تو ہم اپنے اپنے ساتھی منتخب کر چکے ہیں لیکن ابھی تک تمہارا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"اچھا......؟" وہ ذرا سا ہنسی پھر شرارت سے اسے دیکھ کر بولی۔

"تمہیں بھی پتا نہیں چلا......؟"

"نہیں......!"

"حیرت ہے......!"

"اس کا مطلب ہے......کوئی ہے......؟ جلدی بتاؤ......!" اس کے بے صبری کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اطمینان سے بولی تھی۔

"میں کیوں بتاؤں......؟ خود ہی جان لو۔"

"میں کوشش کر چکا ہوں اور دو ایک بار شبہ بھی ہوا کہ تم اور خضر بھائی......" اس کا انداز سوچتا ہوا سا تھا جبکہ اس کی دھڑکنیں رُکنے لگیں......بے حد خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ اُلجھ کر بولنے لگا۔

"یقین سے نہیں کہہ سکتا......تم ہی بتاؤ......!"

"کیا بتاؤں......؟"

"کون ہے......؟"

"تم......!" وہ شرارت سے ہنسی تھی جبکہ اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

"کیا......؟" پھر ایکدم اس پر بگڑ گیا۔

"خبردار......! جو میرے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں سونیا کو پسند کرتا ہوں اور شادی بھی اس سے کروں گا۔"

"ہاں......! جانتی ہوں لیکن......" اس نے قصداً بات اُدھوری چھوڑ دی تھی۔

"لیکن کیا......؟" اس کے خونخوار لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر بولی تھی۔

"دل تو دل ہے......کسی پر بھی آ سکتا ہے۔"

"مار ڈالوں گا میں تمہیں جان سے......سمجھیں......؟" وہ غصے میں بھرا ہوا اُٹھ کر جانے لگا تھا۔

"اشو......! سنو تو......" اس نے ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو......میں مذاق کر رہی تھی۔"

"آئندہ ایسا مذاق بھی مت کرنا۔"

"ارے واہ......! تم سے مذاق نہیں کروں گی تو اور کس سے کروں گی۔"

"اس گھر میں اور بھی لوگ ہیں۔"

"ہاں......! لیکن تم سے رشتہ ہی ایسا ہے۔" وہ بلا ارادہ کہہ گئی تھی۔

"کیا مطلب......؟" اس کے پوچھنے پر پہلے شپٹائی پھر فوراً سنبھل کر بولی تھی۔

"بھئی......! سونیا کے حوالے سے سالی بہنوئی والا رشتہ بھی تو ہو جائے گا ناں......؟"

"ہاں......!" وہ ایکدم سے خوش ہو گیا تھا اور وہ چپکے سے اس کے پاس سے ہٹ آئی تھی۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور کمرے میں گھٹن کا احساس بھی ہونے لگا تھا لیکن بجلی کی وجہ سے لیٹی رہی۔ شام میں جب بجلی سو کر اُٹھی تب وہ اس کے ساتھ کمرے سے نکلی تو وہاں کمرے اور برآمدے میں خاصی بھگدڑ مچی

تھی۔ اس نے تیز قدموں سے جاتے اشعر کو روک کر پوچھا۔

"کیا ہوا ہے......؟"

"بڑی پھوپھو آ رہی ہیں۔ شادی کی تاریخ لینے۔" وہ عجلت میں بتا کر جانے لگا کہ اس نے پھر روک لیا۔

"سنو......! یہ تو اچھی خبر ہے۔ تم بوکھلائے ہوئے کیوں ہو......؟"

"میرے ساتھ آؤ......! تم بھی بوکھلا جاؤ گی۔" وہ اس کے ساتھ بھاگ آئی۔

اور ہال کمرے کا نقشہ دیکھ کر واقعی بوکھلا گئی۔ جس حساب سے صوفوں کے کشن اِدھر اُدھر بکھرے تھے۔ اس سے دوگنی تعداد میں چائے کے مگ، ٹرالی کے پاس رکھی ٹرے میں جانے کیا الم غلم بھرا تھا۔ ایش ٹرے الگ اوندھی پڑی تھی اور وہ باقی ہر شے نظر انداز کر کے اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"سگریٹ کون پی رہا تھا......؟"

"آفتاب بھائی......!" وہ فوراً بولا۔

"آفتاب بھائی اتنی سگریٹ پیتے ہیں......؟" اس نے حیرت اور تاسف کا اظہار کیا پھر چائے کے خالی مگ دیکھ کر بولی۔

"اتنی گرمی میں چائے پینے کی کیا ضرورت تھی......؟"

"یار......! ہم فلم دیکھ رہے تھے اور ریفریشمنٹ بھی تو ضروری تھی۔"

"تو باقی سب کہاں گئے......اب صاف کرو کرو۔"

"اصل میں ابھی پھوپھو جی کا فون آیا ہے اور بوکھلاہٹ میں سب اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔"

"ایسا کرو تم بھی بھاگ جاؤ۔" وہ بڑے آرام سے مشورہ دے کر جانے لگی کہ اس نے پکڑ لیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو......؟ سمیٹو یہ سب۔"

"ارے واہ......! پھیلایا تم نے ہے......میں کیوں سمیٹوں......؟ اور اپنی سونیا کو بلاؤ......وہی تمہاری مدد کرے۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

"نہیں نہیں......! اسے مت بلانا۔"

"کیوں......؟"

"اصل میں چھوٹی امی کو نہیں معلوم کہ وہ اور مینو بھی یہاں فلم دیکھ رہی تھیں۔" وہ ساتھ ساتھ کشن بھی اُٹھا کر صوفوں پر جمانے لگا۔

"میں بتاتی ہوں چھوٹی امی کو بلکہ نہیں یہیں بلا لاتی ہوں تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اس کمرے کا حشر۔"

کبھی کبھی تو موقع ملتا تھا بدلہ لینے کا اور وہ ایسے مواقع گنوایا نہیں کرتی تھی۔ آخر وہ بھی تو اسے تنگ کرتا تھا۔

"نہیں نشاء......! میری پیاری بہن......!" وہ خوشامد پر اُتر آیا۔

"چھوٹی امی کو مت بتانا۔ وہ بہت ڈانٹیں گی سونیا کو اور پھر وہ گھنٹوں کے حساب سے روئے گی۔ مجھ سے اس کا رونا برداشت نہیں ہوتا۔"

"ایک شرط پر۔"

"ہاں ہاں......! جلدی کہو......!"

"رات میں آئس کریم کھلاؤ گے......؟"

"ارے صرف آئس کریم......؟ میں اور بھی بہت کچھ کھلاؤں گا۔"

"وعدہ......؟" وہ بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپا سکی۔

"پکا وعدہ......! بلکہ مردوں والا وعدہ......!"

"ٹھیک ہے......!"

اس کے ساتھ ہی وہ اِدھر اُدھر بکھرے برتن سمیٹنے لگی اور انہیں کچن میں رکھ کر آئی تو ہر شے جھاڑنے کے بعد قالین صاف کرنے لگی۔ وہ بھی اس کے ساتھ لگا رہا۔ پھر یہ بھی اچھا ہوا کہ جب وہ دونوں کمرہ ٹھیک ٹھاک کر چکے تب بڑی امی اس طرف آئیں اور اسے دیکھ کر بولیں۔

"شاباش نشاء......! مجھے پتا تھا کہ تمہارے علاوہ اور کسی کو خیال نہیں آئے گا۔ ایسا کرو لاؤنج سے کرسیاں اٹھوا کر وہ بھی یہاں رکھوا دو اور......"

"ارے امی......! کیا پھوپھو جی اسی وقت بارات لے کر آرہی ہیں......؟" وہ بیچ میں بول پڑا۔

"شادی کی تاریخ رکھنے آرہی ہیں اور اکیلی تو نہیں آئیں گی۔ ظاہر ہے اپنی ساس نندوں اور دیورانیوں، جٹھانیوں کو بھی لائیں گی۔" بڑی امی نے اسے ڈانٹا اور سمجھایا بھی۔ پھر اس سے کہنے لگیں۔

"جاؤ بیٹا......! تم سونیا کے ساتھ مل کر کچن دیکھو۔ یہ کرسیاں وغیرہ اشعر رکھوا دے گا۔"

"جی......!" وہ اسے چڑاتے ہوئے وہاں سے نکل کر آئی تو پہلے اپنا حلیہ ٹھیک کیا پھر کچن میں آئی۔ وہاں چھوٹی چچی کے ساتھ سونیا بھی موجود تھی۔ اس نے کچھ پکانے کے بارے میں پوچھا تو چچی منع کرتے ہوئے بولیں۔

"نہیں......! اتنی جلدی کھانا تیار ہونا مشکل ہے۔ بریانی، قورمہ وغیرہ باہر سے منگوا لیں گے۔ البتہ سویٹ ڈش بن جائے گی۔ تم اوپر جا کر دیکھو اگر خضر ہو تو اسے میرے پاس بھیج دو۔"

"جی......!" وہ وہیں سے پلٹ کر اوپر آگئی۔ پتا نہیں خضر اپنے کمرے میں تھے یا نہیں۔ اس نے سوچا پہلے صائمہ آپی سے پوچھ لے اور ان کے کمرے کی طرف جانے لگی کہ لابی سے نکل کر وہ سامنے آگئے۔

"آپ کو چھوٹی چچی بلا رہی ہیں۔" ان پر نظر پڑتے ہی وہ فوراً کہہ گئی۔

"کہاں ہیں چچی......؟" آستین کے کف موڑتے ہوئے انہوں نے ایک اچٹتی نظر اس پر بھی ڈالی۔

"نیچے کچن میں۔"

"اچھا......! اور سنو......! تمہیں اگر کام نہیں ہے تو صائمہ کے پاس چلی جاؤ۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولے تو وہ ذرا سا سر ہلا کر صائمہ آپی کے کمرے میں آگئی۔ وہ خاصی بوریت کا شکار نظر آرہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"کہاں ہو تم سب......؟"

"یہیں......اس گھر میں۔" وہ کھل کر مسکرائی پھر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اصل میں پھوپھو جی کے اچانک پروگرام نے سب کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ انہیں کم از کم دو تین روز پہلے اطلاع کرنی چاہئے تھی کہ وہ آج کسی خاص مقصد سے آرہی ہیں۔"

"سونیا اور مینو کیا کر رہی ہیں......؟"

"سونیا تو چچی کے ساتھ کچن میں تھی اور مینو کو نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے تیاری میں لگی ہوگی۔ آپ کو تو پتا ہے اسے موقع بے موقع تیار ہونے کا کتنا شوق ہے۔" بات کے اختتام پر وہ خود ہی ہنسی۔

"ہاں......! اصل میں اسے اپنی سانولی رنگت کا کمپلیکس ہے۔ حالانکہ بری نہیں لگتی لیکن اسے وہم ہو گیا ہے کہ سب گورے گوروں میں وہ دب جاتی ہے۔"

"اچھا......!" وہ اپنے ہاتھوں کی پشت دیکھتے ہوئے بولی۔

"رنگ تو میرا بھی گورا نہیں ہے۔"

"صاف تو ہے اور پھر تمہاری جلد بہت اچھی ہے۔ شاداب، کھلی کھلی سی، پہلی نظر میں ہی پنکھڑی کا خیال آتا ہے۔"

"نہیں بھئی......!" وہ اپنی تعریف پر نروس سی ہو گئی اور صائمہ آپی اس کا گال چھو کر بولیں۔

"ہاں بھئی......!" اسی وقت اشعر بھاگتا ہوا آیا۔

"صائمہ آپی......! جلدی سے میرے کپڑے نکال دیں۔ میں نہانے جا رہا ہوں۔" پھر اسے دیکھ کر بولا۔

"تم یہاں بیٹھی ہو......نیچے پھوپھو جی بمعہ اپنے سارے لوگوں کے تشریف لا چکی ہیں۔"

"اچھا......! کون کون ہے......؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ کو جانتا ہوں......زیادہ کو نہیں جانتا۔ البتہ تم یہ ضرور پتا کرنا کہ فیروزی کپڑوں والی کون ہے......؟"

"میں کیوں پتا کروں......؟ سونیا سے کہو وہ اس کا پورا شجرۂ نسب معلوم کر لے گی۔" وہ بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں چھپا کر بے نیازی سے بولی۔

"ہاں......! اور ساتھ میں میرا حلیہ بھی بگاڑ دے گی......خبردار......! اسے بتانے چلے۔"

"چچ چچ......! ابھی سے اتنا ڈرتے ہو......؟"

"کیا کروں یار......!" وہ صائمہ آپی کی آمد پر خاموش ہو گیا اور ان کے ہاتھ سے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا تو وہ ان سے کہنے لگی۔

"آپ نیچے چلیں گی آپی......! دادی کے کمرے میں بیٹھ جائیے گا......یہاں تو بور ہوں گی۔"

"کوئی بات نہیں......تم جاؤ......!"

"آپ اکیلی......؟"

"جاؤ بھئی......!" صائمہ آپی نے اسے دھکیل دیا تو وہ دروازے تک آکر پلٹی اور بولی۔

"نیچے اگر میری ضرورت ہوئی تو ٹھیک......ورنہ میں آپ کے پاس آجاؤں گی۔"

پھر ان کے گھورنے پر ہنستے ہوئے چلی آئی۔ برآمدے میں مینو کچھ بیزار سی بیٹھی تھی۔

''خیریت......؟ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو......؟'' وہ اس کے قریب رُک کر پوچھنے لگی۔

''پھر کہاں بیٹھوں......؟''

''اندر چلو مہمانوں کے پاس۔''

''نہیں......! دادی سختی سے منع کر گئی ہیں کہ ہم لڑکیوں کا وہاں کوئی کام نہیں۔''

''اچھا......! وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

''اللہ کرے ہمارے امتحانوں کے بعد کی کوئی تاریخ مقرر ہو۔''

''دُعا وہ مانگا کرو جس کی قبولیت کا امکان ہو۔'' مینو نے کہا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''کیا مطلب......؟''

''ابھی بھی مطلب پوچھ رہی ہو بے وقوف......! کبھی اپنی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔ پھوپھو جی کی آنا فاناً آمد کا مطلب یہی ہے کہ وہ جلد شادی چاہتی ہوں گی۔ دیکھنا ایک ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ دس دن بعد کی تاریخ لے کر جائیں گی۔'' مینو نے وثوق سے کہا اور وہ قائل ہو کر بولی۔

''پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ادھر امتحانوں کی تاریخ بھی آ چکی ہے۔ ہم کیا کریں گے......؟ کیسے تیاری کریں گے......؟''

''میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ امتحانوں سے زیادہ شادی کی تیاری ضروری ہے۔''

''کیا......؟'' اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''اور کیا۔ امتحان تو اگلے سال بھی دیا جا سکتا ہے جبکہ شادی......'' مینو اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ کر ہنسی۔

''پاگل ہو تم......!'' وہ اس کے پاس سے اُٹھ آئی۔

مینو کا اندازہ ٹھیک تھا۔ ایک ہفتے بعد کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اور ایک دم سے ہی گھر میں شادی کا ہنگامہ جاگ اُٹھا۔ سارا دن مختلف کاموں میں گزر جاتا اور اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس الگ سے کوئی کمرہ نہیں تھا۔ رات میں دادی کے پاس سوتی تھی اور دن میں جب ابو جی گھر پر نہیں ہوتے تھے تب پڑھنے وغیرہ کے لئے ان کا کمرہ استعمال کرتی تھی۔ جبکہ آج کل دن میں پڑھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ رات میں بھی لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں۔

پہلے دن تو وہ خاصی شپٹائی لیکن اگلے روز سے وہ کچھ دیر لڑکیوں کا ساتھ دے کر چپ چاپ ان کے درمیان سے اُٹھ آتی اور اپنی کتابیں لے کر چھت کا رُخ کرتی۔ چھت پر کوئی کمرہ بنا ہوا نہیں تھا۔ شاید بھی خیال تھا۔ جب ہی ایک طرف چار ستونوں پر چھت ڈلی ہوئی تھی۔ وہ اس کے نیچے چادر بچھا کر بیٹھ جاتی۔ اس کے بعد پڑھنے کا موڈ بنانے میں کچھ دیر لگتی پھر وہ پوری سنجیدگی سے نوٹس یاد کرنے میں لگ جاتی۔ اس کا بی۔ اے کا آخری سال تھا اور مزید پڑھنے کا خیال بھی نہیں تھا۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے۔

اس وقت بھی وہ یاد کرنے کے بعد لکھنے میں مصروف تھی کہ آہٹ پر چونک کر سر اُٹھایا اور خضر کو آتے دیکھ کر

لمحہ بھر کو یوں لگا جیسے اس کا دل ٹھہر گیا ہو۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ انہیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''میں نے تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا۔'' انہوں نے قریب آ کر کہا پھر اس کے سامنے کتابیں دیکھ کر بولے۔

''اچھا......! ہاں تمہارے امتحان ہونے والے ہیں۔''

''جی......!'' وہ ان پر سے نظریں ہٹا کر بلا ارادہ اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

''پھر تو مجھے تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہئے۔''

(ڈسٹرب تو ہو چکی)۔ اس نے سوچا اور ان کے پلٹنے پر بولی۔

''اچھا......!'' وہ رُک گئے پھر اس سے قدرے فاصلے پر پنجوں پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''تمہیں پتا ہے ناں کہ میں اسپیشلائزیشن کے لئے باہر جا رہا ہوں۔''

''جی......؟''

''کم از کم دو سال لگیں گے۔'' وہ فرش سے تنکا اُٹھا کر اسے توڑتے ہوئے یوں بولے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔

''گو کہ دو سال کا عرصہ بہت زیادہ نہیں ہوتا پھر بھی حالات کا کچھ پتا نہیں چلتا، کب کس موڑ پر لے آئیں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ یہ عرصہ خاموشی میں گزر جانے دوں لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ کہیں یہ خاموشی میرے راستے کی دیوار نہ بن جائے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو......؟''

معاً انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

''نہیں......؟''

''میں تم سے اعتراف چاہتا ہوں کہ تم میرا انتظار کرو گی۔'' اس نے اپنے اطراف جگنوؤں کے قافلے اُترتے دیکھے اور پھر بہت سوچ کر جرأت کا دامن تھامتے ہوئے بولی۔

''انتظار کا مرحلہ تو بہت بعد میں آتا ہے خضر......!'' اس کی بات پر ان کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی لیکن فوراً اس کا ہاتھ تھامنے میں سراسر ان کے ارادے کو دخل تھا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں...... یہی سننا چاہتی ہو ناں......؟''

''میرے خدا......!'' وہ اب راہِ فرار ڈھونڈنے لگی۔ ان کی نظروں کی حدت سے اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تو وہ اس کے ہاتھ کو ذرا سا جھٹکا دے کر بولے۔

''یوں نہیں......! بدلے میں کچھ تو میری جھولی میں ڈالو۔''

''میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔'' وہ بے حد نروس ہو رہی تھی۔

''اوں ہوں......! یہ خواہش تمہاری تھی۔ میں نے اظہار کیا تم اقرار کرو ورنہ......'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں کی طرف لے جانے لگے کہ وہ جلدی سے بولی۔

''ہاں......! میں بھی......''

○ ○ ○

صائمہ آپی رخصت ہو کر گئیں تو فطری طور پر اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود گھر میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔ شاید اس لئے محسوس ہو رہا تھا کہ اتنے دنوں سے جو ہلچل مچی تھی وہ ان کے جاتے ہی ختم ہو گئی تھی۔
وہی پہلے والے معمولات تھے پھر ان کے امتحان شروع ہو گئے تو کسی بات کا ہوش نہیں رہا اور امتحان ختم ہوتے ہی سب سے پہلی بات اسے یہ معلوم ہوئی کہ خضر کے باہر جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ محبت کے پہلے مرحلے پر ہی ہجر کا موسم آ جائے تو ظاہر ہے دل خوش تو نہیں ہوتا۔ وہ بھی کچھ چپ سی ہو گئی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کی خاموشی کو محسوس کرے۔ اس لئے خود کو بہلانے اور سمجھانے کی خاطر پچھلی طرف کے لان میں نکل گئی۔ موسم گرما جاتے جاتے بھی خزاں کی صورت اپنے نشان چھوڑ گیا تھا۔ ہر طرف خشک پتے بکھرے تھے۔ پرندے الگ دُہائی دیتے پھر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک خشک پتوں کو اپنے پیروں تلے روندتی اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہی پھر وہیں بیٹھ گئی۔ وہ جانے والے کو روک نہیں سکتی تھی اس لئے اس کے خیریت سے جانے اور واپس آنے کی دعائیں مانگنے لگی۔ اسی وقت اشعر اسے ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔

"یہاں بیٹھنے کی کیا تک ہے......؟ میں تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔"

"خیریت......؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بولا۔

"خیریت کہاں......؟"

"کیوں......؟ کیا ہوا......؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے......دل تھام کے بیٹھو......اچھی خبر سنانے والا ہوں۔"

"جلدی سناؤ......!"

"جلدی سنو......! اندر تمہاری اور خضر بھائی کی نسبت طے ہو رہی ہے اور اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ خضر بھائی کے جانے سے پہلے منگنی کر دی جائے۔"

اس کے احساسات پر جیسے پھوار برسنے لگی تھی۔ بہار ابھی بہت دور تھی لیکن سارے موسم تو انسان کے اندر ہوتے ہیں اور اسے اپنے اندر کے موسم چھپانے کا یا تو شوق تھا یا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے اندر کی گہرائیوں میں کوئی اُتر کر دیکھے۔ جبھی دل کے آنگن میں بے پناہ ہلچل مچنے کے باوجود اسی طرح اسے دیکھنے لگی تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی......؟"

اور وہ کمال ہوشیاری سے اپنی خوشی چھپا کر بے نیازی سے بولی۔

"سوچنا پڑے گا کہ اس بات پر مجھے خوش ہونا چاہئے یا نہیں......؟"

"تم بالکل پاگل ہو......ایسی باتوں کے لئے سوچنا نہیں پڑتا۔ آپ ہی آپ دل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔"

وہ جھنجھلا کر جھنجھوڑنے والے انداز میں بولا تو وہ اسے مزید تنگ کرنے کی خاطر حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا......!"

"اور کیا......؟"

"لیکن میرے اندر تو کوئی ہلچل نہیں مچی۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں۔" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا اور پُرسوچ انداز میں اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"اتنے اچھے تو ہیں خضر بھائی......اتنے ہینڈسم ہیں اور ان کا مستقبل بھی کتنا تابناک ہے۔ پھر تمہیں پسند کیوں نہیں......؟ کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو......؟"

"چھوڑو اشو......! اب کیا فائدہ......؟ پہلے پوچھتے تو بتا بھی دیتی۔" وہ لہجے کو افسردہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب بھی دیر تو نہیں ہوئی نشاء......! تم بتاؤ......! کون ہے......؟"

"تم......!" شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ جانتی جو تھی کہ وہ باقاعدہ اس پر حملہ آور ہو گا اور واقعی وہ بری طرح تپ کر اس کی طرف بڑھا تھا لیکن اس سے پہلے ہی وہ اندر بھاگ آئی۔

اس شام گھر کی تقریب میں خضر نے اسے اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی تو پہلی بار وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئی کہ نہ تو چہرے پر اُترتی دھنک رنگوں کی برسات کو روک سکی نہ رو پہلے سپنوں کو۔ جنہوں نے پلکوں تک کو بوجھل کر دیا تھا اور نہ شرمیلی مسکراہٹوں کی کلیاں گرفت میں آ سکیں۔ ہونٹوں پر یوں کھلی تھیں کہ سب نے حیران ہو کر دیکھا تھا اور اشعر نے اسی وقت جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔

"اب بتاؤ......! ہلچل کہاں مچی ہے......؟" اس نے سر کو مزید جھکا لیا اور دل ہی دل میں خود کو سرزنش کرنے لگی۔

اس کی اپنی سوچ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی محبت دل کے ایوانوں سے نکل کر بام و در میں دکھائی دے یا اس کے قصے سنائی دیں۔ وہ اس جذبے کی ہر کلی کو سینت سینت کر رکھنا چاہتی تھی تاکہ خضر کی واپسی پر وہ ان کلیوں سے ان کا دامن بھر دے اور مزے کی بات یہ تھی کہ جاتے جاتے انہوں نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"نشاء......! اپنی بے قراریوں کا احوال کسی اور سے مت کہنا......نہ اپنی محبتوں کے قصے سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرنا۔ میں تمہارے دل کو ایک میٹھا سا درد دیئے جا رہا ہوں۔ اس کی ساری چاشنی میں خود آ کر سمیٹوں گا۔"

اور اسے یہ میٹھا سا درد بے حد عزیز تھا جو اکثر رات کی تنہائیوں میں دل سے اُٹھتا اور دھیرے دھیرے پورے وجود میں سرایت کر جاتا تھا۔ کیسا سرور، کیسا نشہ تھا جو اسے خود سے بیگانہ اور پھر غافل کر جاتا اور دن کے اُجالے میں وہ کمال خوبصورتی سے اسے نہاں خانوں میں چھپا لیا کرتی تھی۔ مینو کرید کر پوچھتی۔

"خضر بھائی کے جانے سے اُداس ہو......؟" اور وہ انجان بن جاتی۔

"کیوں......؟"

اور اشعر تو اسے چھیڑ کر پچھتاتا تھا۔

"خضر بھائی کے خیالوں میں گم ہو......؟"

''تمہارے خیال سے نکلوں تو ان کا خیال بھی آئے۔''

اسے وہ اسی قسم کے جواب دیتی تھی۔ ایک تو وہ شروع ہی سے اس کے ساتھ خاصی فرینک تھی دوسرے اب رشتہ ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ وہ نہ تو جھجکتی نہ کسی کا خیال کرتی اور وہ پہلے تو اس کے بال کھینچتا یا بازو مروڑ لیتا تھا لیکن اب کیونکہ وہ اس کے بڑے بھائی کی منگیتر تھی اس لئے صرف جھنجلا کر رہ جاتا تھا۔

''ادب سے بات کیا کرو مجھ سے۔'' اس روز وہ اس کے ''تم'' کہہ کر مخاطب کرنے پر ٹوک کر بولی تو وہ پھر چھیڑنے سے باز نہیں رہ سکا۔ حالانکہ ہزار بار توبہ کر چکا تھا۔

''کس ناطے سے...... ؟ نہ تو تم مجھ سے عمر میں بڑی ہو...... نہ قد میں...... پھر...... ؟'' اور پہلی بار وہ خود ہی پھنس گئی۔ بیٹا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''بتاؤ ناں...... ! کس ناطے سے ادب سے بات کیا کروں...... ؟'' وہ پیچھے پڑ گیا۔

''ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔'' سونیا بول پڑی۔

''ظاہر ہے یہ تمہاری بڑی بھاوج بننے والی ہے۔''

''تم چپ رہو...... میں اس کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' وہ سونیا کو چپ کرا کے شرارت سے اسے دیکھنے لگا تو وہ اٹھ کر جانے لگی لیکن اس نے کلائی تھام لی۔

''پہلے میری بلکہ اپنی بات کا جواب دو۔''

''تمہارا سر...... !'' وہ چڑ کر بولی اور ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر بھاگ گئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ رزلٹ آیا تو وہ اور سونیا دونوں ہی اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی تھیں۔ اس کا مزید پڑھنے کا خیال نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ جانتی تھی یونیورسٹی جانے کی اجازت نہیں ملے گی اور جانتی تو سونیا بھی تھی اس کے باوجود جس روز رزلٹ آیا اس روز اس نے بآواز بلند اعلان کیا کہ وہ ایم اے کرے گی تو سب نے حیران ہو کر دیکھا اور دادی نے فوراً ٹوک دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے...... جتنا پڑھ لیا وہی بہت ہے۔''

''کوئی بہت نہیں ہے...... ؟ آج کل بی اے کی اہمیت ہی کیا ہے...... ؟'' وہ تنک کر بولی۔

''تمہیں کون سا نوکری کرنی ہے...... ؟''

''صرف نوکری کے لئے نہیں پڑھا جاتا۔''

''سونیا...... !'' چھوٹی امی نے تنبیہی نظروں سے گھورا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''آخر میں گھر بیٹھ کر کیا کروں گی...... ؟ ویسے بھی میرا شوق ہے کہ میں انگلش میں ماسٹرز کروں اور میں ضرور کروں گی۔''

وہ اپنے تئیں فیصلہ سنا کر چلی گئی اور پھر اپنی بات منوانے کے لئے وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی تھی۔ کبھی کھانا چھوڑ دیتی۔ کبھی خوامخواہ چیخ چیخ کر بولنا شروع کرتی تو چپ کرانا مشکل ہو جاتا۔ کبھی رات رات بھر آنگن میں ٹہلتی رہتی۔ سب ہی سمجھا سمجھا کر تھک گئے لیکن وہ اپنی ضد چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

○○○

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا جو دل ایک دم سہم سا گیا تھا۔ کتنی دیر تک وہ خود کو سمجھاتی رہی کہ خواب ہی تو تھا پھر جب دل ذرا قابو میں آیا تو ہر سو گھپ اندھیرے کا احساس ہوا۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ اس نے ایک نظر دادی پر ڈالی پھر اٹھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو چٹکتی چاندنی کمرے کے اندر تک چلی آئی۔ جبکہ مست پروائی نے اس کے چہرے کو چھو لیا۔ اس شوخ جسارت پر وہ ایک لطیف سے احساس میں گھر کر پلٹنے کو تھی کہ نظر بیچ آنگن میں بیٹھی سونیا پر پڑی۔ وہ پہلے حیران ہوئی پھر پریشان اور کسی طرح بھی ''مجھے کیا'' کہہ کر اسے نظر انداز نہیں کر سکی تو دبے پاؤں کمرے سے نکل کر اس کے پاس آ گئی۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو...... ؟'' اس کے پاس بیٹھ کر دھیمی آواز میں پوچھا تو جواب میں وہ تڑخ کر بولی۔

''تمہیں کیا...... ؟''

''ہاں مجھے کیا...... ؟'' اس نے ذرا سی بے نیازی برتی پھر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے یوں بولی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ ''تمہاری ضد فضول ہے حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس گھر میں خواتین کے لئے ایک حد مقرر ہے۔ چار دیواری کے اندر کھاؤ پیو عیش کرو۔ باہر کیا ہو رہا ہے...... ؟ یہ جاننا ان کے لئے ضروری نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں باہر کی خبریں یہیں بیٹھے مل جاتی ہیں۔'' وہ ذرا سا ہنسی پھر اسے دیکھ کر بولی۔

''ویسے ہم پر کوئی اتنی پابندیاں بھی نہیں ہیں۔ دادا کی اجازت سے شاپنگ بھی کر آتے ہیں...... تفریح بھی ہو جاتی ہے اور دادا کی نظر میں لڑکیوں کے لئے جتنی تعلیم ضروری ہے وہ بھی ہم حاصل کر چکے اور کیا چاہئے ہمیں...... ؟''

''کم از کم مجھے اور بھی بہت کچھ چاہئے۔ بس اس پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ سکتی۔ زندگی میں جستجو ہو، کھوج ہو، ایڈونچر ہو۔ یہ کیا کہ محدود تعلیم دلا کر پھر اسی گھر کے کسی لڑکے سے باندھ کر کہا جائے...... ؟ کھاؤ پیو عیش کرو۔ بڑی امی، امی اور چھوٹی چچی یہی کچھ کر رہی ہیں۔'' سونیا کا لہجہ تند اور تیز تھا۔ غالباً اسے پروا نہیں تھی کہ تاریکی اور سناٹے میں اس کی آواز جہاں تک بھی سنی جائے جبکہ وہ محتاط انداز میں بات کر رہی تھی۔

''کس بات کی جستجو ہے تمہیں...... ؟ کیا کھوجنا چاہتی ہو...... ؟''

''یہ جستجو اور کھوج تمہاری امی کو اس گھر سے دور لے گئی۔ بھلا آج کل کہاں ہیں وہ...... ؟''

اس کے اندر سناٹا پھیل گیا۔ سر جھکا کر ایڑیوں سے بے فرش پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔

''تمہارے پاس ان کے خط تو آتے ہیں ناں...... ؟'' سونیا نے پوچھا اور وہ بالکل نہیں سمجھ سکی کہ وہ اس کی امی کے حوالے سے کیا کہنا چاہتی ہے۔

''کوئی چھ سات ماہ پہلے کینیڈا سے ان کا خط آیا تھا اور میرا خیال ہے اب بھی وہیں ہوں گی۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے جانے کا خیال آیا تو رک کر بولی۔

''امی اس گھر میں بہو بن کر ضرور آئی تھیں لیکن ان کا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جبکہ ہمیں خاندان کی لڑکیاں ہونے کے ناطے اس کے رواجوں کے مطابق زندگی گزارنی ہے اور پھر ہمارے رواج ایسے فرسودہ بھی نہیں ہیں۔''

''ایک طرح سے تمہارا کہنا ٹھیک ہی ہے کہ ہم تمہاری امی کی طرح بغاوت کر کے اس گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد نہیں کہہ سکتے۔ کہیں بھی جائیں لوٹ کر ادھر ہی آنا ہوگا۔''

اس نے بڑے ضبط سے اس کی بات سنی اور پھر کچھ کہے بغیر اندر چلی آئی۔ نیند رخصت ہو چکی تھی اور اب خیالات کا ہجوم تھا۔ کبھی کبھی کسی دوسرے کی غلطی ہمیں کس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا سکھا دیتی ہے۔ وہ بھی اپنی اب تک کی زندگی میں یہی کوشش کرتی رہی تھی کہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے امی کا طعنہ ملے۔ پتا نہیں زندگی کے بارے میں امی کا نظریہ اور سوچ کیا تھی جو وہ کھاؤ پیو عیش کرو کے فارمولے پر عمل کر سکیں نہ سمجھوتہ اور اب سونیا بھی ایسی ہی باتیں کر رہی تھی جنہیں سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ کم از کم وہ سونیا کو کبھی بھی نہیں سمجھا سکتی۔ پھر اسے اشعر کا خیال آیا تو صبح ہوتے ہی وہ سیدھی اوپر چلی آئی۔ ٹیرس پر بڑے ابا بیٹھے غالباً صبح کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''السلام علیکم بڑے ابا.....!''

''ارے آؤ بیٹا.....! جیتی رہو.....خوش رہو.....آؤ بیٹھو.....!'' انہوں نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔

''بڑی امی کہاں ہیں.....؟'' اس نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اس وقت کچن کے علاوہ اور کہاں ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ میں نے صرف چائے مانگی تھی لیکن وہ پورا ناشتہ لے کر ہی آئیں گی۔''

''میں دیکھتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے روک دیا۔

''نہیں.....! تم بیٹھو.....اب میرے ساتھ ہی ناشتہ کرنا۔ پتا ہے جب سے صائمہ کی شادی ہوئی ہے مجھے اکیلے ہی ناشتہ کرنا پڑتا ہے۔''

''کیوں بڑے ابا.....؟ اشعر بھی تو ہے۔''

''وہ اُلو کا پٹھا جلدی کہاں اُٹھتا ہے.....؟ اور تمہاری بڑی امی بھی اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے بیٹیاں بڑی نعمت ہوتی ہیں۔ انہیں کم از کم باپ کا خیال تو ہوتا ہے۔'' پھر اس سے پوچھنے لگے۔

''تمہارا باپ کیا کر رہا ہے.....؟''

''جی وہ.....جب میں آ رہی تھی وہ اپنے کمرے میں تھے۔'' اسی وقت بڑی امی ناشتہ لے کر آ گئیں تو اس نے جلدی سے اٹھ کر ان کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی اور ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

''آپ بیٹھیں بڑی امی.....! ناشتہ کریں۔ چائے میں بنا لاتی ہوں۔''

''لیکن بیٹا.....! میں تو اتنی جلدی ناشتہ نہیں کرتی۔''

''آج کر لیں۔'' وہ انہیں بٹھا کر کچن میں آ گئی۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھا تھا۔ اس نے ٹی پاٹ میں چائے دم کی اور پھر ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ بڑی امی نے اس سے ناشتہ کرنے کے لئے کہا لیکن اس نے سہولت سے منع کر دیا اور ایک مگ میں چائے لے کر اشعر کے کمرے میں آ گئی۔ وہ اٹھ تو چکا تھا لیکن شاید بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ دیکھ کر فوراً پوچھنے لگا۔

''میرے لئے لائی ہو.....؟''

''نہیں.....!'' وہ اطمینان سے بولی اور اس کے سامنے بیٹھ کر پینے لگی۔

''کس قدر.....؟'' وہ جھنجھلا گیا۔

''اب میں تمہیں گالی بھی نہیں دے سکتا۔'' وہ ہنس پڑی۔

''تو کیا یاد کرو گے۔'' مگ اس کی طرف بڑھایا تو وہ منہ بنا کر بولا۔

''میں جھوٹی چائے نہیں پیتا۔''

''تمہاری مرضی.....!'' اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا تو وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔

''خیر.....! تمہاری جھوٹی پینے میں کوئی حرج نہیں۔'' پھر آواز دبا کر پوچھنے لگا۔

''ابو جی چلے گئے کیا.....؟''

''نہیں.....! ابھی تو ناشتہ کر رہے ہیں۔''

''یعنی ابھی صرف سات بجے ہیں پھر تو میں ابھی کچھ دیر اور سو سکتا ہوں۔ ویسے تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو.....؟'' اچانک اس کی صبح ہی صبح آمد پر اچنبھا ہوا۔

''مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔''

''مجھ سے بات کہنی ہے.....؟'' وہ بغور اسے دیکھنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے کوئی خاص بات ہے جو تم نے میرے نیچے اُترنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ خیر کہو.....!''

''میں سونیا کی طرف سے پریشان ہوں۔''

''کیا ہوا ہے اسے.....؟'' وہ اس سے زیادہ پریشان ہو گیا۔

''ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن اپنی ضد منوانے کے لئے وہ جس قسم کی حرکتیں کر رہی ہے اس سے ضرور اسے کچھ ہو جائے گا۔ آخر تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں.....؟''

''تمہارا کیا خیال ہے.....؟ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی.....؟''

''تو کیا وہ تمہاری بات بھی نہیں مان رہی.....؟'' وہ کچھ نہیں بولا اور وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔

''لیکن اشو.....! تم تو اسے اتنی اہمیت دیتے ہو۔ اس کی ہر بات مانتے ہو، وہ کیوں نہیں تمہاری بات مان رہی.....؟''

''اب میں کیا کہوں.....؟''

''کیا کہا ہے اس نے تم سے.....؟''

''اس کا کہنا ہے کہ میں اسے سمجھانے کے بجائے گھر والوں کو سمجھاؤں۔ ویسے وہ ٹھیک کہتی ہے کیونکہ اس کی خواہش کوئی ایسی ناجائز بھی نہیں ہے۔''

''اشو.....! تم بھی.....''

''ہاں میں بھی.....تم جانتی ہو نشاء.....! میں اس کی کوئی بات رد نہیں کر سکتا۔ پہلے اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں اور میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر کہا 'نہیں' اس کے بعد اس نے سب کے

سامنے اعلان کیا۔ اب تم ہی بتاؤ......! میں کیا کروں......؟ اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے یہی کہا کہ اگر ایسی بات تھی تو میں پہلے منع کر دیتا۔ جبکہ اب مجھے اس کا ساتھ دینا چاہئے اور میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں بلکہ تم سے بھی یہی کہوں گا کہ دادا کو قائل کرنے میں ہمارا ساتھ دو۔"

"نہیں اشو......! اس طرح تو دادا سمجھیں گے کہ ہم سب نے ان کے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔"

اس کے دامن بچانے پر وہ مسکرایا پھر موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے بولا۔

"خیر چھوڑو......یہ بتاؤ......! تم نے ناشتہ کر لیا......؟"

"ارے......! دادی تو میرے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔" وہ بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔

پھر دادا نے سونیا کو اس کی ضد سے باز رکھنے کا ایک ہی حل نکالا کہ فوراً اس کی شادی کر دیں اور کیونکہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے سب ان کی نظروں کے سامنے تھے اور انہیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا تھا کہ کس کا جھکاؤ کس کی طرف ہے اور اسی حساب سے وہ رشتے طے کرتے تھے۔ سونیا اور اشعر کی ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی بھی ان سے چھپی نہیں تھی اس لئے فوری ان کی شادی کا فیصلہ سنایا اور ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ من کی مراد ملنے پر وہ خوش ہو جاتا لیکن اس کے برعکس سونیا نے رو رو کے برا حال کر لیا اور اشعر نے شادی کے لئے یہ شرط رکھی کہ جب تک سونیا ایم اے نہیں کرے گی وہ شادی نہیں کرے گا۔ صاف ظاہر تھا کہ دونوں نے پہلے سے طے کر لیا ہے۔ بہرحال دادا ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر بری الذمہ ہو گئے۔ یہ نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے اصول توڑ ڈالے تھے بس کبھی کبھی انسان اولاد یا اس کی اولاد کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

○○○

سونیا نے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی جبکہ اس کے پاس اب فراغت ہی فراغت تھی۔ جتنے گھر کے کام ہوتے اتنے ہی کرنے والے بھی تھے۔ اس لئے سارے کام جلدی نمٹ جاتے۔ اس کے بعد کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا اور پتا نہیں کیوں اب اس کا دادی کے پاس بھی زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ دوپہر تک وہ قصداً خود کو ادھر اُدھر مصروف رکھتی اور دوپہر کا کھانا کھاتے ہی امی جی کے کمرے میں بند ہو جاتی تو کبھی نیند مہربان اور کبھی اسے پکارتے پکارتے شام ہو جاتی۔ البتہ شام میں گھر میں کچھ چہل پہل رہتی تھی۔ کسی کسی دن صائمہ آپی اور آذر بھائی آ جاتے تو رونق بڑھ جاتی۔ ان دنوں موضوع آفتاب بھائی کی شادی تھا۔ ان کی پسند شہلا تھی جو ان کے ساتھ ہی آفس میں کام کرتی تھی اور مسئلہ یہ تھا کہ بڑوں تک کیسے بات پہنچائی جائے۔

"آفتاب بھائی......! دادا کا آپ کو پتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے فیصلے سنا دیتے ہیں۔" اشعر انہیں خبردار کرتا ہوا بولا۔

"لہٰذا آپ فوراً انہیں اپنی پسند سے آگاہ کر دیں ورنہ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

"مجھے بھی یہی خدشہ ہے لیکن میں دادا سے کیسے کہوں......؟" آفتاب بھائی بہت سیدھے تھے۔ پتا نہیں عشق کیسے کر بیٹھے تھے بلکہ اکثریت کو شبہ تھا۔

"لیجئے......! یہ اپنی نشاء کس دن کام آئے گی......؟"

"میں......؟" وہ اپنی جگہ اچھل پڑی۔

"بالکل......! تم ہی یہ کام کر سکتی ہو۔" سونیا اشعر کی تائید کرتے ہوئے یقین سے بولی۔

"ظاہر ہے تم ہی دادی کے ساتھ زیادہ رہتی ہو اور وہ تم سے ہم سب کے بارے میں ضرور پوچھتی ہوں گی۔"

"نہیں......!"

"کیسے نہیں......؟ انہیں الہام تو نہیں ہوتا جو ادھر ہم لوگ جو باتیں سوچتے ہیں وہ دادا دادی کی زبان پر آ جاتی ہیں۔"

"تو اس سے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں دادی کو بتاتی ہوں......؟" اسے سونیا کی بات بلکہ الزام بہت برا لگا تھا۔

"اُفوہ بھئی......! تم دونوں کس بحث میں اُلجھنے لگیں۔" معظم نے دونوں کو خاموش کرایا۔

"اصل بات تو وہیں رہ گئی۔ ہاں آفتاب بھائی......! پھر کیا ارادہ ہے......؟" اشعر نے پھر انہیں چھیڑا تو ان سے پہلے مینو بول پڑی۔

"بھئی......! ڈائریکٹ دادا سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے......؟ میں امی سے کہہ دوں گی پھر امی خود ہی آگے بات پہنچا دیں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے......!" آفتاب بھائی نے فوراً مینو سے اتفاق کیا پھر سب آفتاب بھائی کو چھیڑنے لگے۔

اچھا خاصا خوشگوار ماحول تھا کہ اچانک سونیا کہنے لگی۔

"ویسے مجھے دادا کے مان جانے کی ایک فیصد بھی اُمید نہیں ہے۔"

"کیوں......؟" سب سوالیہ نشان بن گئے۔

"اس لئے کہ دادا ایک بار غیر خاندان سے بہو لانے کی غلطی کر چکے ہیں اور وہ اس غلطی کو دوبارہ ہرگز نہیں دُہرائیں گے۔"

سونیا کا اشارہ اس کی امی کی طرف تھا اور سب ہی نے سمجھتے ہوئے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔ اس پر مزید ستم آفتاب بھائی کی سادگی نے ڈھایا جو وہ کہنے لگے۔

"اب سب تو تمہاری چچی کی طرح نہیں ہوتے پھر شہلا تو بہت مختلف اور بہت سادہ ہے۔ وہ اس گھر اور ماحول میں بہت آسانی اور خوشی کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جائے گی۔"

"ہم تو آپ کی بات سے اتفاق کر سکتے ہیں آفتاب بھائی......! لیکن دادا......" وہ سونیا کی بات پوری ہونے سے پہلے وہاں سے اُٹھ کر چلی آئی۔ پتا نہیں اس کے لئے خوشی کے لمحات اتنے مختصر کیوں ہوتے تھے......؟ اور وہ اگر اس کا ذمہ دار امی کو سمجھتی تھی تو غلط بھی نہیں تھا۔ کتنے آرام سے اس کی ساری ریاضتوں پر ایک پل میں پانی پھر جاتا تھا اور وہ آزردہ کیسے نہ ہوتی......؟ بہت خاموشی سے بڑی امی کی نظر بچا کر وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر چلی آئی۔ دونوں وقت ملنے کا اُداس سماں تھا۔ اس نے دادی سے سنا تھا کہ اس سے بہتے ہوئے دریا بھی رُک جاتے ہیں اور اسے تو ساری کائنات رُکی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوائیں ساکن......فضائیں خاموش......نہ کوئی آہٹ......نہ کوئی سرگوشی۔ یہاں تک کہ اس کے احساسات بھی سو گئے تھے اور اس سمے کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب

تاریکی نے مکمل طور پر اُجالے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر شے میں جیسے نئے سرے سے روح پھونک گئی تھی۔ خاموش فضاؤں میں ہوا کی سرگوشیاں گونجنے لگیں اور اس کے احساسات ایک ایک کر کے بیدار ہونے لگے۔ تب پہلا خیال اسے یہ آیا کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے......؟ اور پھر سونیا کی باتیں...... وہ ہرگز بھی قصوروار نہیں تھی پھر بھی بری طرح ہرٹ ہو جاتی۔

آخر والدین کی غلطیوں کا خمیازہ اولادوں کو کیوں بھگتنا پڑتا ہے......؟ اس نے دُکھ سے سوچا اور پلکوں تک آئی نمی اُنگلیوں پر سمیٹ رہی تھی کہ اشعر نے دبے پاؤں آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ نہ چونکی نہ پلٹ کر دیکھا۔ تب وہ سامنے آ کر بولا۔

''یہاں کیوں چلی آئیں......؟'' اور وہ سارے دُکھ چھپا کر مسکرائی۔

''بس......!''

''تمہیں سونیا کی بات بری لگی ہے ناں......؟'' وہ خاموش رہی۔

''میں مانتا ہوں وہ اکثر تمہارے ساتھ زیادتی کر جاتی ہے لیکن پلیز نشاء......! تم برا مت مانا کرو۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

''کیا سمجھاؤ گے......؟ اور کیا وہ تمہارے سمجھانے سے سمجھ جائے گی......؟'' اس نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اس کے باوجود وہ اسے دیکھے گیا اور قدرے تاخیر سے کہنے لگا۔

''اسے سمجھنا پڑے گا کیونکہ تم دونوں کو ہمیشہ ساتھ رہنا ہے ایک ہی گھر میں۔''

''ارے......!'' وہ حیران ہو کر ہنسی۔

''مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔''

''اب تو میں نے بتا دیا ہے ناں......!''

''ہاں......! اور اب میں تمہارا خیال کر کے اس کی باتوں کا برا نہیں مانوں گی۔ ویسے مجھے برا ماننا بھی نہیں چاہئے کیونکہ وہ غلط تو نہیں کہتی۔''

''پھر بھی اسے......'' اچانک یاد آنے پر بولا۔

''ارے......! میں بھول گیا...... تمہیں چچا بلا رہے ہیں۔''

''کون ابو جی......؟''

''ہاں......! جلدی جاؤ فوراً بلا رہے تھے۔'' وہ اس کی بات سنتے ہی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آ گئی۔ برآمدے میں کھڑی نیلی سے ابو جی کے بارے میں پوچھا اور پھر ان کے کمرے میں آئی تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''کیا بات ہے......؟ تم اپنی امی کو خط نہیں لکھتیں......؟''

''جی......!'' وہ اس اچانک سوال پر حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

''کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں انہیں خط لکھے ہوئے......؟'' ابو جی کا انداز اور لہجہ بالکل سپاٹ تھا جیسے روزمرہ کے کسی کام کے بارے میں پوچھ رہے ہوں کہ کیوں نہیں کیا......؟

''کافی دن...... بلکہ مہینے ہو گئے ہیں۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''کیوں......؟ کیا کسی نے منع کیا ہے......؟''

''نہیں......!''

''پھر......؟'' اسے کوئی جواب نہیں سوجھا اور جانے کیوں دل بھر آیا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''ارے......!'' ابو جی اُٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے......؟ میں نے کوئی غلط بات کی یا اپنی غلطی پر نادم ہو......؟''

''اگر امی کو خط نہ لکھنا غلطی ہے تو مجھ سے یہ غلطی ہوئی لیکن میں اس پر نادم نہیں ہوں۔'' وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

''اچھا جاؤ......! پہلے منہ دھو کر آؤ۔ مجھے روتے ہوئے بچے اچھے نہیں لگتے۔'' وہ خاصی بے دلی سے اُٹھ کر واش روم میں گئی۔ ابو جی نے اس سے پہلے کبھی اس کے ساتھ امی کی باتیں نہیں کی تھیں۔ جب ہی اسے حیرت ہو رہی تھی اور مسلسل منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سوچتی رہی کہ آج ابو جی کو کیسے خیال آیا اور انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس نے کافی عرصے سے امی کو خط نہیں لکھا۔ قدرے اُلجھی ہوئی واش روم سے نکل کر آئی اور جیسے ہی ابو جی کے سامنے بیٹھی انہوں نے اس کی اُلجھن دور کر دی۔ کہنے لگے۔

''آج تمہاری امی کا فون آیا تھا۔ بہت تشویش سے پوچھ رہی تھیں کہ تم ان کے خطوط کے جواب کیوں نہیں دے رہیں......؟'' پھر سمجھاتے ہوئے بولے۔

''یہ اچھی بات نہیں ہے بیٹا......! تمہیں جواب ضرور دینا چاہئے۔'' وہ کچھ دیر تک سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیلتی رہی پھر صاف گوئی سے بولی۔

''میں انہیں خط لکھتی رہی ہوں لیکن پھر اچانک دل اُچاٹ ہو گیا۔''

''کیوں......؟''

''شاید اس لئے کہ جب ان کا ہم سے کوئی ناطہ کوئی تعلق نہیں۔ وہ ہماری زندگیوں سے نکل گئیں پھر خط و کتابت......'' وہ خاموش ہو کر نفی میں سر ہلانے لگی جیسے یہ کاغذی رابطہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

''یہ ٹھیک ہے کہ وہ ہماری زندگیوں سے نکل گئیں سارے ناطے توڑ کر لیکن بیٹا......! تمہارا اور ان کا ناطہ تو کبھی بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ وہ تمہاری ماں ہے۔''

''ماں......؟'' اس کے اندر ڈھیر ساری تلخی بھر گئی۔

''نہیں ابو جی......! میں تو یہ جانتی ہوں کہ ایثار اور قربانی کا دوسرا نام ماں ہے جو عورت ان جذبوں سے محروم ہو وہ ماں نہیں ہو سکتی۔''

''نہیں بیٹا......! اپنی سوچ کو وسعت دو۔ ایک جیتی جاگتی انسان ہونے کے ناطے عورت کی اپنی بھی ایک زندگی ہوتی ہے اور اسے اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنے کا حق ہونا چاہئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے یہ حق نہیں دیتے اور ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جو عورتیں اپنے حق کے لئے لڑنا نہیں جانتیں وہ چپ

چاپ سمجھوتہ کر لیتی ہیں اور جو لڑنا جانتی ہیں وہ باغی اور سرکش ہو جاتی ہیں۔" ایک مرد کو عورت کے حق میں بولتے سن کر اس کی حیرت فطری تھی۔

"تمہاری امی پڑھی لکھی باصلاحیت خاتون تھیں بلکہ ہیں، یہ نہیں ہے کہ وہ خود کو اس گھر میں ایڈجسٹ نہیں کر سکیں۔ جتنا عرصہ وہ یہاں رہیں بہت خوش و خرم رہیں لیکن محدود زندگی سے سمجھوتہ نہیں کر سکیں۔ ان میں آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ وہ کچھ کر کے دکھانا چاہتی تھیں جبکہ ہمارے گھر کا ماحول انہیں کچھ کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور اگر وہ کوئی عام سی عورت ہوتیں تو اپنا رویہ تبدیل کر کے اس گھر کو جہنم بنا سکتی تھیں لیکن انہوں نے پوری دیانتداری سے مجھ سے بات کی اور یہ میری غلطی ہے کہ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکا۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"ہمارے درمیان کوئی لڑائی...... رنجش یا اختلاف نہیں تھا۔ بس یہ ہے کہ میں اپنے گھر والوں کو ناراض نہیں کر سکا۔ یوں بغیر ایک دوسرے کو الزام دیئے ہم الگ ہو گئے۔ یہ نہیں ہے کہ تمہاری امی کو تمہارا خیال نہیں تھا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں لیکن میری خواہش کے پیش نظر انہوں نے تمہیں میرے پاس چھوڑ دیا اور بیٹا......! اگر مجھے ان کے کسی عمل سے کوئی تکلیف یا شکایت ہوتی تو میں خود تمہیں ان سے رابطہ رکھنے سے منع کرتا۔ یہ بات تمہیں سمجھنی چاہئے ناں...... یا اس گھر کے کسی اور فرد نے ان کے خلاف کوئی بات کی ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"بتاؤ بیٹا......!"

"نہیں......! کسی نے کچھ نہیں کہا۔"

"پھر تم ان سے ناراض کیوں ہو......؟"

"میں ناراض نہیں ہوں۔"

"چلو تو پھر ابھی جا کر انہیں خط لکھو۔ وہ بہت پریشان ہو رہی تھیں۔"

وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے رُک کر پوچھنے لگی۔

"امی یہاں کیوں نہیں آ جاتیں......؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں...... یہ تم ان ہی سے پوچھو۔"

"صرف پوچھوں یا آنے کے لئے بھی لکھوں......؟"

جواباً وہ کندھے اُچکا کر ذرا سا مسکرائے تو وہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے کمرے سے نکل آئی۔ لابی میں سونیا فون پر پتا نہیں کس سے بات کر رہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی جلدی سے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور وہاں سے بھاگ بھی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی اس حرکت کو کیا سمجھے......؟ پتا نہیں وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر گئی تھی یا کچھ جتانا مقصود تھا۔ اسے بہرحال عجیب سا لگا۔ وہیں سے پلٹ کر دادی کے پاس جانا چاہتی تھی کہ فون کی بیل پر رُک گئی۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا پھر بھی وہ انتظار کرنے لگی۔ پتا نہیں سب کہاں تھے۔ آخر اسے ہی ریسیور اٹھانا پڑا اور دوسری طرف خضر کی آواز سنتے ہی اس کے اندر کا بوجھل پن پل میں رُخصت ہو گیا۔

"تشاء......!" انہوں نے یقین چاہا۔

"جی......!"

"کہاں رہتی ہو......؟ ہر بار اس آس پر فون کرتا ہوں کہ تمہاری آواز سننے کو ملے گی۔" وہ خاموش رہی۔

"تم ٹھیک تو ہو ناں......؟"

"جی......! آپ کیسے ہیں......؟"

"ابھی تک تو ویسا ہی ہوں...... کوئی تبدیلی نہیں آئی۔"

"گویا تبدیلی کا امکان ہے......؟"

"بالکل ہے......! جب تم اتنی شدت سے یاد آؤ گی تو......"

"کسی اور کو بلاؤں......؟" وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

"نہیں......! اوروں سے پھر بات کر لوں گا۔"

"آج صبح ہی دادی آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔"

"شٹ اپ......! تم اپنی کہو......! کتنا یاد کرتی ہو مجھے......؟"

"اتنا......!" وہ ہنسی اور برآمدے میں قدموں کی آواز سن کر بالکل غیر ارادی طور پر سلسلہ منقطع کر گئی پھر اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی افسوس ہوا اور خود پر جھنجھلاتے ہوئے کچن کی طرف چل پڑی۔

ㅇㅇㅇ

وقت اگر کچھوے کی چال چلتا تھا۔ تب بھی ڈیڑھ سال کا عرصہ تو گزر ہی گیا تھا۔ اس دوران آفتاب بھائی اور شہلا کی شادی ہو گئی تھی گو کہ دادا تیار نہیں تھے لیکن سب نے انہیں راضی کر لیا تھا جبکہ مینو، عثمان کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ حالانکہ وہ سونیا سے چھوٹی تھی اور سونیا کی کیونکہ وہی ضد تھی کہ ایم اے مکمل کرنے کے بعد شادی کرے گی اس لئے چھوٹی امی مینو کے فرض سے سبکدوش ہو گئیں۔ البتہ وہ مینو کے جانے سے اکیلی ہو گئی تھی۔ کیونکہ سونیا کے ساتھ اس کی بنتی نہیں تھی۔ پھر رفتہ رفتہ مینو کی جگہ شہلا بھابی نے لے لی تو اس کا وقت اچھا کٹنے لگا۔

خضر کی واپسی میں ابھی چھ ماہ تھے اور دادی ابھی سے اس کی شادی کی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ دادا بھی یہی چاہتے تھے کہ خضر کے آتے ہی اس کی شادی کر دیں۔ یوں تو انہیں اپنی اولادوں کی ساری اولادیں پیاری تھیں لیکن اس کے حصے میں زیادہ محبت اس لئے آئی تھی کہ امی کے جانے کے بعد دادی ہی ایک طرح سے اس کی ماں بن گئی تھیں اور انہیں سب سے زیادہ فکر بھی اس کی رہتی تھی۔ ان دنوں وہ اسے جانے کب کب کے کپڑے نکال کر دکھاتیں کہ یہ تمہاری شادی کے لئے رکھا ہے۔ کسی کو سینے کے لئے کہتیں کسی پر کڑھائی کرنے کے لئے۔ وہ اگر موڈ ہوتا تو مشین لے کر بیٹھ جاتی ورنہ آج کل پر ٹال دیتی۔ اس وقت بھی وہ اپنی ایک شرٹ سینے کے بعد شہلا بھابی کو دکھانے جا رہی تھی کہ فون کی بیل سن کر رُک گئی۔ ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا لیکن دوسری طرف خاموشی رہی۔

"ہیلو......! کون......؟" اس نے دو تین بار پوچھا لیکن دوسری طرف پتا نہیں کون تھا جو بول کے نہیں دیا تب اس نے جھنجھلا کر ریسیور پٹخ دیا اور بڑبڑاتے ہوئے آ رہی تھی کہ سونیا نے ٹوک دیا۔

"کسے گالیاں دے رہی ہو......؟"

"اس خبیث کو جسے ہمارے ٹیلی فون کے نمبر ڈائل کرنے کا شوق ہے۔"

"کون......؟" سونیا چونک کر دیکھنے لگی۔

"مجھے کیا پتا کون ہے...... ؟ ہیلو ہیلو کرتے رہ جاؤ دوسری طرف سے کوئی آواز ہی نہیں آتی۔"

"اسے تمہاری آواز پسند ہوگی۔"

"اچھا......! پھر تو اسے میری آواز میں گالیاں بھی پسند آئیں گی۔" وہ کہتی ہوئی شہلا بھابی کے کمرے میں گھس گئی۔ انہیں اپنی سلی ہوئی شرٹ دکھائی اور پھر کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر واپس آرہی تھی کہ سونیا کی آواز سن کر ٹھٹک کر رُک گئی۔ وہ فون پر کوئی آہستہ آواز میں بات کر رہی تھی پھر بھی اس نے سن لی۔

"سنو......! اس طرح فون مت کیا کرو۔"

"تمہاری احتیاط کے باوجود کسی کو شبہ ہوسکتا ہے اور میں ابھی تمہارے بارے میں کسی کو نہیں بتانا چاہتی۔"

"بس......! اسے تم میری مجبوری سمجھو اور پھر ابھی تم بھی تو اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوئے۔ کسی قابل ہو جاؤ پھر......"

وہ چاہتی تو اس سے آگے بھی سن سکتی تھی لیکن اتنی بات نے ہی جہاں اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا وہاں دُکھ بھی پہنچایا تھا۔ کچھ بھی سہی سونیا بہرحال اس کی چچازاد تھی اور اشعر سے منسوب بھی۔

وہ بہت خاموشی سے وہاں سے پلٹ کر اوپر آگئی۔ بڑی امی حسبِ عادت کچن میں مصروف تھیں۔ وہ انہیں ذرا کی ذرا اپنی جھلک دکھا کر اشعر کے کمرے میں آگئی۔ وہ غالباً ابھی آفس سے لوٹا تھا جو جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے......؟" وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ شاید اندرونی کیفیات کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح فوراً خود پر قابو پا کر اسے ہلکا پھلکا جواب نہیں دے سکی تو کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور ٹیبل پر سے میگزین اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ جبکہ اس کا ذہن مسلسل سونیا کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

"کیا سونیا نے کچھ کہا ہے......؟" اس نے فوراً قیاس کر کے پوچھا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

"نہیں......!"

"پھر یقیناً خضر بھائی یاد آرہے ہوں گے......؟"

"جی نہیں......! مجھے کوئی یاد نہیں آرہا۔" وہ میگزین رول کر کے اس کی طرف اُچھال کر بولی تو وہ ہنس پڑا۔

"یار......! کبھی تو اعتراف کرلیا کرو۔ ویسے بھی اب کم وقت رہ گیا ہے...... آنے والے ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں......؟"

"تمہیں واقعی کچھ نہیں کرنا۔ سارا کچھ تو ہمیں ہی کرنا ہے۔ تم تو آرام سے دُلہن بن کر بیٹھ جاؤ گی۔"

اس کے شرارت سے چھیڑنے پر اس کی دھڑکنیں مخصوص راگ الاپنے لگیں تو وہ فوراً سنبھل کر بولی۔

"تم کوئی اور بات نہیں کرسکتے......؟"

"بالکل کرسکتا ہوں۔ یہ بتاؤ......! سونیا کیا کر رہی ہے......؟"

"پتا نہیں......!" اس کے ساتھ ہی وہ کھڑی ہوگئی۔

"جا کہاں رہی ہو......؟"

"نیچے......!"

"آئی کیوں تھیں......؟"

"تمہیں دیکھنے...... کیونکہ تمہیں دیکھے بغیر میرا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

وہ خواہ مخواہ غصے میں آکر اس سے لڑنے کو تیار ہوگئی تو وہ ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ عجیب سی جھنجلاہٹ سوار تھی اس پر اور پتا نہیں کہنا کیا چاہ رہی تھی اور نہ کہہ سکنے پر ہی اس سے اُلجھنے لگی تھی۔

"بہت اسمارٹ بنتے ہو ناں تم......! لیکن تمہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے......؟ نہائی فضول ہو تم اشو......!" وہ اپنی بات کہہ کر پیر پٹختے ہوئے چلی گئی۔

اس رات وہ بہت دیر تک اُلجھتی رہی تھی۔ اسے بیچ بیچ سونیا پر بہت غصہ آرہا تھا جو انجانی راہوں پر چل نکلی تھی۔ اس کے خیال میں سونیا کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اشعر کے ساتھ منسوب ہو چکی تھی پھر دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ دلی وابستگی بھی کسی سے چھپی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اسی وقت جا کر سونیا سے پوچھے کہ وہ کیسے دھوکہ دے رہی ہے۔ اشعر کو، جو اس کے چہرے پر پل بھر کو بھی آزردگی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ اس کی خاطر سب سے لڑ جاتا ہے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ سونیا کسی طرح بھی اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرے گی یا اگر اس نے دھڑلے سے اعتراف کر بھی لیا تو وہ کیا کرے گی......؟ جبھی وہ خود ہی سوچتی اور کڑھتی رہی۔ زیادہ اشعر کے لئے کہ سونیا کی بے وفائی پر اسے کتنا دُکھ ہوگا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ بہت خاموشی سے سونیا کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے بہت دیر سے آنے لگی تھی اور ہر روز اس کے پاس ایک نیا بہانہ ہوتا۔ شام میں ٹیلی فون کے آس پاس منڈلاتی نظر آتی۔ بیل بجتے پر فوراً اُچکتی اور کبھی اطراف کا جائزہ لے کر خود ہی نمبر ڈائل کرنے لگتی تھی۔ بہرحال جب اس نے خود کو ہر لحاظ سے بے بس پایا کہ وہ نہ تو سونیا کو روک سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی کو بتا سکتی ہے تو اسے گھر کے باقی لوگوں پر غصہ آنے لگا کہ آخر سب لوگ اس کی طرف سے اتنے غافل کیوں ہوگئے ہیں......؟ کوئی تو اسے سمجھانے والا اور روکنے والا ہو۔ کتنے آرام سے وہ سب کے اعتماد کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ مزید یہ کہ اشعر کو بھی اسی طرح فریب دے رہی تھی۔

پھر ان دنوں گھر میں خضر کی واپسی کی باتیں ہونے لگیں تو اس کا دھیان سونیا کی طرف سے ہٹ گیا۔ دادا دادی کیونکہ یہ طے کر چکے تھے کہ خضر کے آتے ہی ان کی شادی کریں گے تو اس لئے وہ اپنی ادھوری چیزیں مکمل کرنے میں لگ گئی۔ اس وقت بھی وہ اپنے دوپٹے پر بیل ٹانک رہی تھی کہ اشعر کے آنے پر جلدی سے دوپٹہ سمیٹ کر اسے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئے گا اور وہ دیکھ چکا تھا لیکن کسی اور ہی موڈ میں تھا جو اس کے سامنے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"تم اپنا کام جاری رکھو میں تنگ نہیں کروں گا۔"

"کوئی ایسا ضروری کام نہیں ہے۔" وہ دوپٹہ شاپر میں ڈالنے لگی تو اس نے جھپٹ لیا پھر اس کے گھٹنوں پر پھیلاتا ہوا بولا۔

''اسے تم غیر ضروری کہہ رہی ہو......؟ بے وقوف......! غضنفر بھائی کے آنے میں دن ہی کتنے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے سب کام نمٹالو۔''

اس نے دیکھا وہ بہت سنجیدگی سے بات کر رہا تھا تب وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ پھر اچانک، خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

''آج تم آفس گئے نہیں یا جلدی آ گئے ہو......؟''

''گیا تھا لیکن اپنے ایم۔ ڈی کی والدہ نے چھٹی کرا دی۔''

''کیوں......؟''

''وہ نیک خاتون ابدی سفر پر روانہ ہو رہی تھیں۔'' اس نے بتایا تو وہ شاکی نظروں سے دیکھنے لگی کہ یہ کون سا طریقہ ہے بتانے کا اور وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

''بھسم لے لو......! میں نے انہیں ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا تھا۔''

''فضول بکواس مت کرو۔''

''لو...... خاموش ہو جاتا ہوں۔'' اس نے تکیہ کھینچ کر سر کے نیچے رکھا اور بہت خاموشی سے اسے تکتا ہوئے دیکھنے لگا۔ کتنی دیر گزر گئی۔ اسے اُلجھن ہونے لگی تو وہ خاموشی توڑنے کی خاطر کوئی بات شروع کرنے لگی تھی کہ وہ ایک دم اُچھل کر بیٹھتا ہوا بولا۔

''ارے......! ایک بات تو تمہیں بتائی نہیں۔''

''کیا......؟'' وہ اس کے انداز پر پریشان ہو کر دیکھنے لگی۔

''کل غضنفر بھائی کا خط آیا تھا۔''

''یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''نئی بات انہوں نے خط میں لکھی ہے۔'' اس کے پُرتجسس لہجے پر وہ پوری جان سے متوجہ ہونے کے باوجود بظاہر اسی طرح بیٹھی رہی۔ تب وہ خود ہی تفصیل سے بتانے لگا۔

''غضنفر بھائی کی خواہش ہے کہ وہ واپسی میں عمرہ کرتے ہوئے آئیں اور وہ بھی تمہارے ساتھ۔ اس کے لئے انہوں نے یہ تجویز رکھی ہے کہ کسی بھی دن ٹیلی فون پر نکاح کر دیا جائے پھر باقی پروگرام یوں طے ہو گا کہ اُدھر سے وہ جدہ کے لئے روانہ ہوں گے اور اِدھر سے تم......! پھر تم دونوں تو اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے نئی زندگی کی ابتداء کرنا جبکہ یہاں ہم ولیمے کے انتظامات میں لگ جائیں گے...... کیسا ہے......؟''

آخر میں اس سے پوچھنے لگا اور اس کے اندر اچانک ایسی ہلچل مچ گئی تھی کہ وہ کچھ کہنا تو دور کی بات اس کی طرف دیکھ ہی نہیں سکی۔

''امی ابو نے تو ان کی بات سے سو فیصد اتفاق کر لیا ہے اب دیکھو دادا اور دادی اور تمہارے ابو جی کیا کہتے ہیں......؟'' وہ اس کے خاموش رہنے پر بولا۔

''میرا خیال ہے نیک کام ہے۔ کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے...... تمہیں بھی نہیں...... یا تمہیں کوئی اعتراض ہے......؟''

وہ کچھ نہیں بولی۔

''یار......! کچھ تو کہو......! تمہاری جگہ اگر سونیا ہوتی تو......''

''صاف منع کر دیتی۔'' وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

''کیا......؟'' وہ چونکا پھر یقین سے بولا۔

''جی نہیں......! وہ کبھی منع نہ کرتی بلکہ اسی وقت ''قبول ہے'' کہنے پر تیار ہو جاتی۔''

''اچھا......؟'' وہ ذرا سا ہنسی پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔

''ایک بات بتاؤ اشعر......! کیا تم سچ مچ سونیا سے بہت محبت کرتے ہو......؟''

''ارے......! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ میں جان دیتا ہوں اس پر۔''

''اور وہ......؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جلتی جگنوؤں کی شمعیں دیکھ کر اندر ہی اندر سہم کر پوچھنے لگی۔

''وہ بھی......!'' اس کے اتنے یقین سے کہنے پر وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی پھر قدرے تاخیر سے سوچ کر بولی۔

''یوں تو تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں...... ایک دوسرے سے منسوب بھی ہو پھر بھی فرض کرو اگر اچانک کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جائے تو......؟''

''میں ہر رکاوٹ توڑ دوں گا بلکہ کچل دوں گا۔'' وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ ایک دم جذباتی ہو گیا تھا۔

''نا ممکن نشاء......! تم جانتی ہو میں زندگی میں صرف سونیا کے لئے سنجیدہ ہوا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں بھئی......!'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''پھر میں نے تو یونہی مذاق میں بات کی اور تم اتنے جذباتی ہو گئے۔ خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ تمہارے پاس کیا صرف دوسروں کی شادی کی خبریں ہیں، خود اپنی شادی کی خبر کب نشر کر رہے ہو......؟''

''بس......! سونیا ایم اے کر لے بلکہ میرا خیال ہے جب تم غضنفر بھائی کے ساتھ عمرے سے واپس آؤ گی تو یہاں تمہارے ولیمے کے ساتھ ساتھ ہماری شادی بھی تیار ہو گی۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' وہ پھر بے خیالی میں کہہ گئی۔

''کیسا......؟'' وہ شریر ہو گیا۔

''سچ بتاؤ......! کس کی شادی کی دُعا مانگی ہے......؟ میری یا اپنی......؟''

''یا بتا کر اور لگا دو۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''کیا مطلب......؟ میری یا اپنی...... میری اور اپنی۔'' اس نے سوچ کر دہرایا پھر اسے گھورنے لگا تو وہ ہنس پڑی۔

''سمجھنے کی بات ہے۔''

''ہاں......! میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور اب تو تمہیں بھی سمجھنے لگا ہوں۔''

اسی وقت سونیا نے دروازے سے اندر جھانکا اور اشعر پر نظر پڑی تو اندر آتے ہوئی بولی۔

''تم اس وقت یہاں...... ؟ کیا آج آفس نہیں گئے...... ؟''

''گیا تھا...... آ گیا...... اور تم یونیورسٹی نہیں گئیں...... ؟''

''گئی تھی...... آ گئی۔'' وہ اس کے انداز میں کہہ کر بیٹھ گئی۔

''اصل میں آج میری ایک دوست کی برتھ ڈے ہے۔ میں اس خیال سے جلدی آ گئی کہ دوپہر میں کچھ دیر سولوں گی تاکہ شام میں فریش ہو کر جا سکوں لیکن امی صاف منع کر رہی ہیں۔''

''کیوں...... ؟'' اس نے یونہی پوچھا اور وہ شروع ہو گئی۔

''مجھے کیا پتا...... ؟ جا کر امی سے پوچھو۔ ہر بات میں مناسب اور نامناسب کی گردان شروع کر دیتی ہیں۔ اب بتاؤ بھلا...... دوست کی برتھ ڈے میں جانا بری بات ہے کیا...... ؟''

ہرگز نہیں...... ! جب اس نے بلایا ہے تو تمہیں ضرور جانا چاہئے۔''

''صرف بلایا نہیں...... بہت اصرار سے بلایا ہے اور میں وعدہ بھی کر چکی ہوں۔'' وہ باقاعدہ رونے کو ہو گئی۔

''کتنی ناراض ہو گی وہ...... اور امی کو احساس ہی نہیں ہے۔''

''چلو...... ! میں چھوٹی امی سے بات کرتا ہوں۔'' وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

''نہیں اشو...... ! کوئی فائدہ نہیں، امی نہیں مانیں گی...... ؟''

''میں منالوں گا...... تم چلو تو...... ''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا لے گیا تو اس نے بہت خاموشی سے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا پھر چاہا کہ سر جھٹک کر ان کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا لے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ سونیا اپنی ہر جائز ناجائز منوانے کے لئے اشعر کو استعمال کر رہی ہے اور وہ کتنا پاگل ہے جو اس کے فریب کو سمجھ نہیں پا رہا۔ اس کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ اشعر یا گھر کے کسی بھی دوسرے فرد کو سونیا کے بارے میں نہیں بتا سکتی تھی۔ کیونکہ سب ہی جانتے تھے کہ اس کی اور سونیا کی نہیں بنتی اور ایسی صورت میں خود اس کی پوزیشن آکورڈ ہونے کا خدشہ زیادہ تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور سونیا دھڑلے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لینے کے لئے اس پر الزام لگا رہی ہے۔ بہر حال اس کا مقصد سونیا کو بے نقاب کرنا ہرگز نہیں تھا وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ وہ اشعر کو دھوکہ نہ دے۔ کسی غلط راہ کا انتخاب کر کے اس کی محبت کو نہ ٹھکرائے اور پھر وہ دعا کر رہی تھی کہ سونیا جس راہ پر قدم رکھ چکی ہے خود ہی پلٹ آئے۔

○○○

گو کہ ٹیلی فون پر نکاح ہونا تھا۔ اس کے بعد اسے جدہ بھی دو ہفتے بعد جانا تھا، پھر بھی شہلا بھابی اسے سنوارنے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر رہی تھیں۔

''بس کریں شہلا بھابی...... ! کون سا ابھی خضر بھائی اسے دیکھیں گے...... ؟'' سونیا بطور ہیلپر ان کا ساتھ دے رہی تھی بالآخر اکتا کر بولی۔

''دیکھیں نہ دیکھیں...... ! محسوس ضرور کریں گے اور پھر اتنے سارے مہمانوں کے سامنے بھی تو اسے

بیٹھنا ہے۔'' شہلا بھابی اس کے چہرے کو آخری ٹچ دیتے ہوئے بولیں۔ اسی وقت صائمہ آپی آ گئیں۔

''چلو بھئی...... ! جلدی کرو...... ! دادی بلا رہی ہیں۔ خضر بھائی کا فون آنے میں بس پانچ منٹ ہیں۔''

پھر ستائشی نظروں سے اسے دیکھ کر بولیں۔

''ماشاءاللہ...... ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

''باقی تعریف بعد میں کر لیجئے گا...... ورنہ پانچ منٹ یہیں گزر جائیں گے۔''

سونیا نے دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر پر ڈالا جسے پیشانی سے آگے تک کھینچ کر اس نے اپنا چہرہ بھی چھپا لیا اور آہستہ آواز میں صائمہ آپی سے پوچھنے لگی۔

''وہاں کون کون ہے...... ؟''

''اپنے ہی گھر کے سب لوگ ہیں اور قاضی صاحب۔''

صائمہ آپی نے بتایا پھر اسے اپنے ساتھ لگا کر بڑے کمرے میں آئیں تو دادا نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بیک وقت سب کی نظریں وال کلاک کی طرف اٹھیں اور پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔

''ٹک...... ٹک...... ٹک...... '' ہر پل اپنے گزرنے کا احساس دلا رہا تھا اور پھر وہ پل بھی اسی خاموشی سے بیت گیا۔ دادا نے ریسیور اٹھا کر دیکھا کہیں فون خراب تو نہیں۔ فون بھی ٹھیک تھا اور سماعتیں بھی پھر...... ؟''

سب نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر بڑے ابا نے فوراً کال بیک کرائی لیکن دوسری طرف کسی نے ریسیو نہیں کیا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ خضر کہاں ہیں...... ؟ جبکہ یہاں سب کی جان پر بنی تھی۔ کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا اور خاموشی ہی زبان بن گئی تھی۔

''کیا ہوا صاحب...... ؟'' خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی قاضی صاحب کی آواز نے اچانک سب کے احساسات کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ سب اپنی اپنی جگہ چونک ہو کر دادا کو یوں دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا حکم ہے اور دادا اپنے پہلو میں بیٹھی سہمی ہوئی لڑکی کو ایک بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے بولے۔

''نکاح شروع کریں قاضی صاحب...... ! لیکن پہلے فارم ٹھیک کر لیں...... خضر عالم کی جگہ اشعر عالم کا نام لکھ دیں۔''

دادا نے ایک پل میں فیصلہ کیا اور سنا دیا تو بڑے ابا فوراً اٹھ کر غالباً اشعر کو بلانے بھاگے اور وہ کہاں جائے جو گزشتہ دو سالوں سے اپنے دل میں ایک میٹھا میٹھا درد لیے پھرتی تھی۔ کسی سے کہے کہ جس نے یہ درد بخشا وہ اس کے انتظار میں اپنی عمر تمام کر سکتی ہے۔

''ٹپ...... ٹپ...... '' پلکوں پر ٹکے موتی بھی ساتھ چھوڑنے لگے تب مبہم سی آس کہ اشعر بھی راضی نہیں ہو گا کیونکہ وہ سونیا......

''تمہیں قبول ہے...... ؟'' قاضی صاحب کی آواز اور کندھے پر دادا کے ہاتھ کا دباؤ...... اس نے محسوس کیا دادا کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا پھر اس نے اپنے ہاتھوں پر ابو جی کے ہاتھ دیکھے اور سر کو مزید جھکا لیا۔

''ہاں کہو بیٹا...... !'' یہ منت بھری آواز بھی کسی اپنے کی تھی اور یہاں سب ہی اس کے اپنے تھے۔ اس سے بے حد محبت کرنے والے۔ وہ کس کس کی محبت سے دامن چھڑائے۔ کیا وہ سب کو نظر انداز کر کے صرف ایک

شخص کی محبت کا بھرم رکھ سکتی ہے اور شاید وہ ایسا کر گزرتی لیکن وہی بات کہ کبھی کبھی دوسرے کی غلطی ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا سکھا دیتی ہے۔ ابو جی لاکھ ان کی تعریف میں کہیں کہ وہ پڑھی لکھی باصلاحیت خاتون ہیں لیکن اس کے خیال میں ایسی صلاحیت کس کام کی جو عورت کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر اکسائے۔ وہ اس عورت پر صرف فخر کر سکتی تھی لیکن اس کے راستے پر نہیں چل سکتی۔ جستجو اور کھوج کا وہ راستہ جانے کس سمت جاتا ہے جس پر اٹھنے والے قدم اپنے پیچھے صرف الزام چھوڑ جاتے ہیں۔

اس نے ہونٹوں تک آئے ''نہیں'' کو سختی سے روکا جس کے بعد سب کی زبان پر نہ کئی دنوں میں ایک ہی بات آئی تھی کہ جنم دینے والی کا کچھ تو اثر ہوگا اور اس نے ہمیشہ اس ایک بات سے بچنے کی خاطر احتیاطوں کا دامن تھامے رکھا تھا۔ اب بھی نہ یہ دامن جھٹکا گیا نہ سب کی محبتیں نظر انداز کر سکی۔

''بیٹی نشاء...... ! ہاں کہو......!'' دادی کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ جسے اس نے شدت سے محسوس کیا۔

''ہاں......!'' ادھر اس نے دل کی بستی اُجاڑی اُدھر مبارک سلامت کا شور اُٹھا جس میں اس کی سسکیاں دب کر رہ گئی تھیں۔ پھر اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کن کن مرحلوں سے گزرنے کے بعد حجلۂ عروسی تک لائی گئی ہے۔ کیونکہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں اب بھی وہ صرف سن رہی تھی۔ صائمہ آپی، شہلا بھابی، مینو، بڑی پھوپھو اور چھوٹی پھوپھو کی بیٹیاں ثانیہ، دیبا اور فرح سب اس کے گرد جمع تھیں۔ شہلا بھابی اسے نئے سرے سے سنوارنے میں مصروف تھیں اور باقی سب آپس میں مذاق کر رہی تھیں۔

''اشعر کہاں ہے......؟'' دیبا نے شرارت سے اس کے بازو میں چٹکی کاٹتے ہوئے مینو سے پوچھا اور جواب فرح نے دیا۔

''وہ ابھی تک سونیا کو منانے میں لگا ہوا ہے۔ باقاعدہ قسمیں کھا کھا کر یقین دلا رہا ہے کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔''

(اور قصوروار کون ہے......؟)۔ اس کا ذہن دھیرے دھیرے بیدار ہونے لگا اور ابھی وہ فرح کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ بڑی امی نے آ کر سب کو جانے کے لئے کہا اور صائمہ آپی اس نئی صورت حال کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں اس لئے فوراً سب کو لے کر چلی گئیں۔ تب بڑی امی اس کے سامنے بیٹھیں اور اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں تم سے کیا کہوں......؟ حالانکہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میرا مقصد تمہیں بہو بنانا تھا جو پورا ہو گیا لیکن......''

اور ساری خرابی تو اس ''لیکن'' میں تھی پھر بھی یہ بہت غنیمت تھی کہ جو بڑی امی کہنا چاہتی تھیں، وہ سمجھتی تھی اور جو اس پر بیت رہی تھی یا بیتنے والی تھی وہ بڑی امی سمجھ رہی تھیں۔ اپنی بات وہیں چھوڑ کر پھر کہنے لگیں۔

''میں نہیں جانتی خضر نے ایسا کیوں کیا......؟ لیکن میں اس سے پوچھوں گی ضرور......! خیر یہ تو بعد کی بات ہے ابھی تو میں اشعر کی بات کرنا چاہتی ہوں۔ ویسے تم اسے جانتی ہو۔ بس تھوڑا لاابالی اور تھوڑا جذباتی سا ہے۔ میرا خیال ہے وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''اصل مسئلہ سونیا کا ہے اور میں صاف گوئی سے کہوں گی کہ کل تک میرے لئے جیسے تم تھیں ویسے ہی سونیا...... جبکہ اب ایسا نہیں ہے۔ میرے دل میں سونیا کی محبت کم نہیں ہوئی لیکن وہ تمہارے مقام تک نہیں آ سکتی۔ یہی بات اشعر کو بھی سوچنی چاہئے اور اسے یہ باور کرانا تمہارا کام ہے۔''

اس نے پہلی بار سر اُونچا کر کے دیکھا تو بڑی امی خود کو مضطرب ظاہر کرتے ہوئے بولیں۔

''میں سونیا پر روک ٹوک نہیں کر سکتی۔ اوّل تو اسے خود ہی ان نئے حالات اور نئے رشتوں کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ اگر نہیں تو تمہیں خیال رکھنا ہوگا۔ بحیثیت بیوی تم اشعر پر کچھ پابندیاں عائد کر سکتی ہو۔''

اس نے دوبارہ سر جھکا لیا تو بڑی امی جانے کیا سمجھیں۔ اس کو حوصلہ دیتے ہوئے بولیں۔

''تم پریشان مت ہو یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے میں بھی اشعر کو سمجھاؤں گی۔'' پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔

''میں اشعر کو بھیجتی ہوں۔'' اس نے ذرا سی پلکیں اُٹھا کر انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر گہری سانس لینا چاہتی تھی کہ دل میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا۔

اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ کر دبایا تو دل پر بے پناہ بوجھ محسوس ہوا اور یہ بوجھ اچانک تو دل پر نہیں آ پڑا تھا۔ گزرے ماہ و سال میں کتنے رت جگے تھے، کتنی باتیں، کتنی کہانیاں جو اس نے کسی سے نہیں کہی تھیں۔ کیونکہ اس نے کہا تھا۔ نشاء......! اپنی بے قراریوں کا احوال کسی اور سے مت کہنا نہ اپنی محبتوں کے قصے سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرنا۔ میں تمہارے دل کو ایک میٹھا سا درد دیئے جا رہا ہوں۔ اس کی ساری چاشنی میں خود آ کر سمیٹوں گا۔ اور وہ نہیں آیا۔ نہ کسی نے اتنی مہلت دی کہ وہ اس نئے بندھن میں بندھ جانے سے پہلے دل کے سارے بوجھ کہیں اُتار پھینک آتی یا آنکھوں کی راہ میں ہی بہا ڈالتی اور یہ کتنا مشکل تھا کہ اپنا دامن چھڑا نہیں پائی تھی اور دوسرے سے دامن چھڑانے کی بات کرتی۔

(میں اشعر سے کیسے کہہ دوں کہ سونیا کو بھول جاؤ......؟ جواب میں اگر اس نے پوچھ لیا کہ کیا میں نے خضر کو بھلا دیا تو......؟)۔ اس نے دُکھ سے سوچتے ہوئے پیشانی گھٹنوں پر ٹکالی۔

(بس......! ایک رات...... زیادہ نہیں بس ایک رات...... میں دل کے کھلیانوں میں آگ لگا دوں گی اور صبح ہونے تک میرے دل کی زمین نئے سرے سے ہموار ہو گی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آج کی رات مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے......؟ کیا میں دروازہ اندر سے بند کر لوں......؟)۔ اس نے جیسے ہی سر اُونچا کر کے دروازے کی طرف دیکھا اسی وقت وہ کھلتا چلا گیا اور اشعر کو دیکھ کر صرف نظروں کا زاویہ بدل سکی جبکہ اس نے اندر داخل ہونے اور دوبارہ دروازہ بند کرنے تک ہی ذرا مروّت برتی پھر دندناتا ہوا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اور دانت پیس کر بولا۔

''بہت خوش ہو رہی ہو ناں تم......! من کی مراد جو ملی ہے...... یہی چاہتی تھیں تم......! میری اور اپنی شادی...... لو ہو گئی شادی۔''

''ہیں......؟'' وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ کتنا شوق تھا اسے خود کو چھپانے کا پھر جس کا جو دل چاہے اس کے بارے میں قیاس کرتا رہے۔ وہ محظوظ ہوا کرتی تھی اور اب تو اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی نہ کرنا چاہتی تھی پھر بھی اس کی ذات پر آپ ہی آپ پردے گرتے چلے گئے۔

''میں ہی احمق تھا جو تمہارے بار بار اظہار کے باوجود تمہیں سمجھ نہیں سکا لیکن تم تو اچھی طرح جانتی تھیں کہ

میں سونیا سے محبت کرتا ہوں...... پھر تم نے میرے بارے میں کیوں سوچنا شروع کیا......؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ فوراً جھٹلا دیتی لیکن اب حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ جس سے وہ مزید طیش میں آ گیا۔

"اتنی معصوم ہرگز نہیں ہو جتنی نظر آنے کی کوشش کر رہی ہو۔ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ تمہارے خیال سے نکلوں تو خضر کا خیال آئے......؟ اور تم ان سے منگنی ہونے پر خوش نہیں تھیں اس لئے کہ......"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔" وہ بے اختیار کہہ گئی۔ اس کے لہجے میں طنز تھا جسے وہ اپنی جھنجلاہٹ میں محسوس ہی نہیں کر سکا بلکہ اس کی بات سن کر اپنی ہتھیلی پر زور سے مکا مارتے ہوئے بولا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری خوشی میں خوش ہو جاؤں گا......؟ ہرگز نہیں...... ! میرا بس چلے تو تمہیں اٹھا کر اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔"

"پھینک دو......!" وہ ناگواری سے اس کی طرف سے منہ پھیر کر بولی۔

"تم...... ! میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔"

"دبا دو......!"

"تم چپ نہیں رہ سکتیں......؟" وہ دبی دبی آواز میں چیخا۔

"کیوں چپ رہوں......؟ بہت اچھا سوا گت کیا ہے نا تم نے میرا......؟"

"اوہو...... ! یعنی آپ اس انتظار میں تھیں کہ میں آپ کا گھونگھٹ اٹھا کر رونمائی میں دل کا نذرانہ پیش کروں گا......؟ اور پھر آپ کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دوں......؟ تو مائی ڈیئر نشاء...... ! تمہارے حسن کی تعریف یہ ہے کہ تمہاری شکل پہلے جتنی بھی اچھی لگتی تھی اب اتنی ہی زہر لگ رہی ہے اور تمہیں رونمائی میں دینے کے لئے میرے پاس بے شمار گالیاں ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

"گالی دے کر تو دیکھو...... ! ابھی جا کر بڑے ابا سے کہہ دوں گی۔"

"دھمکی......؟" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے۔

"بالکل...... ! دھمکی دوں گی...... کیونکہ میں تمہارے ساتھ بھاگ کر نہیں آئی...... باقاعدہ نکاح ہوا ہے اور سب گواہ یہیں موجود ہیں۔"

"نکاح...... گواہ...... سب زبانی جمع خرچ۔" وہ کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ پھر ایک دم اس کے سامنے رک کر بولا۔

"میں نے ہرگز بھی تمہیں دل سے قبول نہیں کیا اور نہ ہی میرے دل میں جگہ بنا سکتی ہو۔"

(مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے)۔ اس نے سوچا اور اس پر سے نظریں ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ تب وہ کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہنے لگا۔

"مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ سونیا تمہارے ساتھ زیادتی کر جاتی ہے لیکن یہ تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم اس کی زیادتیوں کا بدلہ اس انداز سے لوگی......؟ چہ چہ...... ! اگر تم اس وقت اس کی حالت دیکھو تو تمہیں خود پر شرم آنے لگے گی...... رو رو کر برا حال کر لیا ہے اس نے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو......؟ میں نے کیا کیا ہے......؟"

"گویا تم نے کچھ کیا ہی نہیں......؟" وہ باقاعدہ ملامت کرتا ہوا بولا۔

"تم نے اس کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے...... اس کی سیج پر قبضہ جمایا ہے اور کہتی ہو میں نے کیا کیا ہے......؟"

"سیج......؟" اس نے اپنے اطراف دیکھا۔ اتنی ایمرجنسی میں یہی ہو سکا تھا کہ سرخ گلابوں کی پتیاں بکھیر دی گئی تھیں۔ اس کا دل چاہا وہ کوئی ایسی بات کہہ دے اپنے اور خضر کے حوالے سے یا جس سے سونیا کی محبت کا بھرم کھل جائے اور وہ جو اتنے یقین سے بات کر رہا ہے پل میں ٹوٹ جائے لیکن وہ بہت خاموشی سے مسہری سے نیچے اتر آئی سارے طعنے سن سکتی تھی، زخمی دل پر ہر وار سہہ سکتی تھی لیکن پرائی سیج سے سمجھوتہ نہیں کر سکی۔

"کہاں جا رہی ہو......؟" وہ اس خیال سے کہ کہیں وہ بڑی امی کے پاس نہ چلی جائے قدرے نرم پڑ کر بولا تو وہ کمرے سے ملحقہ اسٹور نما کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پہلے اس کا دروازہ کھول کر اندر کا جائزہ لیا اور اپنے لئے مناسب سمجھتے ہوئے پلٹ کر بولی۔

"ایسا ہے اشعر عالم...... ! کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں جس بندھن میں باندھ دیا ہے اسے نہ تم توڑ سکتے ہو اور نہ میں جبکہ نبھانا بھی بہت مشکل ہے پھر کیوں نہ ہم وقت کا انتظار کریں......؟"

"کس وقت کا......؟"

"اس وقت کا جب یا تو تم بڑی امی اور بڑے ابا سے یہ کہہ سکو کہ اس سیج پر صرف سونیا کا حق ہے اور تم یہ حق کسی اور کو ہرگز نہیں دو گے یا پھر پوری ایمانداری سے میرا حق تسلیم کرتے ہوئے اس بند دروازے پر دستک دے سکو۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اسٹور نما کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بند دروازے سے کمر ٹکاتے ہی ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ جس میں دکھ اور تاسف کے ساتھ قدرے اطمینان اس بات کا غماز تھا کہ اشعر کے ساتھ مذاق میں کہی باتوں نے اس کے راستے کی آدھی کٹھنائیاں سمیٹ لی تھیں۔ اگر حیات کا باقی ماندہ سفر اس کے ساتھ طے کرنا ہوا تو کم از کم یہ خدشہ تو نہیں رہے گا کہ وہ اس کے خلوص یا محبت پر شبہ کر رہا ہے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کی طرف سے اطمینان تھا اور خود اپنی طرف سے حد درجہ بے اطمینانی۔ وہ کیا کرے ابھی کچھ وقت پہلے اس نے فقط ایک رات مانگی تھی کہ وہ دل کا سارا بوجھ آنسوؤں کی راہ بہا ڈالے گی لیکن اب اس نے آنکھوں میں اتری نمی کو چپکے سے اپنے اندر اتار لیا۔

"جلدی کیا ہے......؟ پہلے میں اس اشعر سے تو پوچھ لوں کہ اس نے میرے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا......؟"

اس نے سوچا اور پھر وہیں اپنے سونے کے لئے جگہ بنانے لگی۔

○○○

صبح وہ معمول کے مطابق اٹھی اور اشعر کے کمرے میں آئی تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے گو کہ یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر وہ اس وقت آ کر اسے اٹھایا کرتی تھی لیکن اب وہ بے دھڑک اس کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر اس کے منہ پر نہیں پھینک سکی۔ تب بڑھ کر کھڑکی کے پردے سمیٹ دیئے اور جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ آفتاب بھائی اپنے کمرے سے نکل رہے تھے۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹے

گئی کہ اپنے ہی دوپٹے میں پاؤں اُلجھ گیا اور خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی اس کے بیڈ پر جا گری۔

"کیا مصیبت ہے......؟" نیند خراب ہونے پر اس نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھ کر ناگواری سے بولا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو......؟"

"اُٹھ جاؤ......! صبح ہو چکی ہے۔" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

"وہ تو روز ہی ہوتی ہے...... کوئی نئی بات تو نہیں......؟" ویسے یہ اُٹھانے کا کون سا طریقہ ہے......؟"

وہ اپنی خجالت اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے بظاہر بڑے آرام سے بولی۔

"یہ نیا طریقہ ہے۔"

"اچھا......! کل میرے اوپر آ گرو گی اور کہو گی یہ اور نیا طریقہ ہے۔" اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سن کر اسے دیکھنے لگی اور وہ دوسری طرف کروٹ بدلتا ہوا بولا۔

"جاؤ......! دروازہ کھولو......!"

"میں......؟ نہیں تم اُٹھو......!"

"میں تو ہرگز نہیں اُٹھوں گا۔" اس کے ضدی لہجے پر مجبوراً اسے اُٹھنا پڑا۔ دروازہ کھول کر خود اس کے پیچھے ہو گئی۔ حقیقتاً اس وقت وہ بے حد نروس ہو گئی تھی کہ سب کا سامنا کیسے کرے گی۔

"ارے......!" صائمہ آپی کے ساتھ شہلا بھابی اندر آتے ہوئے بولیں۔

"یہ اشعر ابھی تک سو رہا ہے......؟"

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے بہت دن چڑھ آیا ہو۔" وہ اٹھ کر بیٹھتا ہوا کہنے لگا۔

"ویسے آپ کی حیرت بجا ہے کیونکہ جس لڑکی کے ساتھ میری شادی کی گئی ہے وہ علی الصبح اُٹھنے کی عادی ہے اس حساب سے مجھے اب تک اُٹھ جانا چاہئے تھا۔"

"اچھا......! چلو نکلو یہاں سے۔"

"کیوں......؟ میرا مطلب ہے کہاں جاؤں......؟"

"کہیں بھی...... نیچے دادی کے پاس چلے جاؤ۔"

"اچھا......!" وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا تو اس سے کہنے لگا۔

"چلو شاہ......! دادی کے پاس چلتے ہیں۔"

"شاہ نہیں جائے گی تم جاؤ......!" شہلا بھابی نے اسے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا پھر پلٹ کر ہنستے ہوئے بولیں۔

"بہت شریر ہے۔"

پھر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر سب لڑکیاں اس کے پاس آ بیٹھیں۔ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق اور وہ سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی۔ اصل میں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں سب کے مذاق کو کس انداز سے لے اور پھر کیسا پوز کرے۔ کیونکہ حقیقت یہ تھی کہ اسے نہ تو یہ سب اچھا لگ رہا تھا اور نہ وہ محظوظ ہو رہی تھی۔

"لگتا ہے اشعر نے مسکرانے پر بھی پابندی لگا دی ہے...... کیوں شاہ......!"

فریحہ نے اسے کہنی مارتے ہوئے کہا تو اس نے بس اسے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اسی وقت سونیا کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بلا ارادہ ادھر متوجہ ہوئی تھی اور سونیا کو دیکھ کر پہلے واقعی اسے بڑا عجیب سا لگا۔ اس کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں شدت گریہ کا پتہ دے رہی تھیں جبکہ چہرے پر حزن و ملال جیسے اس پر کوئی قیامت ٹوٹی ہو۔

وہ اگر اسے نہ جانتی ہوتی تب تو واقعی احساسِ جرم میں گرفتار ہو جاتی کہ کسی بھی طرح سہی وہ اس کی محبت چھیننے کی سزاوار ہے لیکن وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اشعر کے ساتھ ہرگز بھی مخلص نہیں ہے۔ جب ہی اس کے غم واندوہ کی تصویر بنے پر بے حد حیران ہوئی کہ آخر وہ اس طرح کیوں پوز کر رہی ہے۔ جس شخص سے اسے سرے سے محبت ہی نہیں اس سے بچھڑنے کا دکھ کیسا بلکہ اسے تو خوش ہونا چاہئے کہ اس کے راستے کی رکاوٹ آپ ہی آپ دور ہو گئی تھی اور ابھی وہ اس کے رویئے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اشعر کی آمد پر یہ گتھی آپ ہی آپ سلجھ گئی۔ ان دونوں کے انداز ہی کچھ ایسے تھے جس سے وہ سمجھ گئی کہ سونیا اشعر کو اپنے فریب سے آزاد نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا مقصد یا تو اب بھی اپنی ہر بات منوانے کے لئے اشعر کا سہارا لینا تھا یا پھر ہمیشہ کی طرح اس مقام پر بھی وہ اسے نیچا دکھانا چاہتی تھی اور یہ طے تھا کہ خود اس نے کبھی پہل نہیں کی تھی۔ البتہ جوابی کارروائی ضرور کرتی تھی۔ اب بھی جیسے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ محض اسے تنگ کرنے کی خاطر خود پر آزردگی کا خول چڑھائے بیٹھی ہے تو جواباً اس نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا لی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کے مذاق کو کس انداز سے لے اور پھر کیسا پوز کرے اور اب اچانک اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خوش اور آسودہ نظر آئے گی جیسے بقول اشعر کے اس نے من کی مراد پالی ہے۔

○○○

پتا نہیں اس گھر کے لوگ بے حس تھے یا پھر بہت زیادہ حقیقت پسند کہ وقت اور حالات کی کروٹ کو اتنی جلدی اور آسانی سے قبول کر لیتے تھے اور گزشتہ کو خواب کی طرح بھول جاتے۔ جیسے اس نے اپنی امی کے بارے میں بھی کسی کو آپس میں بات کرتے نہیں سنا تھا کہ وہ یہاں تھیں بھی یا نہیں۔ اسی طرح اب اس کے بارے میں کسی نے غلطی سے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ خضر کے ساتھ منسوب تھی اور شادی اشعر کے ساتھ ہو گئی۔ اوّل شب بڑی امی نے بات شروع ضرور کی تھی لیکن ان کا مقصد اس امر پر افسوس کرنا نہیں تھا کہ اس کی شادی خضر کے ساتھ نہیں ہو سکی بلکہ وہ اس پر اشعر کی ذمہ داری ڈالنا چاہتی تھیں اور وہ ایسا کر کے خود سہولت سے بری الذمہ ہو گئی تھیں اور اب جتنے بھی محاذ تھے ان پر اسے تنہا لڑنا تھا۔ پہلا محاذ خود اس کے اپنے اندر تھا۔ ایک بے وفا شخص کی نفی کرنے میں اسے اپنی ساری توانائیاں صرف کرنی پڑتی تھیں۔ دوسرے محاذ پر سونیا تھی جو یوں تو سارا وقت خوش باش نظر آتی لیکن جہاں اشعر کے آنے کا وقت ہوتا وہ اپنے گرد اداسیوں کا حصار کھینچ لیتی جیسے اسے کھو کر وہ زندگی ہی سے بیزار ہو گئی ہو۔ پھر اشعر تھا جسے سونیا کے سحر سے نکالنا بہت مشکل نظر آتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی اسے سونیا سے متنفر نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی سچی بات پر بھی اشعر یقین نہیں کرے گا پھر اس میں خود اس کی انا مجروح ہونے کا خطرہ زیادہ تھا۔ اس لئے وہ بس وقت کا انتظار ہی کر سکتی تھی کہ اشعر خود ہی سونیا کے بارے میں جان لے کہ وہ کبھی بھی اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔

کتنے بہت سارے دن گزرنے کے بعد اس نے غور کیا تو اس کی زندگی میں صرف یہ تبدیلی آئی تھی کہ شادی سے پہلے جب اس کا کسی کے پاس بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا تو وہ ابوجی کے کمرے میں بند ہو جایا کرتی تھی اور اب اشعر کا کمرہ تھا۔ گویا اس کے لئے اب بھی کوئی گوشہ مخصوص نہیں تھا جسے وہ اپنی ملکیت کہہ سکتی۔ صبح بڑی امی کے ساتھ مل کر ناشتہ بنانے پھر ناشتہ کرنے اس کے بعد بڑے ابا اور اشعر کے آفس جانے تک وہ اوپر ہی رہتی۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لئے دادی کے پاس چلی آتی۔ پھر جب دوپہر کا کھانا بنانے کا وقت ہوتا تو اوپر آ جاتی۔ گو کہ بڑی امی نے کچن کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی تھی لیکن وہ ان کے ساتھ لگی رہتی اور کھانے کے بعد اگر موڈ ہوتا تو شہلا بھابی کے پاس جا بیٹھتی یا پھر اشعر کے کمرے میں بند ہو جاتی جہاں کبھی تو اسے نیند آ جاتی اور کبھی ساری دوپہر سوچنے میں گزر جاتی۔

شام میں جب اشعر کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ نیچے چلی آتی کیونکہ وہ فوراً اوپر نہیں آتا تھا۔ آفتاب بھائی اور معظم بھائی بھی اس وقت آتے تھے پھر سب آنگن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ جاتے۔ یہ روٹین شروع سے تھی اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ اس کے آنے سے پہلے ہی نیچے آ جاتی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے اور سونیا کے درمیان کوئی بات ہو۔

شروع میں اسے صرف یہ خیال تھا کہ یہ ذمہ داری اس پر بڑی امی نے ڈالی ہے لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ اسے اپنا حق سمجھنے لگی۔ کچھ بھی سہی وہ بہرحال اس کا شوہر تھا گو کہ ابھی تک اسے بیوی کا مقام دینے پر تیار نہیں تھا اور ایسی کوئی خواہش تو فی الحال اس کے اندر بھی نہیں تھی پھر بھی بار بار اس نے سوچتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

(کتنا عرصہ...... ادھر سونیا کی شادی ہوئی نہیں کہ وہ میرے دروازے پر دستک دینے کھڑا ہو جائے گا اور میں مجبور ہوں یا مطلوب دروازہ تو کھولنا پڑے گا)۔

بہرحال پروردہ تو وہ بھی اسی گھر اور اسی ماحول کی تھی جس نے سہی پھر بھی گزشتہ کو خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ ایسی صورت میں کہ خضر نے نہ تو کوئی خط لکھا تھا نہ ٹیلی فون کرتے جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ انہوں نے عین نکاح کے وقت رابطہ کیوں نہیں کیا تھا۔ ایک دو بار بڑے ابا نے فون کیا تھا اور انہوں نے صرف اپنی خیریت بتائی اور یہ کہ جلد آنے کی کوشش کریں گے۔ دوسرے کسی موضوع کی طرف آئے ہی نہیں جس سے اس کے اندر ایک نامعلوم سی کسک کروٹیں لینے لگی تھی۔ وہ انہیں سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن کسی کسی وقت وہ بالکل بے بس ہو جاتی۔ حقائق تسلیم کرنے پر اس کا دل آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ اشعر سامنے ہوتا اور اسے یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی ان دونوں کی شادی ہو چکی ہے کیونکہ اشعر تو کیا خود اس کے اندر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسی پرانے انداز میں اس سے بات کرتی تھی۔ البتہ بات کرتے ہوئے درمیان میں کہیں یہ خیال آ جاتا کہ وہ اب صرف اس کا کزن نہیں بلکہ شوہر بھی ہے تو وہیں خاموش ہو جاتی تھی۔

اس شام نشست برخاست ہوتے پر وہ اشعر کے ساتھ ہی اٹھ کر اوپر آئی تو اپنے کمرے میں آتے ہی وہ اس سے اُلجھنے لگا۔

''تمہیں کیا میری جاسوسی پر مامور کیا گیا ہے......؟''

''کیا مطلب......؟'' وہ بالکل نہیں سمجھی۔

''ہر وقت میرے سر پر سوار رہنے لگی ہو کہ کہیں میں سونیا سے بات نہ کر سکوں۔''

''میں نے تمہیں سونیا سے بات کرنے سے منع نہیں کیا۔''

''پھر نگرانی کیوں کرتی ہو......؟''

''میں نگرانی بھی نہیں کرتی۔'' اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے پھر معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولی۔

''میرا خیال ہے تمہارے دل میں چور ہے جبھی تمہیں ایسا محسوس ہوتا ہے۔''

''کیا کہا......؟'' وہ غرایا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو میرے دل میں کیا ہے......؟''

''نہیں...... ! میں بالکل نہیں جانتی۔''

''تو جان لو...... میرے دل میں صرف اور صرف سونیا کی محبت ہے۔''

''اچھا...... !'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''پتا نہیں اس یکطرفہ محبت کا انجام کیا ہوگا......؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''کوئی مطلب نہیں۔'' وہ جانے لگی تو وہ پیچھے سے پکار کر بولا۔

''سنو...... ! تم مجھے سونیا سے متنفر نہیں کر سکتیں۔'' وہ پلٹ کر دیکھنے لگی تو چڑانے والے انداز میں بولا۔

''میں عنقریب امی سے کہنے والا ہوں کہ اس پیج پر صرف سونیا کا حق ہے اور میں یہ حق کسی اور کو ہرگز نہیں دوں گا۔''

''بڑی امی سے کہنے سے پہلے سونیا سے ضرور پوچھ لینا کہ وہ یہ پیج قبول کرنے پر تیار ہے یا نہیں۔'' وہ جلدی سے کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔

اسے واقعی بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ شکست خوردہ تو وہ بھی تھی۔ لاکھ لکھا سمجھ کر سمجھوتے پر آمادہ ہو جائے پھر بھی انا اور خودداری تو وہ بھی رکھتی تھی۔ وہ کیوں اسے بار بار اپنے وجود کا احساس دلائے۔

(میری بلا سے)۔ اس وقت اس نے جل کر سوچا۔

(سونیا خواہ اشعر کو فریب دے یا مجھ سے کسی جنم کا بدلہ لینے کی غرض سے اس سے محبت کا ڈھونگ رچائے، میں ہرگز بھی ان دونوں کے درمیان نہیں آؤں گی اور یہ اشو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو...... آئندہ میں بھی اس سے بات بھی نہیں کروں گی)۔

''سنو...... ! صبح کے لئے میرے کپڑے پریس کر دو۔'' رات کے کھانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تھی کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہوا بولا۔ وہ ان سنی کر کے اپنے اسٹور نما کمرے میں جانے لگی کہ اس نے کلائی تھام لی۔

''میں نے کچھ کہا ہے تم سے۔''

''سن لیا ہے۔'' وہ اسی کے انداز میں بولی۔

''پھر......؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ خاصی جز بز ہو کر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

''اور وہ تین بار ''ہاں'' تمہارے فرشتوں نے کہا تھا......؟''

''جب اس ''ہاں'' کی کوئی اہمیت نہیں تو پھر رعب کس بات کا جماتے ہو......؟ چھوڑو میرا ہاتھ اور آئندہ مجھ سے بات مت کرنا۔'' وہ اسے دھکیل کر کمرے سے نکلی اور نیچے چلی آئی۔ دادی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا وہ نماز کے بعد تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ چپ چاپ ان کے تخت پر آ لیٹی۔ کچھ دیر بعد دادا آئے اور دادی بھی جانماز لپیٹنے لگیں تو وہ زبردستی آنکھیں بند کر کے سوتی بن گئی۔

''لو یہ سو گئی۔'' دادی نے جھک کر اسے دیکھ کر دادا سے کہا۔

''اب اُٹھانا مت۔'' دادا نے منع کر دیا۔

''نہیں......! اُٹھا تو نہیں رہی لیکن پتا نہیں کس کام سے آئی تھی۔ اشعر سے پوچھتی ہوں۔'' دادی اپنے آپ ہی کہتے ہوئے کمرے سے نکلیں اور نجمی کو پکار کر بولیں کہ اوپر سے اشعر کو بلا لاؤ تو اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ وہ انہیں روک بھی نہیں سکتی۔ کچھ دیر بعد اشعر آیا تو دادی اس سے کہنے لگیں۔

''تمہاری دلہن یہاں سو گئی ہے۔''

''پھر......؟'' وہ بلا ارادہ کہہ گیا لیکن پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

''ہاں......! مجھ سے کہہ کر آئی تھی کہ آج دادی کے پاس سوؤں گی۔''

''اچھا......! میں بھی کسی کام سے آئی تھی۔''

''نہیں دادی......! اسے آپ کی محبت کھینچ لائی ہے۔'' وہ بیٹھا تو جان بوجھ کر اس کی کمر سے اپنی کمر ٹیک دی اور اس کی چوٹی کو ہاتھ پر لپیٹتا ہوا بولا۔

''لڑکیوں کو کبھی کبھار میکے ضرور جانا چاہئے اور اس کا میکہ تو یہی ہے ناں......!''

''ہاں......! میکہ بھی یہی ہے اور سسرال بھی...... اچھا اب تم اسے اُٹھاؤ مت۔''

''ہائیں......؟ میں کب اُٹھا رہا ہوں......؟''

''لیجئے...... جا رہا ہوں۔'' وہ جاتے جاتے اس کے بالوں کو جھٹکا دے گیا تو اس نے بمشکل خود کو چیخنے سے باز رکھا۔

○○○

صبح آنکھ کھلتے ہی اسے بڑی امی کا خیال آیا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کمرے سے نکل کر آئی تو برآمدے میں سونیا مل گئی۔ اس نے اخلاقاً ''صبح بخیر'' کہا اور اس کے قریب سے گزرنے لگی کہ وہ رک کر بولی۔

''سنو......! ذرا اشعر کو نیچے بھیج دینا۔''

''کیوں......؟'' وہ کسی طرح بھی اپنی ناگواری چھپا نہیں سکی۔

''مجھے اس سے کام ہے۔'' سونیا بڑے آرام سے کہہ کر وہیں چیئر پر بیٹھ گئی تو اس کا دل چاہا پوچھے کہ کیا کام ہے اس سے لیکن خواہش کے برعکس کہنے لگی۔

''تم خود...... اوپر چلی جاؤ۔''

''تم جا تو رہی ہو...... بھیج دینا اسے۔'' وہ بظاہر اَن سنی کر کے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اُوپر آ گئی۔ بڑی امی معمول کے مطابق کچن میں تھیں اور وہ ان کے دیکھ کر پوچھنے سے پہلے ہی کہنے لگی۔

''رات ذرا دیر کو دادی کے پاس لیٹی تھی کہ وہیں نیند آ گئی۔''

''ہاں......! اشعر نے بتایا تھا اور دیکھو وہ اُٹھا کہ نہیں۔''

وہ کچن کے دروازے سے ہی پلٹ آئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ میز پر شیونگ بکس رکھے شیو بنا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پتا نہیں کیوں ہنسا پھر اِدھر اُدھر سے اضافی جھاگ تولیے سے صاف کرتا ہوا بولا۔

''ہو آئیں اپنے میکے سے......؟ میرا تو خیال تھا ابھی کچھ دن وہیں رہو گی۔''

''تمہارا خیال نہیں بلکہ تمہاری خواہش ہے کہ میں وہیں رہوں۔''

''جب سمجھتی ہو تو پھر آ کیوں گئیں......؟''

وہ اس کی بات پر بری طرح سلگ گئی۔ دل تو چاہا ہر شے کو ٹھوکر مارتی ہوئی چلی جائے یا پھر چیخ چیخ کر کہے کہ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں نہ میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن وہ نادان نہیں تھی۔ اوّل روز ہی اس نے جان لیا تھا کہ ہنسی مذاق میں کہی باتوں نے اس کے راستے کی آدھی کٹھنائیاں سمیٹ لی ہیں۔ اب بہتر یہی ہے کہ وہ یہ جتا رہے کہ وہ شروع سے اسے پسند کرتی رہی ہے ورنہ نئے سرے سے اسے محبت کا یقین دلانا بہت مشکل ہوگا۔ جب ہی اس کی باتوں پر سلگنے اور طیش میں آنے کے باوجود وہ خود پر ضبط کرنے کی کوشش کرتی کہ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جو اسے اپنی خوش فہمی یا غلط فہمی کا پتا دے۔ اس وقت بھی اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اسے پتا نہیں رحم آیا یا اپنی غلطی کا احساس ہوا جو کہنے لگا۔

''اب آ ہی گئی ہو تو بیٹھ جاؤ۔''

''میں بیٹھنے نہیں آئی بلکہ یہ بتانے آئی ہوں کہ نیچے سونیا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

''کیا کہا......؟'' وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

''سونیا بلا رہی ہے تمہیں......!'' اس نے چیخنے کے انداز میں دہرایا لیکن آواز ہلکی رکھی۔

''کیوں......؟'' وہ کوشش کے باوجود لاتعلقی ظاہر نہیں کر سکا۔

''یہی بات میں نے بھی اس سے پوچھی تھی لیکن اس نے نہیں بتائی کہنے لگی تم سے کوئی کام ہے۔'' وہ قصداً نظریں اس پر جمائے کھڑی رہی جس سے گھبرا کر وہ تولیے سے منہ صاف کرنے لگا تو وہ چھیڑے بغیر نہیں رہ سکی۔

''پہلے شیو تو بنا لو۔''

''پھر آ کر بناؤں گا۔'' وہ تولیہ اس پر پھینک کر کمرے سے نکل گیا تو وہ کھڑی سوچتی رہ گئی کہ اب اس مقام پر اسے کیا کرنا چاہئے۔ اگر دل کا معاملہ ہوتا تو وہ جلتی بھی، کڑھتی بھی اور اس کے پیچھے جانے کا بھی سوچتی جبکہ اب ظاہراً بھی یہ سب کرنے کو دل نہیں چاہا تو اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔

پتا نہیں اس کے اندر کیسی بے کلی سی تھی۔ ناشتے کے بعد دادی کے پاس آ کر بیٹھی تو ان کی باتوں میں بھی دل نہیں لگا۔ کچھ دیر تک یونہی ''ہوں ہاں'' کرتی رہی پھر اُٹھ کر شہلا بھابی کے پاس آ گئی۔ شہلا بھابی ان دنوں نئے مہمان کی آمد کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ چھوٹا سا فراک سیتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر بڑی پیاری

مسکراہٹ تھی۔

''یہ کیا آپ لڑکیوں والے کپڑے سی رہی ہیں......؟ کیا آپ کو بیٹے کی خواہش نہیں ہے......؟''

''بیٹا ہو یا بیٹی...... مجھے تو دونوں ہی اچھے لگتے ہیں۔''

''پھر بھی...... پہلے بیٹا ہونا چاہئے۔''

''اچھا......!'' شہلا بھابی بے ساختہ ہنسیں۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں بیٹے کی خواہش ہے......؟''

''ہیں......؟'' وہ سٹپٹا گئی پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''سونیا یونیورسٹی گئی ہے......؟''

''شاید......!''

''کیا مطلب......؟''

''مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔'' شہلا بھابی پتا نہیں کیوں اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی تھیں کہ وہ اُلجھ کر بولی۔

''کیا بات ہے......؟ آپ کچھ چھپانا چاہ رہی ہیں......؟''

''نہیں......! بلکہ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''سونیا اور اشعر کے بارے میں کہیں گی ناں......؟''

''جب تم سمجھتی ہو تو اشعر کو روکتی کیوں نہیں......؟''

''میں روکوں......؟'' وہ تاسف سے ہنسی۔

''اور صرف اشعر ہی کو کیوں......؟ سونیا کو کیوں نہیں روکا جاتا......؟ بلکہ سارا دارومدار ہی سونیا پر ہے۔ جس روز وہ اپنا رویہ تبدیل کرے گی اشعر آپ ہی آپ پیچھے ہٹ جائے گا۔ جبکہ وہ اسے اپنے گھر سے نکالنا ہی نہیں چاہتی۔ کم از کم میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے......؟''

''پتا نہیں یا شاید تم ٹھیک کہتی ہو لیکن نشاء......! یہ اچھی بات تو نہیں ہے آخر سونیا ایسا کیوں کر رہی ہے؟''

''آپ کو یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا بھابی! اگر شروع سے یہیں رہتی ہوتیں تو سب جان لیتیں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' شہلا بھابی نے اطمینان سے کہا تو وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

''کیا جانتی ہیں......؟''

''یہی کہ سونیا اور اشعر ایک دوسرے سے منسوب تھے۔'' وہ خاموش رہی تو کہنے لگیں۔

''یہ صحیح ہے کہ دونوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن انہیں تمہارا خیال تو کرنا چاہئے۔ اتنے نادان ہیں تو نہیں دونوں پھر کیوں نادانی کر رہے ہیں......؟''

(نادان صرف اشعر ہے)۔ اس نے سوچا اور مزید کوئی بات کئے بغیر ان کے پاس سے اُٹھ کر آئی تو برآمدے سے بیلی نے پکار کر اس کے فون کا بتایا۔

''ہیلو......!'' اس نے ریسیور اُٹھا کر دھیمی آواز میں کہا کیونکہ ابھی تک وہ یہ قیاس کرنے میں لگی ہوئی تھی

کہ دوسری طرف کون ہوگا اور دوسری طرف کی آواز اس کے لئے یکسر اجنبی تھی۔

''کون نشاء......؟''

''جی......! آپ کون......؟''

''بیٹا......! میں تمہاری امی ہوں۔''

''امی......!'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش اور آنکھوں میں اس روانی سے سیلاب اُترا کہ پل میں سارے بند توڑ گیا۔

''بیٹا......! کیا ناراض ہو مجھ سے......؟'' امی پوچھ رہی تھیں اور اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ بے خیالی میں سر نفی میں ہلانے لگی۔

''نشاء......! کچھ بولو ناں......! کچھ تو کہو بیٹا......! تم ٹھیک تو ہو ناں......؟''

''ہاں......!'' حلق سے آواز نکلی بھی تو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

''ارے......! تم رو رہی ہو......؟'' امی نے حیرت اور تشویش کا اظہار ایک ساتھ کیا۔

''رو مت بیٹا......! مجھے بہت دُکھ ہو رہا ہے۔'' وہ خاموش رہی تو پوچھنے لگیں۔

''کیا میں فون بند کر دوں......؟''

''نہیں......!'' وہ فوراً بول پڑی۔

''اچھا تو رونا بند کرو اور جلدی سے اپنے آنسو صاف کرو۔'' امی نے کہا تو وہ جلدی جلدی یوں آنسو صاف کرنے لگی جیسے وہ سامنے کھڑی دیکھ رہی ہوں اور انہوں نے بھی یہی ظاہر کیا۔

''گڈ......! اب بتاؤ کیسی ہو......؟''

''میں ٹھیک ہوں...... آپ بتایئے کہاں سے بات کر رہی ہیں......؟''

''میں آج صبح ہی پاکستان آئی ہوں۔''

''اچھا......!'' وہ انہیں اپنے قریب محسوس کر کے خوش ہو گئی۔

''کہاں ہیں......؟ میرا مطلب ہے کہاں ٹھہری ہیں......؟''

''تم آؤ گی میرے پاس......؟ مجھ سے ملنے......؟''

''ہاں ہاں......! میں آؤں گی...... آپ بتایئے تو کہاں ہیں......؟'' اس کی بے تابی ظاہر کر رہی تھی کہ جیسے وہ ابھی اُڑ کر پہنچنا چاہتی ہو۔

''اپنے ابو جی سے پوچھ لینا انہیں میرا پتا معلوم ہے۔''

''ٹھیک ہے......! میں شام میں آؤں گی۔'' اس نے پُریقین لہجے میں امی کو بھی اچانک خوشی سے ہمکنار کیا اور پھر سلسلہ منقطع کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا اور وہ سوچنے لگی کہ سب سے پہلے کسے یہ خبر سنائے کہ اس کی امی واپس آ چکی ہیں۔ اپنی خوشی میں اسے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ امی کا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں اور ان کے آنے یا نہ آنے کی یہاں کسی کو پرواہ بھی نہیں ہوگی۔ خاصی مگن سی وہ دادی کے کمرے میں داخل ہوئی اور بے اختیار ان کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔

''آج تو میری نتاشہ خوش نظر آ رہی ہے۔'' دادی نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ ان کے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے بولی۔

''خوشی کی بات ہی ہے دادی......!''

''اچھا......! مجھے بھی بتاؤ خوشی کی بات۔''

''وہ......'' اور وہ اُلجھ گئی کہ کیسے یا نہ کہے۔

''بتاؤ ناں......!''

''بتاؤں گی۔'' وہ کہتی ہوئی جلدی سے ان کے پاس سے اٹھ آئی۔

ایک اور کسک، وہ کس سے کہے، یہاں سب اس کے اپنے ہیں اور جیسے کوئی بھی اپنا نہیں۔ وہ سوچتے ہوئے بڑی امی کے پاس آ بیٹھی اور ساری خوشی اور بے تابی چھپا کر بظاہر نارمل لہجے میں کہنے لگی۔

''بڑی امی! ابھی امی کا فون آیا تھا وہ بھی پاکستان میں ہیں اس شہر میں۔ کیا مجھے ان سے ملنا چاہیے؟''

''ہاں......! کیوں نہیں......؟ وہ تمہاری ماں ہیں تمہیں ضرور ان سے ملنا چاہیے۔''

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور بڑی امی کو دیکھنے لگی تو وہ کہنے لگیں۔

''شام میں اشعر آئے تو اس سے کہنا وہ تمہیں ان کے پاس لے جائے گا۔''

''جی......!''

اور اس سے یہ وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ برسوں ان کے بغیر رہی تھی اور اب ایک ایک پل بھاری لگ رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ادھر سے اُدھر ٹہلتی رہی۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی جو کچھ وقت کے لئے بے خبر ہو جاتی۔ پتا نہیں کب شام ہو گی اور کب اشعر آئے گا۔ اس نے سوچتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بج رہے تھے اور ابھی وہ گھنٹوں کو شمار کر رہی تھی کہ اشعر آ گیا اور کیونکہ اس وقت سے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے آتے ہی وہ اسے امی کے پاس چلنے کے لئے کہے گی اس لئے فوری طور پر کوئی اور بات ذہن میں آئی ہی نہیں کہ وہ خلاف معمول جلدی کیسے آیا ہے بلکہ اسے دیکھتے ہی بے اختیار کہہ گئی۔

''اچھا ہوا اشعر......! تم جلدی آ گئے۔ میں بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

''خیریت......؟'' اس کی بے اختیاری کا اس نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ اطمینان سے بیٹھ کر جوتے موزے اتارنے لگا تو وہ قدرے خجل سی ہو کر بولی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟''

''الحمدللہ......! بالکل ٹھیک ہوں۔ اب پوچھو گی جلدی کیوں آیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سونیا کو اس کی کسی دوست کے گھر لے جانا ہے۔'' وہ سر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھ کر قدرے نیم دراز ہو کر بولا تو یہ ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''کیا کہا چاہنے کا ارادہ ہے......؟'' وہ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر شرارت سے بولا۔

''نہیں......! میں پہلے تمہیں باقاعدہ درست کروں گی۔'' وہ ہنستا ہوا اٹھا اور الماری کھول کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک دم پلٹ کر اس سے پوچھنے لگا۔

''سنو......! یہی کپڑے ٹھیک ہیں یا چینج کر لوں......؟''

''تم سونیا کے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گے۔'' وہ الماری بند کر کے اس کے ساتھ کمر ٹیک کر اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

''میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے سونیا کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں......؟ اور تم ہوتی کون ہو مجھے روکنے والی......؟''

''تمہاری بیوی......!''

''ہا بیوی......؟ اگر بیوی بن بھی گئیں تب بھی میں تمہیں یہ اجازت ہرگز نہیں دوں گا کہ میرے معاملات میں دخل دو۔'' وہ اپنی بات کہہ کر واش روم میں گھس گیا جبکہ اس کے اندر باہر سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ بے حد بوجھل قدموں سے ایزی چیئر تک آئی اور اس پر ڈھے سی گئی۔ ذہن کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واش روم سے نکلا تو خاصی عجلت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ دوبارہ جوتے موزے پہنے، بالوں میں برش کیا پھر پرفیوم اسپرے۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

''ویسے تم میرا انتظار کیوں کر رہی تھیں......؟'' وہ اچانک خیال آنے پر آئینے میں اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کوئی خاص بات ہے کیا......؟''

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی تب وہ اسے ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور اس کے جاتے ہی وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ شام ہو گئی اور پھر تاریکی نے اپنے پر پھیلا دیئے لیکن وہ کمرے سے نہیں نکلی۔ دکھ صرف اس بات کا نہیں تھا کہ وہ امی کے پاس نہیں جا سکی تھی اس سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ نہ تو کسی نے اشعر اور سونیا کے ایک ساتھ جانے کا نوٹس لیا تھا اور نہ ہی بڑی امی اس سے پوچھنے آئی تھیں۔ کم از کم اس کے کمرے میں بند ہونے پر کسی کو تو تشویش ہوتی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ اس نے کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا آنگن میں کوئی نہیں تھا البتہ برآمدے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی اور کچھ ہلچل سی بھی محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ گئی۔ صائمہ آپی آئی ہوں گی یا پھر مینو۔ ذرا اور نیچے جھک کر اس نے آوازوں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اشعر اور سونیا آ چکے ہیں یا نہیں لیکن ان دونوں میں سے کسی کی آواز نہیں تھی۔ تب ایک اور کسک۔

(مجھے کیا)۔ کھڑکی سے ہٹتے ہوئے اس نے خود کو بہلانا چاہا لیکن اندر کہیں، ایک پھانس سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی جس نے اسے قدرے بے چین کر دیا اور پھر کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے وہ جانے کیا کچھ سوچے جا رہی تھی کہ دروازے پر دستک سن کر رک گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ دستک دوبارہ ہوئی اور پھر دروازہ کھول کر ظفر سامنے آ گئے۔ وہ ٹھٹک سے رہ گئی۔ کتنے بہت سارے بوجھ تھے دل پر وہ سارے ہمک ہمک کر اس کے وجود کو جھنجھوڑنے لگے جبکہ ان کے ہونٹوں پر وہی پہلے والی مسکراہٹ تھی۔

''تمہیں میرے آنے کا پتا نہیں چلا یا تم قصداً یہاں بیٹھ کر میرے آنے کا انتظار کر رہی تھیں......؟'' اسے محسوس ہوا وہ بچھڑی ہوئی ہے کیونکہ کوشش کے باوجود نظروں کا زاویہ تک نہیں بدل سکی۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم خفا ہو گی لیکن اس سے زیادہ یقین تمہارے مان جانے کا ہے۔'' وہ اس کی طرف

بڑھتے ہوئے بولے۔

"میرے خدا!" اس نے شدت سے آرزو کی کہ کوئی آ جائے اور اشعر آ گیا۔ دروازے ہی سے چہکتا ہوا۔

"کمال ہے بڑے بھائی...... ! آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔" وہ دونوں بغل گیر ہو گئے اور وہ اچانک ہوش میں آ گئی۔ خود کو خاصا پُرسکون کر کے بیٹھی اور باری باری دونوں کو دیکھنے لگی۔

"کہاں گئے تھے......؟" خضر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھنے لگے۔

"سونیا کو اس کی کزن کی برتھ ڈے میں لے گیا تھا۔"

"اچھا......!" وہ ذرا سا ہنسے پھر کہنے لگے۔

"یہ طے ہے کہ تم ساری زندگی بھی سونیا کی خوشامد کرتے رہو تب بھی وہ تم سے شادی پر راضی نہیں ہوگی۔"

"ہاں...... ! یہ بلا جو میرے گلے پڑ گئی ہے۔" واقعی نادان تھا۔ ان کی بات سمجھے بغیر کہہ گیا جبکہ وہ ایک دم چونک گئے۔

"کیا مطلب......؟"

"ہائیں......؟ یعنی آپ کو پتا ہی نہیں کہ جس روز آپ کا نکاح ہونا تھا اور آپ کا فون نہ آنے کی صورت میں میری شامت آ گئی۔"

"تم......؟" انہوں نے بے خیالی میں اسے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ دونوں کے لئے چائے لاؤں......؟"

"صرف ہم دونوں کے لئے کیوں......؟ اپنے لئے بھی لاؤ۔" وہ اسے دیکھ کر جس انداز سے مسکرایا، وہ سمجھ گئی کہ اس پر جتانا چاہ رہا ہے کہ وہ اسے سونیا کے ساتھ جانے سے نہیں روک سکی۔

جب وہ چائے لے کر آئی تو وہ بولے جا رہا تھا اور خضر چپ چاپ سے تھے۔ اسے ان پر اس مسافر کا گمان ہوا جسے تمام راستہ یہ خبر نہ ہو سکی کہ وہ درمیان ہی میں کہیں لُٹ چکا ہے۔ ایک لمحہ کو اس کے دل کو دھچکا سا لگا لیکن پھر فوراً ہی ان سے متنفر نظر آنے لگی۔ دل پر صرف ان کی بے وفائی کا زخم نہیں تھا بلکہ بعد کے تمام حالات کے ذمہ دار بھی وہ تھے۔

"بس کرو......!" وہ بے خیالی میں چائے کے کپ میں چمچ چلائے جا رہی تھی کہ اشعر کے ٹوکنے پر چونک گئی پھر کپ اٹھا کر اس کے سامنے رکھا اور سائیڈ ٹیبل سے میگزین اٹھا کر بظاہر اس میں مصروف ہو گئی۔

"یہ کیا لے کر بیٹھ گئی ہو......؟" کچھ دیر بعد وہ اس کی لاتعلقی محسوس کر کے اس کے ہاتھ سے میگزین جھپٹ کر ذرا جھلاتا ہوا بولا۔

"اتنے عرصے بعد آئے ہیں خضر بھائی ان کا حال احوال پوچھو اور......"

"اور......؟" جتنا خود کو سنبھال رہی تھی اتنا ہی ذہن بھٹک رہا تھا۔ پہلے بے دھیانی میں ہونٹوں سے نکلا پھر قصداً معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ کر بولی۔

"اور کیا پوچھوں......؟"

"یہی پوچھو کہ عین نکاح کے وقت یہ کہاں غائب ہو گئے تھے......؟"

"یہ تم پوچھو...... کہ کتنا نقصان تمہارا ہوا ہے۔"

"تم [illegible] ہو۔" وہ جل کر بولا۔

"ہاں یار تم تو سراسر فائدے میں رہی ہو تو کم از کم ان کا شکریہ ہی ادا کر دو۔"

"جی نہیں......!"

"کیوں......؟"

"اب تو یہ یہیں رہیں گے اور ان کی مجھ پر بے شمار مہربانیاں ہیں...... ایک ایک کر کے سب کا شکریہ ادا کروں گی۔"

"یہ تم دونوں کیسی باتیں کر رہے ہو......؟" خضر جان کر انجان بنے۔

"اگر میری وجہ سے لڑ رہے ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"ارے نہیں خضر بھائی......!" وہ اسے گھورنے کے بعد ان کے ہاتھ تھام کر خوش دلی سے بولا۔

"ہم آپ کی وجہ سے کیوں لڑیں گے......؟"

(کتنے معصوم بن رہے ہو)۔ اس نے سوچا اور کمرے سے نکل آئی پھر رات کا کھانا سب نے ایک ساتھ کھایا۔ اس کے بعد ابو جی نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا اور جیسے ہی ان کے سامنے گئی وہ پوچھنے لگے۔

"تمہیں شام میں اپنی امی کے پاس جانا تھا۔ کیوں نہیں گئیں......؟" وہ فوراً کوئی جواب نہیں دے سکی۔

"تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ انہوں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" وہ بے حد افسردہ ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"لیکن میں کیا کرتی۔ کوئی مجھے لے جانے والا ہی نہیں تھا۔"

"اشعر سے کہا تھا......؟"

"جی......! لیکن اسے اپنا کوئی کام تھا۔"

"ہوں......!" کچھ دیر تک ابو جی پُرسوچ انداز میں اسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

"اگر تم چاہو تو صبح آفس جاتے ہوئے میں تمہیں ان کے پاس چھوڑ دوں گا۔"

"جی......! میرا مطلب ہے میں صبح آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"ٹھیک ہے......! اب تم جاؤ۔" وہ ان کے پاس سے اٹھ کر آئی تو فوراً اوپر جانے کو دل نہیں چاہا۔ برآمدے میں رُک کر کچھ دیر سوچا پھر سونیا کے پاس چلی آئی۔

"ارے......!" سونیا نے اسے دیکھ کر جانے کیوں حیرت کا مظاہرہ کیا جسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

"کیا کر رہی تھیں......؟"

"کچھ نہیں......! آؤ بیٹھو......!" وہ بیٹھ تو گئی اور پھر سمجھ میں نہیں آیا اس سے کیا بات کرے۔

"پریشان ہو......؟" سونیا اس کی کیفیت بھانپ کر پوچھنے لگی اور اس کے چونک کر دیکھنے پر بولی۔

"فطری سی بات ہے۔ خضر بھائی بتا کر بھی تو نہیں آئے۔ اس لئے تو ڈسٹربنس تو ہوگی۔"

''میں ڈسٹرب نہیں ہوں۔'' اس کا لہجہ بڑا اکھڑا ہوا تھا۔

''اچھا......!'' سونیا ہنس پڑی۔

''پھر ادھر ادھر کیوں بھٹکتی پھر رہی ہو......؟ فرار کیوں ڈھونڈ رہی ہو......؟ جاؤ ان کا سامنا کرو۔''

''میں ان کا سامنا کر چکی ہوں۔'' وہ بری طرح سے تلملا کر بولی۔

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں فرار ڈھونڈتی ہوئی تمہارے پاس آئی ہوں......؟ میں تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ آخر تم کب تک اشعر کو الو بناتی رہو گی......؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''تمہیں مطلب سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے سونیا! تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔''

''مجھ پر کوئی الزام رکھنے سے پہلے بہتر ہے کہ جا کر اپنے شوہر نامدار کو سمجھاؤ۔''

اس کی بات پر سونیا جس طرح سے اکھڑنے لگی تو وہ بھی اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکی۔

''اسے سمجھانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ تمہارے اصلی چہرے کی بس ایک جھلک ہی کافی ہو گی۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو تم......؟'' سونیا اس کی بات پر چونکنے کے باوجود تنک کر بولی۔

''صرف اتنا کہ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتی ہوں جسے بہت پہلے تم نے اشعر پر فوقیت دے دی تھی۔''

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی اور اسے سناٹے میں چھوڑ کر چلی آئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ جیسے انتظار میں بیٹھا تھا۔

''کہاں چلی گئی تھیں......؟''

''کیوں......؟'' وہ جیسے سارے حساب آج ہی بے باق کر دینا چاہتی تھی۔

''سیدھے سیدھے میری بات کا جواب دو۔''

''تمہیں اس سے کیا......؟ میں کہیں بھی جاؤں اور تم ہوتے کون ہو پوچھنے والے......؟''

''تمہارا شوہر......!''

''ہاشوہر؟'' اس نے اس کے شام والے لہجے کی نقل کی اور اپنے کمرے میں جانے لگی تو وہ پکار کر بولا۔

''میری بات سنو......!''

''کہو......!'' خاصا عجلت بھرا انداز تھا۔

''دیکھو......! اس وقت نہ تو میں مذاق کے موڈ میں ہوں اور نہ تم سے الجھنا چاہتا ہوں لہٰذا آرام سے بیٹھ کر میری بات سنو۔'' اس نے ایک لمحہ کو سوچا اور پھر کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تو وہ کہنے لگا۔

''وقت کو پیچھے موڑ دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے اس لئے ہم اپنے آپ کو کچھ دیر کے لئے اس وقت میں فرض کر لیتے ہیں جب ہم صرف کزن اور اچھے دوست تھے۔ بلا جھجک اپنی بات ایک دوسرے سے کر لیا کرتے تھے۔ اب بھی میں اسی طرح بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا بات......؟'' اس نے چونک کر دیکھا اور وہ نظریں چرا کر بولا۔

''بہت ساری باتیں ہیں۔ میں بات شروع کرتا ہوں۔ تم سنتی جاؤ اور جہاں ضرورت سمجھو ٹوک دو۔''

وہ بالکل نہیں سمجھ پائی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے اس لئے کرسی کی پشت سے کمر ٹیک کر پوری توجہ سے اسے دیکھنے لگی اور وہ کہنے لگا۔

''میں نہیں جانتا کہ تمہیں اس بات سے کوئی دلچسپی ہے یا نہیں پھر بھی میں سب سے پہلے تمہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ نکاح کے وقت خضر بھائی نے فون پر رابطہ کیوں نہیں کیا تھا......؟''

''میرے خدا......!'' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور جو اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی تو قدرے انجان بن کر اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔

''زیادہ تفصیل میں کیا جاؤں...... بس اس روز صبح ہی خضر بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور جس وقت یہاں ہم ان کے فون کا انتظار کر رہے تھے وہ ہاسپٹل میں بے ہوش پڑے تھے۔ اس کے بعد دو ہفتے ہاسپٹل میں رہے۔ میں یہ اس لئے بتا رہا ہوں کہ اگر تمہارے دل میں ان کی طرف سے کوئی بدگمانی ہو تو دور کر لو۔''

اگر وقت کی لگام اس کے ہاتھوں میں ہوتی تو یہ جان کر کہ وہ شخص بے وفا نہیں ہے، وہ کس قدر شانتی محسوس کرتی لیکن وقت پر دسترس نہیں تھی جبھی اسے ٹوک کر بس اس قدر کہہ سکی۔

''میں ان کی طرف سے بدگمان نہیں ہوں۔''

''لیکن دادا تو بدگمان ہو گئے تھے ناں......؟ جب ہی تو آنا فانا فیصلہ سنا دیا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میں اور سونیا ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور اس لئے میں اس شادی سے سمجھوتہ بھی نہیں کر سکا۔ تم میری کزن اور دوست ہو سکتی ہو لیکن میں تمہیں محض بیوی نہیں بنا سکتا۔ جبکہ تم جانتی ہو کہ میرے دل میں جو مقام سونیا کا ہے وہ میں کسی کو نہیں دے سکتا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''ہو سکتا ہے باقی گھر والے اور تم اس انتظار میں ہو کہ سونیا کی شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا تو میں تمہاری یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں کہ خواہ سونیا بیاہ کر سات سمندر پار چلی جائے تب بھی میرے دل میں اس کی محبت کم نہیں ہو گی۔''

''ان ساری باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے......؟'' وہ اکتا کر بولی۔

''عجیب نادان لڑکی ہو...... میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی بھی وقت ہے ہم اپنی خواہش کے مطابق حالات بدل سکتے ہیں۔'' وہ پرسوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی تو وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا۔

''اپنا نہیں تو میرا خیال کرو...... میں سونیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا تمہیں میرا اجازت نامہ چاہئے......؟''

''اجازت نامہ نہیں...... آزادی کا پروانہ...... میرا مطلب ہے ہم دونوں امی ابو کے سامنے جا کر یہ کہیں کہ ہم اس بندھن کو نہیں نبھا سکتے اس لئے باہمی رضامندی سے الگ ہو رہے ہیں۔''

''اشعر......!'' وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی اور خاصی تاخیر سے بولنے کے قابل ہوئی تو تاسف سے بولی۔

''تم سچ مچ پاگل ہو گئے ہو...... میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔''

''سوچ لو......!''

''کبھی نہیں......!'' وہ کرسی پیچھے دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یاد رکھو...... ! ساری زندگی انتظار کی صلیب پر لٹکتی رہ جاؤ گی اور میں تمہارے دروازے پر دستک نہیں دوں گا۔"

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے تمہاری دستک کا انتظار ہے......؟"

"خود تم نے......!"

"اور اب یہ بھی میں ہی کہہ رہی ہوں کہ تم دستک دو گے اور میں اپنے کان بند کر لوں گی۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

بس ایک رات۔ کبھی اس نے سوچا تھا کہ وہ دل کے کھلیانوں میں آگ لگا دے گی اور آج کی رات جب اس نے اپنا محاسبہ کیا تو معلوم ہوا کہ دل کی بستی تو جانے کب کی اجڑ چکی تھی۔ بس ایک بے وفائی کا زخم تھا جسے ابھی تک اشعر کی پہلی بات نے اگر مندمل نہیں کیا تھا تو اس کی ٹیسیں ضرور کم ہو گئی تھیں۔ اس طرف سے مطمئن ہوئی تو اشعر کی دوسری باتوں کو سوچ کر اس کے اندر نئے سرے سے ایک نئی آگ دہک اٹھی۔

قصور اس کا بھی تھا جو اول روز ہی سمجھوتے پر آمادہ ہو کر اپنی ہستی کا غرور مٹا بیٹھی تھی۔ جب ہی تو وہ جتا رہا تھا کہ وہ اس کی دستک کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

"نہیں اشعر عالم...... ! اتنی ارزاں میں ہرگز نہیں ہوں۔" وہ دل میں اسے مخاطب کر کے بولی اور پھر تکیے میں منہ چھپا کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔



صبح اذان کی آواز کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

(امی کے پاس جانا ہے)۔ اسے خیال آیا اور فوراً اٹھ گئی۔ اپنے کمرے سے نکل کر آئی تو پہلے وضو کر کے نماز پڑھی پھر باہر آئی تاکہ بڑی امی کو بتا سکے کہ وہ ابو جی کے ساتھ جائے گی۔ بڑی امی برآمدے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ کچن میں آ کر بیٹھی تو تیزی سے خضر کھڑے نظر آئے۔ اس کی طرف ان کی پشت تھی اور وہ فوراً ان پر سے توجہ ہٹا کر بڑی امی سے کہنے لگی۔

"آج میں ابو جی کے ساتھ امی کے پاس جاؤں گی۔"

"کل کیوں نہیں گئی تھیں......؟" بڑی امی نے یونہی پوچھ لیا۔

"کل میں نے اشعر سے کہا تھا لیکن وہ سونیا کے ساتھ کہیں چلا گیا۔"

اس کے غصے بھرے انداز پر بڑی امی خاموش ہو رہیں تب وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"خضر بھائی اٹھ گئے ہیں۔ میں انہیں چائے دے دوں۔" پھر کچن میں آ کر مگ میں چائے ڈالی اور لے کر ان کے پاس آئی تو وہ قدرے چونک کر بولے۔

"ارے...... ! تم نے اتنی جلدی چائے بھی بنالی۔"

"چائے بننے میں کیا دیر لگتی ہے......؟" وہ کرسی کھینچ کر ریلنگ کے پاس بیٹھ گئی اور اندھیرے اجالے کا سنگم دیکھنے لگی۔

"اشعر بھی اٹھ گیا ہے کیا......؟" وہ دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"نہیں...... ! اس کی روٹین وہی ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔" وہ اس کا اشارہ سمجھ کر بولے۔

"ہاں...... ! مجھے رات ہی اندازہ ہو گیا تھا اور یہ اچھی بات تو نہیں ہے۔ زندگی میں آنے والی تبدیلی متوقع ہو یا غیر متوقع پھر تو بندے کو خود کو اس کے مطابق ڈھالنا ہی پڑتا ہے۔ وہ کیوں اب تک رد کیا ہے......؟"

"کیا......؟" اس نے قصداً انجان بن کر پوچھا تو انہوں نے بھی گول مول سا جواب دیا۔

"جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔" وہ ہنس پڑی۔

"دو ڈھائی سال کا عرصہ اتنا زیادہ تو نہیں ہوتا اور اتنے عرصے میں وہ بوڑھا تو ہونے سے رہا۔"

"میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ ثناء......!" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولے۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟ کیا تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ تمہیں چھوڑ کر سونیا کے ساتھ......"

"کہیے...... ! رک کیوں گئے......؟" وہ ان کے ہونٹ بھینچ لینے پر چیخ کر بولی۔

"آپ بھی میرے سر الزام رکھ دیجئے کہ میں اس سے غافل ہوں یا میں نے جان بوجھ کر اسے ڈھیل دے رکھی ہے۔ آخر سب لوگوں نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ اسے سمجھانا روکنا یا باز رکھنا صرف میری ذمہ داری ہے؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کراتے ہوئے بولے۔

"باقی لوگوں کو بھی اسے سمجھانا چاہئے۔"

"سمجھایا انہیں جاتا ہے جو سمجھتے نہ ہوں...... بدلحاظوں کو بندہ کیا سمجھائے......؟" وہ بدتمیزی سے کہتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ آئی۔



امی کے سینے سے لگتے ہی جانے کب کب کے رکے ہوئے آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اور آنسو تو امی کی آنکھوں میں بھی تھے لیکن انہوں نے ضبط کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ مسلسل اس کی پیٹھ سہلا کر اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کرتی رہیں پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

"یونہی رونے میں وقت گزار دو گی تو پھر مجھ سے بات کب کرو گی......؟ ابھی دن گزر جائے گا اور شام میں تمہارے ابو جی تمہیں لینے آ جائیں گے۔ آؤ میں تمہارا منہ دھلا دوں۔" امی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اسے لے کر بیسن کے پاس آئیں تو وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ یہ بھی نہیں کہا کہ میں خود دھو لوں گی۔ امی نے پانی اس کے منہ پر ڈالا پھر تولیے سے صاف کیا تو وہ اپنے آپ کو چھوٹی بچی محسوس کرنے لگی۔

"جب تم چھوٹی تھیں تب تمہارا منہ کون دھلاتا تھا......؟" امی تولیہ اسٹینڈ پر پھیلاتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگیں۔

"تب...... میرا مطلب ہے کبھی دادی کبھی بڑی امی اور کبھی چھوٹی امی۔"

"کیسے ہیں سب لوگ......؟"

"ٹھیک ہیں...... اچھے ہیں لیکن کوئی بھی آپ کو یاد نہیں کرتا۔" وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے صاف گوئی سے بولی۔

''اچھا......!'' امی ذرا سا ہنسیں۔

''میرے لئے صرف تمہارا یاد کر لینا ہی بہت ہے بیٹا...... !خیر یہ بتاؤ دوپہر کے کھانے میں کیا کھاؤ گی؟''

''میں......'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کسی اور کو نہ پا کر ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے پوچھنے لگی۔

''آپ اکیلی ہیں......؟''

''ہاں......! میں ایک طویل مدت سے اکیلی ہی رہتی آ رہی ہوں۔ باہر جانے سے پہلے بھی میں اسی اپارٹمنٹ میں تھی۔''

''آپ کو کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا......؟''

''نہیں......! شاید اس لئے کہ میں اپنی زندگی میں مصروف اتنی رہی کہ کبھی خیال ہی نہیں آیا۔''

''کتنی عجیب بات ہے کہ آپ کو تنہا رہ کر بھی کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا اور میں اتنے سارے لوگوں میں رہنے کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرتی رہی۔'' وہ اپنی رو میں کہہ گئی اور امی چونک کر دیکھنے لگیں۔

''کیا مطلب......؟ سب لوگ تمہارے ساتھ......''

''بہت اچھے ہیں۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''میرا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ دادا، دادی جان چھڑکتے ہیں مجھ پر۔ اسی طرح بڑے ابا اور بڑی امی بھی ہیں باقی سب لوگ بھی پھر بھی پتا نہیں کیسے تنہائی کا احساس میرے اندر پروان چڑھتا رہا۔ ایک آپ کے نہ ہونے سے ورنہ اور تو کوئی کمی نہیں۔ خیر آپ آ گئی ہیں تو اب ایسا نہیں محسوس ہو گا۔''

''مجھے بھی تمہاری کمی محسوس ہوتی تھی لیکن میں تمہاری طرف سے مطمئن بھی تھی کیونکہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔''

اس کا دل چاہا پوچھے کہ جب سب لوگ اچھے تھے تو پھر آپ چھوڑ کر کیوں چلی گئیں لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔

''تم نے کھانے کا نہیں بتایا۔'' امی کو پھر کھانے کا خیال آیا۔

''رات میں نے تمہارے لئے کچھ بنایا تھا اور پھر بہت دیر تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔''

''اگر رات کے اس ''بہت کچھ'' میں تھوڑا سا بھی ہے تو دوپہر میں ہم وہی کھا لیں گے۔ آپ کھانے کا زیادہ تکلف اور تردد نہ کریں۔ بس میرے پاس بیٹھی رہیں۔'' وہ صوفے پر ہی پاؤں اوپر سمیٹ کر بیٹھی اور پھر اپنا سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے بولی۔

''پتا ہے امی......! کبھی کبھی آپ مجھے بہت یاد آتی تھیں اور میرا دل چاہتا تھا کہ یا تو آپ میرے پاس آ جائیں یا پھر میں اُڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں اور کبھی کبھی میں یونہی آپ سے خفا ہو جاتی تھی۔''

''جب ہی مہینوں میرے خط کا جواب نہیں دیتی تھیں......؟''

''ہاں......!'' اس نے سادگی سے اعتراف کیا پھر کہنے لگی۔

''مجھے آپ پر غصہ آنے لگتا تھا کہ آپ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئیں پھر ایک روز ابو جی نے مجھے سمجھایا کہ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہونی چاہئے۔''

''اچھا......! یہ بتاؤ شعر کیسا ہے......؟'' امی نے قصداً موضوع تبدیل کیا۔

''ٹھیک ہیں......! کل شام ہی تو باہر سے آئے ہیں۔'' اس نے بتایا تو امی حیران ہو کر بولیں۔

''کیا مطلب......؟ کیا وہ دوبارہ باہر چلا گیا تھا......؟''

''وہ آئے ہی کب تھے جو دوبارہ جاتے......؟''

''میں کچھ نہیں بیٹا......! تمہارے ابو نے تو جب مجھے تمہاری شادی کی اطلاع دی تھی تو یہ بتایا کہ......''

''اس کے بعد ابو نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میری شادی اشعر کے ساتھ ہوئی ہے......؟'' وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

''اشعر کے ساتھ......؟'' امی مزید حیران ہوئیں تو اس نے بتا دیا کہ دادا نے کیسے آناً فاناً فیصلہ سنا کر اس کی شادی کروا دی تھی۔

''یہ تو سراسر زیادتی ہوئی۔'' اس کی ساری بات سن کر امی نے کہا۔ ان کا انداز سوچتا ہوا اور لہجے میں بس تاسف ہی تھا جسے محسوس کر کے وہ خاموش رہی تب وہ پوچھنے لگیں۔

''تم خوش ہو......میرا مطلب ہے اشعر کے ساتھ......؟'' وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔

''بتاؤ ناں بیٹا......؟'' ایک پل کو اس نے سوچا کہ وہ انہیں بعد کے حالات بھی کہہ سنائے لیکن پھر بس اتنا کہہ سکی۔

''اصل میں اشعر اور میں ابھی تک اس نئے رشتے سے سمجھوتہ نہیں کر سکے۔ شاید اس لئے کہ سب کچھ اچانک اور غیر متوقع تھا۔''

امی کتنی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا تم سے کیا کہوں......؟ جب تم دونوں اس رشتے پر راضی نہیں تھے تو پھر خاموش کیوں رہے......؟ منع کر دیتے۔''

''کہنا آسان ہے۔'' اس کی ہنسی میں استہزا تھا۔

''کیا تم پر جبر کیا گیا تھا......؟''

''نہیں......! پتا نہیں بڑے ابا نے اشعر کو کیا کہہ کر سمجھایا کہ وہ نکاح کے لئے راضی ہو گیا......؟ اور مجھے آپ کا خیال تھا۔''

''میرا......؟'' امی چونک کر دیکھنے لگیں۔

''ہاں......! مجھے ساری زندگی آپ کا خیال رہا کہ کہیں مجھے آپ کا طعنہ نہ سننا پڑے حالانکہ کبھی کسی نے آپ کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کی پھر بھی میں نے ہمیشہ احتیاطوں کا دامن تھامے رکھا۔ جانے کیوں میرے اندر یہ خوف رہا کہ جہاں میں نے کسی کی مرضی کے خلاف کوئی بات کی تو مجھے فوراً آپ کا طعنہ ملے گا کہ اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی اور میں یہ سننا نہیں چاہتی۔''

وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے بچ سے امی پر کیا بیت رہی ہے۔ جب خاموش ہوئی تو امی کچھ کہے بغیر اُٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس گھر کے حوالے سے اس سے کوئی

بات نہیں کی۔ شام میں ابو جی اسے لینے آئے اور وہ جانے کے لئے تیار تھی لیکن امی نے روک لیا۔ حالانکہ سارا دن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ابو سے کہنے لگیں۔

"نشاء ابھی کچھ دن میرے پاس رہے گی۔" ابو جی نے اسے دیکھا تو وہ امی کی بات رکھنے کی خاطر بولی۔

"جی......! اگر آپ اجازت دیں تو......؟"

"میری اجازت کیا معنی رکھتی ہے بیٹا......؟ تم اشعر سے پوچھ لو۔" اس کے اندر تلخی بھرنے لگی۔ بے حد ضبط سے بولی۔

"میں فون پر بڑی امی سے بات کرلوں گی۔"

"او کے......!" ابو جی چلے گئے۔

○○○

وہ امی کے ساتھ رہتے ہوئے خوش بھی تھی ساتھ ہی نامعلوم سے اندیشوں نے بھی آن گھیرا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں جانے کیا کچھ ہو جائے۔ اشعر جب اس کی موجودگی میں مخالف نہیں ہوتا تھا تو اب تو بالکل آزاد ہوگا اور عجیب بات یہ تھی کہ اب وہ کسی طرح بھی "مجھے کیا" کہہ کر سر نہیں جھٹک پا رہی تھی اور اپنی اس تبدیلی پر وہ خود حیران رہ گئی۔ دس دن اس نے متضاد کیفیات میں گزارے۔ کبھی سوچتی اشعر برا نہیں ہے اور کبھی اس کی باتیں اور حرکتیں یاد کر کے جھنجھلانے لگتی پھر وہی اسے لینے آیا۔ انداز بتا رہا تھا جیسے زبردستی بھیجا گیا ہے تب اس کا دل چاہا جانے سے صاف منع کر دے لیکن جب امی نے مزید رکنے کے لئے نہیں کہا تو مجبوراً اس کے ساتھ چل پڑی۔

"اتنے خاموش کیوں ہو......؟" راستے میں وہ اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی اور جواب میں وہ دھاڑ کر بولا۔

"تمہیں اس سے کیا......؟"

"آرام سے بات نہیں کر سکتے......؟"

"نہیں......!"

"نہیں......!" وہ اس کی نقل اتار کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

"سنو......!" کچھ دیر بعد وہ اسے متوجہ کر کے کہنے لگا۔

"میں اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ اپنے لئے الگ انتظام کر رہا ہوں۔"

"کیوں......؟"

"میری مرضی......! اور اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلی چلنا۔"

"میں چاہوں۔" وہ ذرا سا ہنسی۔

"اور تم کیا چاہتے ہو......؟"

"میں تمہیں قتل کر دینا چاہتا ہوں۔"

"تو اس گھر میں کرو...... سب کے سامنے تاکہ تمہاری جی داری کا پتا چلے۔"

"جی داری تو ایسی دکھاؤں گا کہ سب یاد کریں گے۔" وہ اچٹتی نظریں اس پر ڈال کر بولا پھر گیٹ سے

اندر گاڑی روک کر اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تو وہ جلدی سے اتر کر اس سے پہلے ہی اندر چلی آئی۔

برآمدے میں سونیا کھڑی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے جانا چاہتی تھی کہ اس نے روک لیا۔

"سنو نشاء......!" وہ رکی ہی تھی کہ وہ دندناتا ہوا سر پر پہنچ گیا۔

"سیدھی اوپر چلو نشاء......!" وہ اس کے تیز لہجے پر سچ مچ سہم گئی پھر بھی فوراً اس کی بات پر عمل کرنے کے بجائے سونیا کو دیکھا جو کھسیا کر وہاں سے جا رہی تھی۔

"تم چلو......! میں ابھی آتی ہوں۔" وہ کہہ کر سونیا کے پیچھے جانے لگی کہ اس نے کلائی تھام لی اور تقریباً کھینچتا ہوا اوپر لے آیا۔

"عجیب پاگل آدمی ہو۔" کمرے میں آتے ہی وہ اس پر بگڑنے لگی۔

"یہ کون سا طریقہ ہے......؟ میں آ تو رہی تھی اور پھر سونیا......"

"سونیا کا نام مت لو اور خبردار آئندہ اس سے بات کی تو۔" اس کے وارننگ دینے پر وہ چڑ کر بولی۔

"ارے واہ......! خود تو دنیا جہان کے قصے سناتے پھرتے ہو اس کے ساتھ اور میں بات نہ کروں؟"

"بس......! میں منع کر رہا ہوں تمہیں۔"

"اول تو تمہیں منع کرنا ہی نہیں چاہئے اور اگر کر رہے ہو تو کیوں......؟"

"میں وجہ بتانے کا پابند نہیں ہوں۔"

"اس طرح تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہاری بات ماننے کی پابند نہیں ہوں۔"

"شٹ اپ نشاء! مجھ سے بحث مت کیا کرو ورنہ کسی دن طیش میں آ کر میں سچ مچ تمہارا خون کر دوں گا۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسے دیکھ کر ہونٹ بھینچ گئی۔ وہ واقعی بہت غصے میں لگ رہا تھا۔ آنکھیں اچانک بہت لال ہو گئی تھیں کہ وہ اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی اور محض اس کے سامنے سے ہٹنے کی خاطر بولی۔

"میں بڑی امی کے پاس جا رہی ہوں۔"

"امی نیچے ہیں۔ جب اوپر آئیں تب ان سے مل لینا۔"

گویا اس نے نیچے جانے سے بھی منع کر دیا جبکہ خود چلا گیا پہلے اس نے سوچا اس کے پیچھے جائے لیکن اس کا مرنے مارنے والا لہجہ اتنا خطرناک تھا کہ وہ ہمت نہیں کر سکی اور وہیں بیٹھ کر سوچنے لگی کہ آخر اسے ہوا کیا ہے۔

کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ تب اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی پھر کمرے سے نکل کر تمام لائٹس جلاتے ہوئے ریلنگ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ نیچے نظریں دوڑائیں تو کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ البتہ برآمدے میں چلنے پھرنے اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے غصہ آنے لگا کہ آخر وہ اسے یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے۔

"تم کب آئیں......؟" اپنے پیچھے [illegible] کی آواز سن کر اس نے ذرا سی گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر پہلے والی پوزیشن میں آ کر بولی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔"

"یہاں کیوں کھڑی ہو......؟ میرا مطلب ہے اکیلی...... اشعر کہاں ہے......؟" وہ اس سے کافی فاصلے سے ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"اشعر......؟" وہ سوچ کر بولی۔

"ابھی تو یہیں تھا...... میرا خیال ہے پیچھے گیا ہے۔"

"تم اسی کے ساتھ آئی ہو ناں......؟"

"جی......!"

"پھر تو اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔"

"کیا......؟" وہ چہرہ ان کی طرف گھما کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میری اور سونیا کی شادی کے بارے میں۔" ان کا انداز بہت سرسری سا تھا اور وہ بھی نہ چونکی نہ حیران ہوئی البتہ غیر یقینی کی کیفیت میں تھی۔ وہ کہنے لگے۔

"یہ مت سمجھنا نشاء......! کہ میں تمہارا گھر بچانے کے لئے سونیا سے شادی کر رہا ہوں بلکہ میرے پیش نظر صرف اور صرف سونیا ہے جس کی طرف سے سب لوگ یا تو واقعی بہت مطمئن ہیں یا قصداً آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ کوئی روک ٹوک نہیں جبکہ میرے خیال میں لڑکیوں کو سراسر ان کی مرضی پر چھوڑ دینا خود ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ بہرحال سونیا اس گھر کی لڑکی ہے اور اس گھر کی عزت اور ناموس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری ہم مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم ہی اپنی ناموس کی حفاظت نہ کر سکے تو باہر سے آنے والے تو اور مذاق ہی بنائیں گے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔" معاً انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور وہ جو ان پر نظریں جمائے کھڑی تھی سٹپٹا کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے کہا تھا کہ وقت اور حالات کے کروٹ بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ انسان ان دونوں کے سامنے بے بس ہے۔ ہم اپنی زندگی کے بارے میں کتنے پلان بنا لیتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو ہمارے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔"

"ہاں......؟" اس نے "ہاں" کی صورت گہری سانس لی اور دور آسمان پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

"مجھے آپ کا بروقت فیصلہ اچھا لگا۔ خدا آپ دونوں کو خوش رکھے۔"

"شکریہ......!" ان کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی جواباً وہ بھی مسکرائی اور انہیں وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آئی تو اشعر کا رقعہ یاد آتے ہی سوچا۔

(تو اصل قصہ یہ ہے اشعر عالم کہ تم سونیا کی شادی سے دلبرداشتہ ہو رہے ہو اور سونیا......)۔ اور اسے لگا اس بار وقت نے کروٹ بدلتے ہوئے لگا میں اس کے ہاتھوں میں تھما دی ہوں۔ کوئی ایک بات بھی تو نہیں بھولی تھی وہ۔ اشعر کا بار بار جتانا کہ وہ سونیا سے محبت کرتا اور سونیا کا اشعر کو مسلسل اپنی طرف مائل رکھنا۔ اس کا دل چاہا وہ ابھی اشعر کے سامنے جا کر خوب اونچے قہقہے لگائے جواباً اس کی جو حالت ہوتی اسے سوچ کر خاصی محظوظ ہو رہی تھی کہ وہ آ گیا اور اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر کہنے لگا۔

"اگر دادی اس وقت یہ دیکھ لیں کہ تم اکیلی بیٹھی ہنس رہی ہو تو تشویش میں مبتلا ہو جائیں گی کہ تم پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے۔"

"نہیں! دادی کو پتا ہے کہ میں جن کی قید میں ہوں۔" وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی بولی۔

"اچھا......! پھر تو تمہیں کسی شہزادے کا انتظار ہوگا جو آ کر تمہیں اس قید سے رہائی دلائے......؟"

"میں ایسی فضول باتیں نہیں سوچتی اور تمہیں بھی شرم آنی چاہئے۔" وہ ناگواری سے بولی تو وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر سامنے رکھی کرسی کو پیر کی ٹھوکر سے گراتا ہوا بولا۔

"جب اس گھر کی لڑکیوں نے شرم گھول کر پی لی ہے تو میں کیوں شرم کروں......؟"

"سب لڑکیوں کو ایک لاٹھی سے مت ہانکو اشعر......! اور یہ تم مجھے کس بات کا غصہ دکھا رہے ہو......؟ میں تو کبھی تمہارے راستے کی دیوار نہیں بنی۔" وہ اس کی بات پر سلگ کر بولی۔

"حالانکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ سونیا کو کبھی تم سے محبت نہیں تھی۔ اسے صرف اپنی جائز ناجائز منوانے کے لئے تمہارا سہارا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ مجھ سے اس کی عداوت بھی تم جانتے ہو۔"

"تم......!" وہ ایک دم کمزور پڑ گیا۔

"کیا تم جانتی تھیں کہ سونیا کسی اور سے......"

"ہاں......!" وہ اپنی رو میں کہہ گئی۔ پھر فوراً سنبھل کر بولی۔

"نہیں......! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تم اب بھی اس کی پردہ پوشی کر رہی ہو......؟" وہ متعجب ہو کر بولا۔

"تم لاکھ چھپاؤ نشاء......! لیکن میں جان چکا ہوں۔ ابھی کچھ روز پہلے میں نے خود اس کی باتیں سنی تھیں۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ اسے اس سے بہتر ساتھی مل گیا ہے۔" اس کا اشارہ خضر بھائی کی طرف تھا۔

"خضر بھائی کی طرف کیوں......؟ اس کا اشارہ تمہاری طرف بھی تو ہو سکتا ہے......؟"

"اب اتنا نادان نہیں ہوں میں۔" وہ اس کے آرام سے کہنے پر چڑ گیا۔

"پھر کتنے نادان ہو......؟"

"بس اتنا کہ تمہاری محبت کو نہیں سمجھ سکا۔" وہ اچانک نادم نظر آنے لگا۔

"اب یہ مت کہنا شروع کر دینا کہ پلیز نشاء......! مجھے معاف کر دو......! مجھ سے غلطی ہوئی وغیرہ وغیرہ کیونکہ میں ہرگز تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" وہ خاصی لاپرواہ ہو گئی۔

"اللہ رے......! خوش فہمی...... تم سے معافی مانگ کون رہا ہے......؟" وہ پل میں رنگ بدل گیا اور اپنے پرانے لہجے میں اس کا مذاق اڑاتا ہوا کہنے لگا۔

"تمہاری محبت کو سمجھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں بھی تم سے محبت کرنے لگا ہوں محبت تو میں اب بھی۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کمرے سے نکل آئی۔ کچھ دیر بڑی امی کے پاس بیٹھی پھر دادی کے پاس چلی آئی اور اس وقت تک ان کے پاس رہی جب تک انہوں نے جانے کے لئے نہیں کہہ دیا۔ اوپر جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چپ چاپ آ کر برآمدے میں بیٹھ گئی۔ عجیب بے کلی سی تھی۔ نہ صرف اشعر پر بلکہ اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

"نشاء......!" سونیا کے پکارنے پر چونک کر دیکھنے لگی۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو......؟"

"بس یونہی......!"

"کیا اشعر سے لڑائی ہو گئی ہے......؟"

(دوستی کب تھی......؟)۔ اس نے سوچا اور سونیا کو دیکھ کر آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اصل میں شام میں وہ اسے غصے میں تمہیں کھینچتا ہوا لے گیا تھا کہ میں بھی......"

"ہاں......! شام میں تم کچھ کہہ رہی تھیں......؟" اس نے بات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں بس یہ کہنا چاہتی تھی کہ تم تو جانتی ہو کہ ایک لڑکا مجھے فون پر تنگ کرتا رہا ہے تو اس کے بارے میں خضر یا اشعر کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔" سونیا نظریں چرا کر بولی تو وہ ذرا سا مسکرائی۔

"ان دونوں کو پہلے ہی سے معلوم ہے۔"

"کیا......؟" سونیا کو جیسے کرنٹ چھو گیا اور وہ اسی اطمینان سے بولی۔

"ہاں......! مجھے ابھی اشعر نے بتایا تھا اور خضر بھائی سے بھی اسی نے کہا کہ اس سے پہلے کہ سونیا کوئی غلط قدم اٹھائے آپ اس سے شادی کر لیں۔"

"تو کیا اشعر......" انتہائی غیر یقینی اور شاک کے عالم میں سونیا پتا نہیں کیا کہنا چاہ رہی تھی اور وہ مزے لے کر بولی۔

"اشعر کو تم جانتی تو ہو۔ شرارت اس کی رگ رگ میں سمائی ہے۔ کہتا ہے اپنے تئیں سونیا مجھے الو بناتی رہی۔ یہ نہیں پتا کہ خود الو بن رہی ہے۔ بہر حال بھول جاؤ سب۔"

وہ اس کے ہاتھوں کو ہلکے سے تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اتنی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر آئی کہ سانس پھول گیا۔ کچھ دیر وہیں ٹھہر کر اپنا سانس درست کیا پھر بہت احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اشعر کو سوتا دیکھ کر جلدی سے اپنے اسٹور نما کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیا۔

(واہ شاہ......!)۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس نے خود کو سراہا تھا۔ ایک ذرا سے جھوٹ سے اس نے سونیا والا محاذ تو فتح کر ہی لیا تھا اور باقی محاذوں پر اب اسے لڑنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ہتھیار ڈالنے سے پہلے بندہ تھوڑا بہت تو اپنے دفاع کی کوشش کرتا ہی ہے اور یہی حال اشعر کا بھی تھا۔

کافی حد تک مطمئن ہو کر اس نے تکیے پر سر رکھا اور پلکیں موند رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک سن کر بری طرح چونکی اور اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

(میرا وہم)۔ اس نے سر جھٹکا ہی تھا کہ دوبارہ وہی آواز۔

"ٹک، ٹک، ٹک" اور خود کو روکنا کوئی اتنا "مشکل" تو نہیں تھا لیکن وائے دل کی ستم ظریفی کہ سارے محاذوں پر فتح کے جھنڈے گاڑتے ہوئے اس محاذ پر باغی ہو گیا تھا۔ وہ لاکھ سمجھاتی رہی لیکن اس کی "ٹک، ٹک" کے ساتھ ہم آواز ہونے سے باز نہیں آیا۔

⊖ ⊖ ⊖

رم جھم برسا موسم

نوکری کے بعد اب رہائش کا مسئلہ تھا جسے پہلے اس نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی بلکہ گھر سے نکلتے ہوئے اماں کو بھی پورا اطمینان دے آیا تھا اور خود بھی یوں مطمئن تھا کہ وہیں اسکول کے کسی کمرے میں سو جایا کرے گا لیکن اب اسکول کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ لائن سے بنے ہوئے چند کمرے تھے۔ کوئی باؤنڈری وال نہیں۔ چاروں طرف کھلے میدان تھے۔ کہیں کہیں کوئی پیڑ اپنی تنہائی پر نوحہ کناں۔ پچھواڑے میدان کے اختتام پر نہر بہہ رہی تھی۔ اسکول میں کوئی باتھ روم نہ پانی کا نل۔ گویا نہانے دھونے کے لئے اس نہر پر جانا پڑتا اور گرمیوں میں تو ایسا ممکن تھا جبکہ اب سخت سردیاں تھیں۔ دیہاتوں میں یوں بھی سارے موسم پوری شدتوں کے ساتھ آتے ہیں۔

یہ اس قصبے کا واحد پرائمری اسکول تھا اور اس میں ایک ہی ماسٹر یونس جس نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا جبکہ وہ متعجب تھا۔

"تم اکیلے پانچ جماعتوں کو کیسے پڑھاتے ہو......؟"

"صبح دیکھ لینا۔ خیر......! اب تو تم آ گئے ہو کوئی مشکل نہیں ہو گی۔" یونس نے کہا تو وہ اسکول کی عمارت پر نئے سرے سے نظر ڈالنے کے بعد پوچھنے لگا۔

"تم یہیں کے رہنے والے ہو یا کہیں اور سے آئے ہو......؟"

"بہاولنگر سے آیا ہوں اور تم......؟" یونس نے بتانے کے ساتھ پوچھا تو اس کے ذہن پر چونکہ اپنا مسئلہ سوار تھا اس لئے جلدی میں اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔

"یہاں کہاں رہتے ہو......؟"

"چچا کے ہاں اور لگتا ہے تمہارا یہاں کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے۔"

یونس نے اس کے ایک ہاتھ میں بیگ اور دوسرے میں بستر بند دیکھ کر کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"ٹھیک سمجھے ہو۔"

"ارے......! چار دن یہاں رہو گے سب رشتے دار ہو جائیں گے۔ چاچا، ماما، تایا، پھوپھا۔ ویسے تم آ کہاں سے رہے ہو......؟"

"رحیم یار خاں سے۔"

"بلے بلے..... ! وہاں تمہیں نوکری نہیں ملی.....؟"

"ملتی تو یہاں آتا.....؟" اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے سامان چھوڑ دیا۔ تب غالباً یونس کو احساس ہوا۔ فوراً ایک بچے کو پکار کر کہا۔

"اوئے شیدے.....! (رشید) ماسٹر جی کے لئے کرسی لے کر آ۔"

"سلام ماسٹر جی.....!" بچے نے کرسی رکھنے کے ساتھ اسے سلام بھی کیا۔ پھر ماسٹر یونس سے پوچھنے لگا۔

"یہ بھی ہمیں پڑھائیں گے ماسٹر جی.....؟"

"صرف پڑھائیں گے نہیں ڈنڈا بھی چلائیں گے۔ کیا سمجھے.....؟ چلو جاؤ اپنی جماعت کو املا کراؤ۔"

یونس نے تھپڑ مار کر رشید کو بھگایا پھر اس سے پوچھنے لگا۔

"چائے وائے پیئو گے.....؟"

"پہلے میری رہائش کا مسئلہ حل کرو اس کے بعد چائے کی بات کرنا۔" اس نے کہا تو یونس نے پہلے ایک لڑکے کو چائے لانے کے لئے بھیجا پھر اس کے سامنے دوسری کرسی رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"رہائش کا مسئلہ بڑا گھمبیر ہے۔ چھوٹی جگہ ہے یہاں زیادہ لوگ.....ایک منٹ.....!" یونس کچھ یاد آنے پر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"ہے تو سہی ایک کمرہ لیکن تم شاید وہاں نہیں رہ سکو گے۔"

"کیوں.....؟"

"اس کی مالکن بڑی بدزبان لڑاکا عورت ہے۔ اللہ کی پناہ.....!" یونس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"کمرہ کیسا ہے.....؟ میرا مطلب ہے دوسری سہولتیں بھی ہیں.....؟" اسے مالک مکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"بس اوپر کی چھت ہے جس پر ایک کمرہ اور غسل خانہ ہے البتہ کچن نہیں ہے اور راستہ بھی باہر سے نہیں بلکہ اندر سیڑھی ہے۔ جس سے آتے جاتے ہوئے اس عورت سے سامنا ضرور ہوگا۔" یونس نے آخر میں پھر اسے اس عورت سے خائف کرنا چاہا لیکن وہ بڑے آرام سے بولا۔

"مجھے عورت سے کیا لینا دینا.....؟ تم بس مجھے کمرہ دلاؤ۔"

"میں.....؟ نہ بابا.....! تم خود چلے جاؤ.....! میں تمہیں راستہ سمجھا دیتا ہوں۔" یونس کے اچھلنے پر وہ پہلی بار ٹھٹک کر پوچھنے لگا۔

"کیا بہت خطرناک عورت ہے.....؟"

"خطرناک سے بھی خطرناک.....اس قصبے کا کوئی مرد اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ لوگ اسے دور سے دیکھ کر راستہ بدل جاتے ہیں۔"

"اکیلی رہتی ہے یا اور بھی کوئی ہے اس کے ساتھ.....؟"

"ایک بیٹا ہے۔ خیر جب تک کوئی دوسرا انتظام نہیں ہوتا تم کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لو۔ میرا مطلب ہے اسی کے گھر میں۔" یونس نے پہلے ڈرایا تھا پھر تسلی دینے کے ساتھ اسے راستہ سمجھایا تو وہ اسی وقت اپنا سامان لے

کر چل پڑا۔

ایک سیدھی سڑک تھی۔ اس کے بعد دائیں طرف کچے میں اتر کر دوسری گلی میں چوتھا مکان تھا جس کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے آس پاس کے دوسرے گھروں کو دیکھا تو اور کوئی ایسا گھر نظر نہیں آیا جس کے اوپر کمرہ بنا ہو۔ تب اس نے سامان نیچے رکھ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔ تیسری دستک پر دروازہ بڑے جارحانہ انداز میں کھلا اور چوکھٹ میں جو تصویر فٹ ہوئی اسے دیکھ کر چند ثانیے کو وہ خود تصویر ہو گیا تھا۔ کیونکہ خطرناک کے ساتھ اس کے تصور میں بھاری بھرکم بھینس نما عورت تھی جبکہ دروازے میں انتہائی دلکش خدوخال کی مالک بائیس چوبیس سالہ لڑکی نمودار ہوئی تھی جس کے نقوش بھی بڑے دلکش تھے۔ اس کی بے خودی کا دورانیہ طویل ہو سکتا تھا اگر جو ادھر سے سوال نہ ہوتا۔

"کیوں جی.....؟ کون ہو تم.....؟ کس سے ملنا ہے.....؟"

"آپ.....؟" وہ چونکا پھر سنبھلا۔

"وہ میرا مطلب ہے مجھے معلوم ہوا ہے یہاں کوئی کمرہ کرایے کے لئے خالی ہے.....؟"

"کہاں سے آئے ہو.....؟" سوال کے ساتھ اسے سرتا پا دیکھا گیا۔

"رحیم یار خان سے۔"

"یہاں کیا کرنے آئے ہو.....؟"

"نوکری.....! وہ جو اسکول ہے وہاں۔" وہ اس کے انٹرویو لینے سے جز بز ہو کر بولا۔

"کیوں.....؟ وہ ماسٹر یونس چلا گیا کیا.....؟"

"نہیں.....! وہ بھی پڑھائے گا اور میں بھی۔ اگر آپ کے پاس کمرہ خالی ہو تو....." وہ اُکتا کر بولا۔

"کمرہ تو خالی ہے اور کرایے پر بھی دینا ہے لیکن تم مجھے شریف آدمی نہیں لگتے۔" اپنے بارے میں اس کے اظہار خیال پر وہ بری طرح تپ گیا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا.....؟ شکل سے میں آپ کو لچا لفنگا نظر آتا ہوں.....؟"

"میں شکل نہیں دیکھتی کسی کی۔ اچھی اچھی شکلوں والے اندر سے شیطان نکلتے ہیں۔" وہ اس کے غصے کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بولی۔

"اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے.....؟"

"بس.....! زیادہ باتیں نہیں.....یہ بتاؤ اکیلے ہو یا اور بھی کوئی ساتھ ہے.....؟" اس کے ٹوکنے پر وہ چڑ کر بولا۔

"اور کوئی نظر آ رہا ہے.....؟" پھر جھک کر اپنا سامان اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے آپ کو کمرہ نہیں دینا۔ خواہ مخواہ میرا بھی وقت ضائع کر رہی ہیں۔"

"میرا وقت بھی فالتو نہیں ہے۔ چلو آؤ.....!" وہ سامان اُٹھا کر سیدھا کھڑا ہوا تھا کہ وہ اسے اندر آنے کا کہہ کر دروازے سے ہٹ گئی تو اس کا دل تو نہیں چاہا اندر جانے کو لیکن مجبوری تھی۔

کھلے آنگن کے آخری سرے پر زینہ تھا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا اوپر آیا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی

سامان رکھ کر یوں چارپائی پہ بیٹھا جیسے یہ کمرہ ہمیشہ سے اسی کا رہا ہو۔ جس پر وہ فوراً ٹوکتے ہوئے بولی۔

"پہلے اچھی طرح دیکھ لو اور میری شرطیں بھی سن لو۔"

"جی......؟" وہ یونہی بیٹھے بیٹھے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کرایہ دو سو روپے لوں گی جو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مجھے مل جانا چاہئے۔ دوسرے یہاں اپنے یار دوستوں کو نہیں بلاؤ گے اور تمہیں بھی شرافت سے رہنا ہے۔ صحن کی دیواریں تمہارے قد سے چھوٹی ہیں اس لئے صحن میں ٹہلنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آس پاس کے گھروں میں بے پردگی ہوگی۔ اگر کسی نے مجھ سے شکایت کی تو میں اسی وقت تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔" وہ بڑے تیکھے انداز میں شرائط بتا رہی تھی۔ آخر میں پوچھنے لگی۔

"اور ہاں......! کھانے کا کیا کرو گے......؟"

"کچھ نہیں......!" وہ بے دھیانی میں بول کر سٹپٹایا۔

"میرا مطلب ہے یہاں تندور وغیرہ تو ہوگا......؟ وہاں کھا لوں گا۔"

"تمہاری مرضی......! اور اگر گھر میں کھانا ہو تو اس کے الگ پیسے دے دینا۔ میں جہاں اپنا پکاتی ہوں اس میں تمہارا بھی شامل کر لوں گی۔"

"شکریہ......!" وہ جیب میں سے پیسے نکالتے ہوئے بولا۔

"میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ انشاءاللہ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی اور ایک مہینے کا پیشگی کرایہ لے لیجئے۔ جہاں تک کھانے کا سوال ہے تو میں دیکھوں گا۔ اگر باہر کھانے میں کوئی پرابلم ہوئی تو پھر آپ سے کہہ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے......!" وہ پیسے لے کر دوپٹے کے پلو میں باندھتے ہوئے چلی گئی تو اس نے گہری سانس کھینچ کر سوچا۔

(اتنی خطرناک تو نہیں ہے۔ بس بولتی بہت ہے)۔ پھر اٹھ کر اس نے اپنا سوٹ کیس ایک کونے میں رکھا۔ اس کے بعد بستر بند کھول کر چارپائی پر بستر لگا دیا اور کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹا تھا کہ نیند آ گئی۔ غالباً سفر کی تھکان تھی جو پوری دوپہر وہ بے خبر سوتا رہا تھا۔

سردیوں کے چھوٹے دن تھے۔ سہ پہر پر بھی شام کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تو کچھ دیر تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر دھیرے دھیرے ذہن بیدار ہوا تو سب سے پہلے اس لڑکی کا خیال آیا۔ پھر اس کی ہدایات۔ مگر کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے خود کو اتنا جھکا لیا کہ دیواریں اس سے اونچی ہو گئیں۔ باتھ روم میں کوئی نل وغیرہ نہیں تھا۔ البتہ بالٹی پانی سے بھری ہوئی تھی لیکن سردی کے باعث پانی اتنا ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ بمشکل منہ پر دو چھینٹے مار سکا پھر اندر آ کر تولیے سے منہ صاف کیا۔ پھر بالوں میں کنگھی کر کے نیچے آتے ہوئے اس نے قصداً کھانس کر ایک طرح سے گھر والی کو خبردار کیا کہ وہ باہر جا رہا ہے اور یونہی سر جھکائے ہوئے صحن کراس کر کے باہر نکل آیا۔ گلی میں بچے سردی سے بے نیاز کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ ایک بچے سے تندور کا پوچھ کر اس طرف چل پڑا۔ بھوک بہت لگ رہی تھی اور تندور والی ابھی تندور گرم کر رہی تھی۔ وہ خاصا مایوس سا ہو کر ادھر ادھر

دیکھنے لگا۔

"باؤ......! بس تھوڑی دیر اے۔"

تندور والی نے کہا تو وہ وہیں بچھے ٹاٹ پر بیٹھ گیا پھر وقفے وقفے سے اور لوگ بھی آ گئے تو جگہ تنگ پڑنے لگی۔ لیکن دل بڑے تھے جب ہی ہر آنے والے کے لئے جگہ آپ ہی آپ نکلتی گئی۔

"کتھوں آئے او باؤ جی......؟" کسی نے اسے مخاطب کیا تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور جب اس نے بتایا کہ یہاں کے اسکول میں اس کا تقرر ہوا ہے اور کل سے وہ بچوں کو پڑھائے گا تو سب کی نظروں میں وہ ایک دم سے معتبر ہو گیا۔ "ماسٹر جی، ماسٹر جی" ہونے لگا اور "ہمارے لائق کوئی خدمت ہو" وغیرہ وغیرہ۔ اس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

"رہو گے کتھے ماسٹر جی......؟" (رہو گے کہاں) ایک نے پوچھا تو اس کے جواب دینے سے پہلے دوسرا بول پڑا۔

"میرا گھر حاضر ہے ماسٹر جی......!"

"بہت شکریہ لالہ جی......! میری رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے۔" اس نے بتایا تو ایک بڑے میاں نے فوراً پوچھا۔

"کتھاں......؟ (کہاں)۔" وہ نام وغیرہ نہیں جانتا تھا اس لئے گلی کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"اچھا اچھا......! حوالدارنی کے کوٹھے پر......؟" ایک نے سمجھ کر کہا تو اس نے یونہی سر ہلا دیا جبکہ اندر ہی اندر وہ اس لڑکی کو حوالدارنی کہنے پر محظوظ ہو رہا تھا۔ اب پتا نہیں وہ واقعی حوالدارنی تھی یا لوگوں نے اس کا نام رکھ چھوڑا تھا۔ پھر کھانے کے بعد چائے پینے تک وہ ان سب لوگوں کے ساتھ خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ یونس نے ٹھیک کہا تھا کہ یہاں سب رشتے دار مل جائیں گے۔ چاچا، ماما، تایا۔ اتنی سی دیر میں وہ اپنے ہم عمر نوجوانوں کی دیکھا دیکھی کسی کو "چاچا" اور کسی کو "ماما" کہنے لگا تھا۔ پھر ان سب سے رخصت ہو کر وہ گھر کی طرف چلا تو اندھیرا پھیلنے کے ساتھ سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ آگے گھر کا دروازہ پورا کھلا تھا۔ اس کے باوجود اس نے دستک دینی ضروری سمجھی تو کمرے میں سے پوچھا گیا۔

"کون اے......؟"

"میں ہوں شجاعت...... ماسٹر شجاعت۔" اس نے بتایا تو ادھر سے جواب آیا۔

"چلے آؤ......!"

"جی......؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"اوپر چلے جاؤ اور دروازہ بند کر کے جانا۔"

"جی اچھا......!" اس نے شکریہ ادا کیا اور اندر آ کر دروازہ بند کر کے زینے کی طرف دوڑ لگا دی اور ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ وہ کمرے کے دروازے میں نمودار ہو کر بولی۔

"سنو......!"

"جی......!" اس نے رک کر دیکھا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ صبح بھی وہ دروازے کے فریم میں ایستادہ تھی اور ابھی

بھی۔ جیسے کسی ماہر سنگ تراش کا خوبصورت مجسمہ۔

"یہ چابیاں رکھ لو۔ میں دن میں گھر پر نہیں ہوتی تم تالا کھول کر آ جا سکتے ہو۔" وہ دروازے کے فریم سے نکلنے لگی تھی لیکن اس سے پہلے ہی وہ اس تک پہنچ گیا تبھی اندر سے بچے کی آواز آئی۔

"اماں..... ! روٹی۔"

"لا رہی ہوں۔" اس نے پیچھے گردن موڑ کر بچے کو جواب دیا پھر اسے چابیاں تھما کر غالباً اپنے کچن کی طرف چلی گئی تو اس نے بلا ارادہ کمرے میں جھانک کر بچے کو دیکھنا چاہا لیکن لحاف میں ہونے کے باعث وہ نظر نہیں آیا۔ تب وہ سابقہ انداز میں بھاگ کر سیڑھیاں پھلانگ گیا۔

○○○

صبح اسکول نو بجے تھا اور بہت دور بھی نہیں تھا۔ جب ہی اسے جلدی اُٹھنے کی فکر نہیں تھی بلکہ اطمینان تھا اور وہ سوچ کر سویا تھا کہ آٹھ بجے آرام سے اُٹھے گا پھر راستے میں کہیں ناشتہ کرتے ہوئے اسکول جائے گا اور وہ اپنے وقت پر ہی اُٹھا۔ منہ ہاتھ دھونے باتھ روم میں آیا تو بالٹی میں وہی کل والا پانی دیکھ کر ہی اسے جھرجھری آئی۔ ٹھنڈے یخ پانی پر ہلکی سی برف کی تہہ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے سارا پانی گرا دیا پھر بالٹی لے کر نیچے آ رہا تھا کہ شور کی آواز پر وہ وہیں زینے پر رُک کر دیکھنے لگا۔ باہر کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور اس سے ذرا آگے حوالدارنی پورا گلا پھاڑ کر جانے کس پر چلا رہی تھی۔

(اُف.....!)۔ اس نے ایک دم بالٹی چھوڑ کر اپنے دونوں کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ اس کے باوجود اس کی آواز آنی بند نہیں ہوئی اور مسئلہ آواز کا نہیں تھا اس کے خوبصورت تراشیدہ ہونٹوں سے جو گالیاں نکل رہی تھیں وہ اسے پانی پانی کیے دے رہی تھیں اور جانے اس کا کیا حال تھا جو اس کے نشانے پر تھا۔

"اور تیری تو ماں، بہن، فلاں اور فلاں۔" سارے خاندان کو لپیٹ رہی تھی۔

"میری بہن! میری دھی! بس کر۔" کسی مرد نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا تو وہ اس کی طرف پلٹ کر چیخی۔

"سمجھا کے رکھ چاچا.....! اس کو..... آئندہ اس گلی میں نظر آیا تو ٹانگیں توڑ دوں گی اس کی..... بڑا آیا مجھ پر چکریاں مارنے والا (پھبتیاں کسنے والا) پہلے جا کے اپنی ماں کو دیکھے وہ جو......"

"بس پتر بس.....! میں سمجھیساں ایں کوں۔ (سمجھاؤں گا اسے) چل تو اندر جا..... شاباش.....؟"

بڑے میاں نے بڑی مشکل سے اسے اندر بھیج کر دروازہ بند کیا تو وہ جو کانوں میں اُنگلیاں دیئے کھڑا تھا، اس کے دیکھنے پر گھبرا کر دونوں ہاتھ نیچے کئے پھر بالٹی اُٹھا کر واپس اوپر جانے لگا کہ وہ پکار کر بولی۔

"اے پانی لے لو۔" وہ سر جھکا کر نیچے اُترا اور بالٹی رکھ کر ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ بظاہر اس کی نظریں پانی کی موٹی دھار پر تھیں لیکن دھیان اِدھر اُدھر، جہاں جہاں وہ آ جا رہی تھی۔ صحن میں بندھے تار پر کپڑے لٹکائی، برآمدے میں رکھی چیزیں کھینچی، پھر اندر کمرے میں جاتی اور ابھی اس کے کام ختم نہیں ہوئے تھے کہ وہ بالٹی لے کر اوپر آ گیا پھر جلدی جلدی تیار ہو کر اس سے پہلے ہی گھر سے نکل آیا۔ وہ جب اسکول پہنچا یونس موجود تھا اور لڑکوں سے دھوپ میں ٹاٹ بچھوا رہا تھا۔ اس نے قریب جا کر سلام کرنے کے ساتھ ہی شکوہ کیا۔

"کہاں پھنسا دیا یار.....؟"

"کیوں.....؟ کیا ہوا.....؟" یونس ہنسا۔

"عجیب پاگل عورت ہے۔ صبح صبح جانے کس سے لڑ رہی تھی۔" اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ یونس بول پڑا۔

"بس بس.....! میں سمجھ گیا اور یہی میں کل تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ بس.....! تم ذرا سنبھل کر رہنا۔ میرا مطلب ہے اس کی کسی بات میں دخل نہیں دینا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے.....؟"

"کبھی کبھی بلا ضرورت بھی آدمی بہت کچھ کر جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر نیکی کرنے کا خیال بھی تمہارے دل میں آئے تو فوراً نکال دینا۔ سمجھے.....؟" آخر میں یونس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تو اس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر لڑکوں کو دیکھنے لگا جو ٹاٹ بچھا رہے تھے۔

"یہاں پہلی جماعت کے بچے بیٹھیں گے، یہاں دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں۔" یونس اپنے آپ اسے بتانے لگا۔

"کوئی مشکل نہیں ہوتی جب میں ایک جماعت کو پڑھتا ہوں تو دوسری جماعتوں میں مانیٹر کھڑے کر دیتا ہوں۔ تم نے اس سے پہلے کہیں نہیں پڑھایا.....؟"

"نہیں.....! میری یہ فریش جاب ہے۔ البتہ ٹیوشن پڑھاتا رہا ہوں۔"

"کہیں اور بھی اپلائی کیا تھا تم نے.....؟ میرا مطلب ہے کسی اور فیلڈ میں.....؟"

"نہیں.....! مجھے شروع سے پڑھنے پڑھانے کا شوق رہا ہے۔ میرے والد صاحب ایک زمیندار کے ہاں ڈرائیور ہیں۔ انہیں بہت شوق تھا کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں اور بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی غالباً بڑا آدمی اسے سمجھتے ہیں جس کے پاس بہت پیسہ ہو۔ جب ہی وہ میری اس نوکری سے خوش نہیں ہیں۔ وہ چاہتے تھے میں کراچی چلا جاؤں اور وہاں کسی انگلش فرم میں نوکری کروں لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی کیونکہ مجھے پتہ ہے آدمی بڑا بنتا ہے اور بڑا وہ نہیں ہوتا جس کے پاس بہت پیسہ ہو، اس سے زیادہ بڑائی اپنی ذات سے کسی کو فائدہ پہنچانے میں ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا کہ گھنٹے کی آواز پر اس کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ پھر کلاسیں شروع ہوئیں تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ تین بجے چھٹی ہوئی تو اس نے بچوں کے ساتھ مل کر سب ٹاٹ سمیٹ کر کے کمرے میں رکھوائے۔ یونس ٹوکتا رہ گیا کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے اور جواب میں وہ مسکرایا تھا۔

"یہ بچوں کا کام بھی نہیں ہے۔"

○○○

یوں تھوڑے سے دنوں میں ہی وہ قصبے میں خاصا مقبول ہو گیا۔ غالباً بچے اپنے گھروں میں اس کی باتیں کرتے تھے۔ جبھی ان کے والدین اس سے بہت خوش تھے اور جہاں وہ نظر آتا اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے لیکن وہ بہت سہولت سے معذرت کر لیتا۔ عجز و انکساری اس کے مزاج کا خاصا تھی۔ سیدھے سادے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے کبھی خود کو ان سے بڑھ کر نہیں سمجھا بلکہ انہی کی زبان بولنے لگا تھا تا کہ کسی کو کمتری کا احساس نہ ہو اور گو کہ مالی طور پر وہ اتنا مستحکم نہیں تھا کہ لوگوں کی مدد کر سکتا اس کے باوجود ان کے دکھ درد اور مسائل

سکتا پھر انہیں مشورے دینے کے ساتھ ان میں حوصلہ پیدا کرتا۔

"یہ سب زندگی کے ساتھ چلتا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور جو لوگ ان آزمائشوں میں پورے اُترتے ہیں ان کے لئے بڑا انعام ہے۔ بس یہ سمجھو کہ ہر بات اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جس طرح اس کی طرف سے ملنے والی نعمت پر تم خوش ہوتے ہو اسی طرح تکلیف پر صبر کیا کرو۔" وہ کوئی عالم نہیں تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ دلوں کو اطمینان اللہ ہی کے ذکر سے ہوتا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لئے مایوسیوں اور گھور اندھیاروں میں بھی جو اُمید کی کرن باقی رہتی ہے وہ اسی واحد لاشریک کا احساس ہے جو آخری سانسوں تک آس کی ڈور ٹوٹنے نہیں دیتا اور وہ اس احساس کو اُجاگر کرتا تھا۔ لوگ اس کی باتیں غور سے سنتے تھے اور جانے حوالدارنی نے کب اور کہاں سن لی تھیں جو اس روز اسے روک کر کہنے لگی۔

"سنو...! تمہیں تو مسجد میں مولوی ہونا چاہئے تھا...؟"

"جی...؟" وہ سمجھا نہیں۔

"اچھی تقریر کر لیتے ہو۔ خود بھی ان باتوں پر عمل کرتے ہو یا ایسے ہی زبانی زبانی لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہو...؟" وہ کسی کسی وقت واقعی حیران کر دیتی تھی۔ اتنی صاف اُردو اور لہجے پر اچھی خاصی پڑھی لکھی ہونے کا گمان ہوتا۔ یقین بھی ہو سکتا تھا اگر جو ہر تیسرے دن اسے اپنے کانوں میں اُنگلیاں نہ ٹھونسنی پڑتیں۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟ زبانی زبانی بولتا ہوں؟" اس نے پہلی بار اُلٹا اس سے سوال کرنے کی جسارت کر لی۔

"مجھے کیا پتا...؟"

"یہ پتا ہے کہ میں تقریر اچھی کر لیتا ہوں۔"

"آج ہی پتا چلا ہے وہاں پٹواری کی دکان پر بیٹھے بول رہے تھے اب کہو گے میں وہاں کیا کر رہی تھی؟"

"جی نہیں...! میں ایسا کیوں کہوں گا...؟" وہ فوراً بولا جس پر وہ تعجب کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"کمال ہے...! لوگوں کو تو بڑی فکر رہتی ہے کہ میں کب، کہاں کیا کر رہی ہوں...؟"

"نہیں بی بی...! یہ محض آپ کا وہم ہے ورنہ میں نے تو اب تک کسی کے منہ سے آپ کا ذکر نہیں سنا۔"

"تمہیں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں...؟ پھر لوگ تمہارا لحاظ بھی کرتے ہیں۔" وہ قصداً خاموش رہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"آپ کا بچہ کہاں ہے...؟"

"کھیل رہا ہو گا کہیں۔" وہ کھلے دروازے سے باہر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ اسے اسکول کیوں نہیں بھیجتیں...؟ ماشاءاللہ چار پانچ سال کا تو ہو گا...؟"

"ہاں...! کیا کروں...؟ مجھے شوق بھی ہے اسے پڑھانے کا لیکن اسے اسکول لے جانے اور لانے کا مسئلہ ہے۔ میں اپنے کام پر جاتی ہوں پھر یہ فکر بھی رہے گی کہ وہ اسکول سے واپس آ کر اکیلا کیسے رہے گا۔ ایسے تو سارا دن میرے ساتھ ہوتا ہے۔" وہ قدرے فکرمندی سے بول رہی تھی اور اس سے غلطی ہوئی جو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حالانکہ یونس نے کہا بھی تھا کہ اس کے لئے نیکی کے خیال کو فوراً جھٹک دینا لیکن اگر اس وقت اسے یونس کی بات یاد آ جاتی تب بھی وہ اس پر عمل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک یہ کوئی ایسی بات نہیں

تھی جس کا بُرا مانا جائے۔ اس کی فکرمندی دیکھتے ہوئے سادگی سے بولا تھا۔

"یہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ میں صبح اسے اپنے ساتھ لے جایا کروں گا اور واپسی میں اس کے اکیلے ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ میں جو ہوتا ہوں۔"

"تم...؟ تم کون ہوتے ہو میرے بچے کو اپنے ساتھ رکھنے والے...؟" وہ ایک دم جھٹکے سے اُکھڑ گئی۔

"احسان کرنا چاہتے ہو ہم پر یا مہربانی...؟ میں خوب سمجھتی ہوں مہربانیوں کا مطلب... ایسے چکر کسی اور کو دینا... یہاں بہت لوگ تمہاری مہربانیوں کے منتظر ہیں... وہ سامنے والی صبح شام ٹاٹ کے پیچھے سے تمہیں جھانکتی ہے اور وہ پٹواری کی بیٹی..."

"خدا کے لئے..." اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"خاموش ہو جائیں... مت کسی کی بیٹی کا نام لیں... غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے سوائے عزت کے... بے شک میرا خیال نہ کریں لیکن..." اس نے بے چارگی سے ہونٹ بھینچے پھر تیز قدموں سے باہر نکل گیا اور رات دیر تک سنسان سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ سردیوں کی خاموش رات چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ وہ چلتے چلتے یا بھٹکتے بھٹکتے تھک گیا تھا۔ پھر بھی گھر جانے کو اس کا دل نہیں چاہا لیکن کیا کرتا اور کہاں جاتا۔ سردی کے باعث ٹانگیں بھی جواب دے رہی تھیں۔ تب ناچار اسے اس گلی میں آنا پڑا اور اس وقت اس کا دستک دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خیال تھا بہت خاموشی سے اُوپر چلا جائے گا لیکن آگے دروازہ بند دیکھ کر اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ اتنی دیر تک باہر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب پتا نہیں وہ دروازہ کھولے گی بھی کہ نہیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے بہت آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا کہ اگر وہ جاگ رہی ہو تو سن لے دوسری صورت میں اس کی نیند میں خلل نہ ہو اور وہ جیسے انتظار میں تھی۔ بے دھڑک دروازہ کھول کر کھڑی ہوئی تو وہ نظریں چرا کر بولا۔

"معاف کیجئے گا...! میں ذرا دور نکل گیا تھا اس لئے آنے میں دیر ہو گئی۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا تو وہ سر جھکا کر اندر آ گیا اور بس ایک لمحہ کو رُک کر اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی پھر زینے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس نے پکار لیا۔

"سنو...! میں نے تمہارے لئے کھانا رکھا ہے۔ کھا لو...!"

"شکریہ...! میں نے..."

"جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ فوراً ٹوک کر بولی۔

"مجھے پتا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا۔ شام میں کتنے لوگ تمہارا پوچھنے آئے جن کے ساتھ تندور پر بیٹھ کر تم کھانا کھاتے ہو۔"

"ایک بھی تندور تو نہیں ہے...؟ میں آگے چلا گیا تھا۔"

"چلو... میں چائے بنا دیتی ہوں۔ سردی سے آ رہے ہو۔"

"نہیں...!" اس بار اس نے ٹوک دیا پھر اچانک اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

"اس مہربانی کا مطلب پوچھ سکتا ہوں...؟"

"ہاں...! میں نہیں چاہتی کہ تم بیمار پڑو کیونکہ یہاں تمہاری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" وہ

بڑے آرام سے جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو وہ سر جھٹک کر اوپر آ گیا۔

○○○

صبح تک واقعی اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ بخار الگ اور ظاہر ہے یہ سردی میں پھرنے کا نتیجہ تھا۔ وہ کتنی دیر تک خود کو سہارا دینے کی کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح باہر جا کر چائے پینے کے ساتھ دوا دارو کا انتظام بھی کر سکے لیکن بہت کوشش کے باوجود وہ اٹھ نہیں سکا تو اپنی بے بسی پر کڑھنے لگا۔ ٹھیک تو کہہ رہی تھی وہ کہ یہاں اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے اور خود اسے بھی توفیق نہیں ہوتی تھی۔ کم از کم آ کر پوچھ ہی لیتی کہ وہ جو صبح پانی کی بالٹی لے کر اُترتا ہے آج کیا ہوا۔ نو بجے تک وہ لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرتا رہا اس کے بعد مایوس ہو گیا۔ پھر جب دھوپ دیواروں سے نیچے اتر آئی تب وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے دھوپ میں آ کر لیٹ گیا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی اور اس سے زیادہ چائے کی طلب تھی۔ بدن کو حرارت ملنے سے جیسے ہی اس نے خود کو بہتر محسوس کیا اسی وقت باہر جانے کو تیار ہو گیا۔

پھر پہلے اس نے مچھیروں والے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کے ساتھ ہلکا سا ناشتہ کیا اس کے بعد قصبے کی واحد ڈسپنسری کا رُخ کیا۔ وہاں سے دوا لے کر نکلا تو گو کہ زیادہ چلنے کی ہمت نہیں تھی پھر بھی اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے وہ یونس کو اپنی غیر حاضری کا سبب بتانے اسکول کی طرف چل پڑا۔ نہر کے پل تک آتے آتے اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں تو پل سے اُترتے ہی وہ ایک کھیت کے اطراف بنی کچی دیوار پر بیٹھ گیا اور یونہی بے دھیانی میں سامنے کپاس کے کھیت میں عورتوں کو کپاس چنتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کتنی دیر گزر گئی اور جانے اور کتنی دیر وہ اسی طرح بیٹھا رہتا اگر حوالدارنی کے بچے کی آواز اسے چونکا نہ دیتی وہ اس سے مخاطب نہیں تھا نہ ہی سامنے کہیں نظر آ رہا تھا اس نے آواز کی سمت گردن پیچھے موڑ کر دیکھا تو کچھ حیران سا ہو گیا۔ وہ اکیلی ہی ہموار زمین میں بڑی مہارت سے بیج بو رہی تھی اس نے اس کے آس پاس دور تک دیکھا لیکن اس چھوٹے سے کھیت میں ماں بیٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور جب یونہی بیج بوتی ہوئی وہ دیوار کے قریب آئی تو اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"یہاں کیا کر رہے ہو......؟"

"کچھ نہیں......! تھک گیا تھا ذرا سستانے کو بیٹھ گیا۔ تمہیں اعتراض ہے تو اُٹھ جاتا ہوں......؟"

کل تک وہ اسے نہیں جانتا تھا تو آپ تھی اور اب کھیت میں کام کرنے والی معمولی عورت "تم" ہو گئی تھی۔

"نہیں......! جب تک دل چاہے بیٹھو۔" وہ کہتی ہوئی دوسری کیاری میں بیج ڈالنے لگی۔

"سنو......!" قدرے توقف سے وہ پکار کر پوچھنے لگا۔

"تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے......؟"

"اور کون......؟" وہ ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ کپاس کے کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ سامنے جیسے اتنی ساری عورتیں کام کر رہی ہیں۔"

"وہ دوسرے کے کھیت میں کام کر رہی ہیں اور میں اپنے کھیت میں۔"

"یہ تمہاری زمین ہے......؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں......! یہ چھوٹی سی اراضی مجھے حکومت نے دی تھی دو سال پہلے۔ اپنی گزر اوقات کے لئے میں اس پر سبزیاں بو دیتی ہوں۔" وہ اپنے کام میں مصروف رہ کر بتاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور اب اس سے اتنے فاصلے پر ہو گئی تھی کہ اسے اونچی آواز میں بولنا پڑتا۔ جسے مناسب نہ سمجھتے ہوئے وہ خاموش ہو رہا جبکہ سوال بہت تھے۔ اسی لئے وہ اس کے واپس پلٹنے کا انتظار کرنے لگا لیکن جب دیکھا کہ آخری سرے پر پہنچ کر وہ اپنے بچے کے ساتھ آرام سے بیٹھ گئی ہے تب وہ اٹھ کھڑا ہوا اور یونس کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر کے واپس گھر آ گیا۔

شام تک سارے میں خبر ہو گئی کہ ماسٹر جی بیمار ہیں اور کچھ لوگ اس کی عیادت کو آئے تو اپنے ساتھ جانے کیا کچھ لے آئے۔ یعنی کھانا، پھل، دودھ سے بھرا جگ۔ وہ پریشان ہو گیا۔

"لالہ جی......! میں اکیلا آدمی وہ بھی بیمار، کیا کروں گا اتنے پھل......؟ اور......"

"او خیر اے ماسٹر جی......! کھاؤ پیو، جان بناؤ اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ حوالدارنی کا ہمیں پتا ہے ایک پیالہ چائے بھی نہیں پلائے گی۔" لالہ جی ٹھیک کہہ رہے تھے اور وہ قصداً اس کے ذکر سے کترا گیا۔

"بڑی مہربانی لالہ جی......! فی الحال تو اور کوئی ضرورت نہیں۔"

پھر رات میں وہ جلدی سو گیا تھا اس کے باوجود صبح بہت دیر سے اُٹھا غالباً دوا میں شامل نیند کی گولی کا اثر تھا۔ بہر حال وہ کل کی طرح کمرے سے نکل کر دھوپ میں آ بیٹھا اور انتظار کرنے لگا کہ شاید آس پڑوس کا کوئی آدمی اس کے لئے چائے لے آئے لیکن پھر حوالدارنی کی آواز سن کر وہ مایوس ہو گیا کیونکہ جب تک وہ گھر میں موجود تھی کسی کا اس طرف آنا مشکل تھا حقیقتاً لوگ اس کے سائے سے بھی ڈرتے تھے۔

(آخر کیا چیز ہے یہ......؟) وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

(ضرور اس کی پشت پر کسی کا ہاتھ ہے جس پر وہ اتنا اکڑتی ہے ورنہ ایک اکیلی عورت کیا کر سکتی ہے؟)۔

"اے ماسٹر......!" اس کی تیز آواز پر وہ اُچھل گیا اور قدرے ناگواری سے دیکھا تو وہ ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"لو ناشتہ کر لو......!"

"کس نے بھیجا ہے......؟" اس نے پوچھا تو وہ چڑ کر بولی۔

"وہ سامنے والی نے۔"

"ک......کون سامنے والی......؟" وہ سچ مچ گھبرا گیا۔

"وہ جو سارا دن ٹاٹ کے ساتھ لگی تمہاری راہ دیکھتی ہے۔"

"دیکھو......! میں مذاق میں بھی ایسی باتیں پسند نہیں کرتا اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو یہ ٹرے واپس لے جاؤ۔"
اس نے بہت سنجیدگی سے ٹوک کر کہا۔

"بس بس......! مجھ پر اپنی پارسائی کا رعب جمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے ناشتہ کرو۔"
اس نے پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ چیخ کر بولی۔

"کسی نے نہیں میں خود لے کر آئی ہوں۔ بیمار ہو اس لئے اور اپنے بچے کو بھی اس وقت تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ باہر کا کوئی کام ہو تو اس سے کروا لینا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے دیوار سے نیچے جھانک کر

بچے کو پکار کر اُوپر آنے کو کہا پھر اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

"کاکا تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔ جب سونے لگو تو بے شک اسے باہر بھیج دینا۔"

"اماں......!" بچے نے اُوپر آ کر اسے پکارا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے سامنے بٹھاتے ہوئے بولی۔

"ماسٹر جی بیمار ہیں۔ ان کا خیال رکھنا میں کھیت پر جا رہی ہوں۔" اور وہ بہت حیران ہو کر کبھی اسے اور کبھی بچے کو دیکھ رہا تھا یعنی اتنا سا بچہ اس کا کیا خیال رکھے گا اور اس سے پہلے کہ اسے ٹوکتا وہ سیڑھیاں اُتر گئی۔

"عجیب پاگل عورت ہے۔" وہ حیرت سے نکل کر بڑبڑایا تھا کہ کاکا فوراً پوچھنے لگا۔

"کس کو کہہ رہے ہو......؟"

"ہائیں......؟ تم ابھی یہیں موجود ہو......؟ جاؤ اپنی ماں کے پاس۔"

"نہیں......! میں تمہارا خیال رکھوں گا۔" کاکے نے اپنی ماں کی بات بڑی معصومیت سے دُہرائی تو وہ بے ساختہ مسکرایا۔ پھر اس کے سیب جیسے گال پر چٹکی کاٹ کر بولا۔

"چلو ناشتہ کرو......!"

"مجھے اماں نے کھلا دیا ہے۔"

"تمہاری اماں......" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر پیالے میں چائے ڈالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تمہارا ابا کہاں ہے......؟"

"ابا کو پریاں لے گئیں۔"

"کون......؟" اس نے شاید ٹھیک سے سنا نہیں تھا۔

"پریاں......!" کاکا زور دے کر بولا۔

"اماں کہتی ہیں وہ اُوپر آسمان سے پریاں آئی تھیں ابا کو اُڑا کر لے گئیں۔"

"اوہ......!" اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور کتنی دیر تک وہ اس معصوم بچے کو دیکھتا رہا۔ پھر چائے پیتے ہوئے اس کی ماں کو سوچنے لگا۔ یعنی اتنی سی عمر میں وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ کاکے سے پوچھے کہ اس کے باپ کو کیا ہوا تھا لیکن اس معصوم کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔

"ماسٹر جی......!" کاکا اس کا ہاتھ ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر کے پوچھنے لگا۔

"تم اسکول جاتے ہو......؟"

"ہاں......! اور تم کیوں نہیں جاتے......؟"

"میں اماں کے ساتھ جاتا ہوں ناں کھیت پر۔"

"اسکول بھی جایا کرو۔ تمہارے کھیت سے تھوڑا آگے ہی تو ہے۔ میں تمہیں لے جاؤں گا اپنے ساتھ۔ چلو گے ناں......؟"

"اماں سے پوچھوں گا۔"

"تمہاری اماں......" وہ پھر خاموش ہو گیا۔ غالباً اس کی ماں سے خائف تھا۔

پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ کاکے کو ساتھ لے کر گھر سے نکلا تو گو کہ اب اسے بخار نہیں تھا پھر بھی

احتیاطاً اس نے دوا لے لی۔ اس کے بعد اسکول جاتے ہوئے وہ کاکے کو راستے میں حوالداری کے پاس چھوڑنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے کھیت میں موجود نہیں تھی اور اس کی اجازت کے بغیر بچے کو لے جاتے ہوئے وہ ڈر رہا تھا جب ہی رُک کر انتظار کرنے لگا کہ وہ کسی ضرورت سے کہیں گئی ہوگی تو ابھی آ جائے گی۔

"اماں کہاں ہے......؟" کاکے نے ماں کی بابت اس سے پوچھا اور ابھی وہ جواب دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ اس سے آگے بارہ تیرہ سال کی عمر کے چار پانچ بچے تھے۔ اس نے غور کیا تو وہ ان بچوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ زمین سے پتھر اُٹھا کر انہیں کھینچ کر مارتی اور زبان سے برا بھلا بھی کہہ رہی تھی گالیوں سمیت اور بچے کہاں اس کے ہاتھ آنے والے تھے۔ تھک کر پلٹ آئی اور اپنے کھیت میں کھڑی ہو کر چاروں طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کیا کرے۔

"اماں!" کاکے نے اسے دیکھتے ہی پکارا تو وہ جو چپ چاپ وہاں سے کھسکنے کی سوچ رہا تھا بوکھلا گیا۔

"کیا ہے......؟" وہ غصے میں تھی وہیں سے چیخی۔

"تو یہاں کیا کر رہا ہے......؟"

"بھاگو شجاعت علی......! ورنہ خیر نہیں۔" وہ کاکے کو کندھے پر بٹھا کر بیچ بھاگ کھڑا ہوا۔ پیچھے وہ چیخ چیخ کر پکار رہی تھی۔

"ارے ماسٹر......! کدھر جا رہا ہے......؟ سن تو......!" اور اس نے اسکول پہنچ کر دم لیا۔ کاکے کو نیچے اُتار کر کرسی پر بیٹھا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا......؟ کتے پیچھے لگ گئے تھے کیا......؟" یونس نے شرارت بھری مسکراہٹ سے پوچھا تو وہ "کتیا" کہتے کہتے رہ گیا۔ پھر اسے دھیان میں رکھ کر بولا۔

"شیرنی......"

"کیا......؟" یونس کی آنکھیں چمکیں پھر وہ مسکرایا۔

"ہے تو ایک شیرنی جسے دیکھ کر سب کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔"

"او......سمجھا......! اپنی لینڈ لارڈ کی بات کر رہے ہو۔ نکال دیا کیا اس نے تمہیں گھر سے......؟"

"نہیں......! بس راستے میں نظر آ گئی تھی۔ خیر چھوڑو...... میں تمہیں بتانے آیا تھا کہ......"

"تم بیمار ہو۔" یونس نے اس کی بات اُچک لی۔

"مجھے کل ہی خبر ہو گئی تھی اور میں تمہارے پاس آنا بھی چاہتا تھا لیکن گھر میں چاچا، چاچی دونوں بیمار پڑے ہیں۔ خیر تم سناؤ......! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری......؟"

"کافی بہتر ہوں۔ کل سے ان شاء اللہ آؤں گا۔"

"نو پرابلم......! بے شک ایک دو دن آرام کر لو۔" یونس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"آرام کیا کرنا یار؟ گھر میں سارا دن بور ہی ہوں گا ابھی بھی دیکھو چلا آیا۔" وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہاری مرضی......! اور یہ بچہ کس کا ہے......؟" یونس نے کاکے کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"اسی شیرنی کا......! آج ازراہِ ہمدردی میرے پاس چھوڑ گئی تھی کہ یہ میرا خیال رکھے گا۔" وہ محظوظ

انداز میں ہنا کر ہنسا تو یونس کو بھی ہنسی آگئی۔

○ ○ ○

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ نہ صرف اپنی جاب سے مطمئن تھا بلکہ قصبے کے لوگوں میں بھی گھل مل گیا تھا اور بظاہر اسے حوالدارنی سے بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ بس اس کی بدزبانی اور بدکلامی سے پریشان تھا جو وہ ہر دوسرے دن گھر کے دروازے پر چیخ چیخ کر لوگوں کی ماں بہن ایک کرتی تھی اور وہ حقیقتاً شریف آدمی تھا۔ اس سارے ہنگامے کے بعد جب گھر سے نکلتا تو اس کی نظریں زمین پر گڑی ہوتی تھیں۔ کسی کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ حالانکہ حوالدارنی سے اس کا کوئی ناطہ نہیں تھا نہ ہی اس کے کسی فعل کا ذمہ دار پھر بھی اپنے آپ میں شرمندہ ہوتا اور مسلسل اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ اسے کہیں اور ایک کمرہ مل جائے۔

یونس اس کی پریشانی سمجھتا تھا لیکن وہ مجبور تھا کیونکہ وہ خود چاچا کے گھر میں رہ رہا تھا اور دوسرے کئی لوگ اسے اپنے گھر رہنے کی پیش کش کر چکے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کے گھروں میں الگ سے کوئی کمرہ نہیں تھا۔ دوسرے ہر گھر میں جوان بیٹی یا بہن موجود تھی۔ اس لئے اس نے معذرت کر لی تھی کیونکہ جس طرح حوالدارنی سب کی ماں بہنوں کو کسی نہ کسی کے ساتھ منسوب کر کے ان کی عزتیں اُچھالتی تھی تو وہ نہیں چاہتا تھا کہ کہیں اس کا نام بھی آئے اور کتنی عجیب بات تھی کہ وہ خود عزت کے لئے دہائی دیتی پھرتی تھی۔ مزید ڈنکے کی چوٹ پر تو جوان کو کمرہ کرایے پر دیا ہوا تھا جس کے لئے آنے جانے کا الگ سے راستہ بھی نہیں تھا اس کے باوجود کوئی اس پر اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اب پتا نہیں لوگوں کی نظروں میں وہ واقعی اتنی پاکباز تھی یا اپنی عزتوں کی خاطر خاموش رہتے تھے۔ بہرحال اس تمام عرصے میں اس نے کسی کو اپنی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے محسوس نہیں کیا نہ ہی کوئی ذومعنی جملہ۔ اس کے باوجود وہ اس گھر سے نکلنا چاہتا تھا اور جس روز حوالدارنی کو معلوم ہوا کہ وہ کہیں اور ٹھکانہ تلاش کرتا پھر رہا ہے، سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اس کے کمرے میں آ کر جارحانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

"کیوں ماسٹر......؟ یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے......؟"

"نہیں......!" وہ سمجھا نہیں اس لئے سیدھا سادا جواب دیا۔

"پھر تم یہاں سے کیوں جانا چاہتے ہو......؟" اس نے پوچھا تب سمجھ کر وہ جواز سوچنے لگا تھا کہ ادھر سے دوسرا سوال آیا۔

"کسی نے کچھ کہا ہے تم سے......؟"

"نہیں......!"

"میرے خلاف بہکایا ہے......؟" اس کی جرح سے وہ پریشان ہو گیا۔

"نہیں......! میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو کسی کے بہکاوے میں آ جاؤں گا......؟"

"پھر......؟ پھر کیوں جانا چاہتے ہو......؟"

"بس میری مرضی!" وہ چڑ کر بولا تو کچھ دیر تک وہ اسے تیز نظروں سے گھورتی رہی پھر سر جھٹک کر بولی۔

"کر دیکھو اپنی مرضی......! میں دیکھتی ہوں کون تمہیں رکھتا ہے......؟ حشر خراب کر دوں گی اس کا اور ساتھ میں تمہارا بھی۔"

"تم......؟" وہ بری طرح سُلگ گیا۔

"تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو......؟ کس بنا پر سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتی ہو......؟"

"بس......! میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ تمہیں اگر یہاں سے جانا ہے تو اُٹھاؤ سامان اور سیدھے رحیم یار خاں کا ٹکٹ کٹاؤ۔" اس کے قطعیت سے کہنے پر وہ مزید تلملایا۔

"تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے سارے شہر پر تمہاری حکمرانی ہو......؟"

"دہشت تو ہے۔ کبھی دیکھا ہے کسی کو میرے سامنے بولتے ہوئے......؟"

"شریف آدمی تمہارے منہ کیا لگے گا؟" اس نے طنزاً آمیز تلخی سے کہا تو وہ اس سے زیادہ تلخ ہو کر بولی۔

"دیکھو ماسٹر......! میں تمہارا بہت لحاظ کرتی ہوں۔ صرف اس لئے کہ تم واقعی شریف آدمی ہو اور اپنے کام سے کام رکھتے ہو۔ اسی لئے میرے گھر میں ٹکے ہوئے بھی ہو ورنہ میں خود تمہیں نکال باہر کرتی۔"

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بس......! اتنا سن لو کہ میں جب چاہوں گا یہاں چلا جاؤں گا۔ تم مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔" اس نے اپنی طرف سے جتا کر بات ختم کر دی تو وہ جاتے جاتے بولی تھی۔

"کہیں اور ٹھکانا ملے گا تو جاؤ گے ناں......؟" وہ کچھ دیر تک اس کے پیچھے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا اور اپنا دھیان بٹانے کے لئے بچوں کی آنکھ مچولی دیکھنے لگا۔ اسے اپنے چہرے پر جمی نظروں کا احساس ہوا تو اس نے بے اختیار اِدھر اُدھر دیکھا۔ بھاگتے دوڑتے بچوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور بچوں میں سے بھی کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ تب اپنا وہم سمجھتے ہوئے وہ کھڑکی سے ہٹنے لگا تھا کہ سامنے کے دروازے پر پڑے ٹاٹ سے جھانکتے ہیولے پر نظر پڑتے ہی اسے حوالدارنی کی بات یاد آئی۔

(وہ سامنے والی جو سارا وقت تمہاری راہ دیکھتی ہے) ۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور اپنے آپ پر حیران ہوا کہ اس نے تو کبھی غور نہیں کیا اور وہ حوالدارنی کو کیسے ہر بات کی خبر رہتی ہے جبکہ وہ سارا دن گھر میں بھی نہیں رہتی۔

(جھوٹی ہے حوالدارنی...... اسے تو موقع چاہئے دوسروں کو بدنام کرنے کا...... اب پتا نہیں سامنے کون ہے......؟ کس کام سے کھڑی ہے......؟ میں نے تو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا) ۔ وہ خود کو بہلا رہا تھا لیکن فطری تجسس کو نہیں دبا سکا جو کچھ دیر بعد دوبارہ کھڑکی کھول کر دیکھا تو اُدھر جیسے اسی کا انتظار تھا۔ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر ایک لڑکی نے باقاعدہ ہاتھ کے اشارے سے اسے سلام کر ڈالا اور وہ واقعی چکرا گیا۔ زور سے کھڑکی بند کر کے چارپائی پر آ کر بیٹھا اور اس لڑکی کی جرأت پر کھولنے لگا۔ یعنی وہ جانتی بھی تھی کہ اس کے سامنے رہنے والی حوالدارنی کی زبان کتنی خراب ہے پھر بھی اسے اپنے ماں باپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ اسے سمجھا نہیں سکتا تھا اس لئے اپنے یہاں سے جانے کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ پھر اُلجھ گیا تھا۔

○ ○ ○

موسم بدل گیا تھا۔ سردی کے بعد اب بہار پورے جوبن پر تھی اور وہ جو پہلے اسکول کے وقت ہی گھر سے نکلتا تھا اب صبح صبح چہل قدمی کے لئے نکل آتا اور سورج نکلنے تک سرسبز و شاداب کھیتوں کا ایک چکر لگا لیتا۔

ان دنوں یونس چھٹی پر بہاولنگر گیا ہوا تھا اور وہ اکیلا ہی پانچ جماعتوں کو پڑھا رہا تھا۔ سردیوں میں تو واقعی

مشکل نہیں ہوتی تھی لیکن اب دھوپ میں نہیں بیٹھا جا رہا تھا اور ساری جماعتوں کے بچے ایک کمرے میں بھی نہیں سما سکتے تھے۔ اس لئے اسے مشکل ہو رہی تھی کہ ایک کمرے میں پڑھا رہا ہوتا تو دھیان دوسرے کمرے کی طرف ہوتا جہاں بچے ماسٹر کے نہ ہونے سے اودھم مچا رہے ہوتے۔

اس وقت وہ ساری جماعتوں میں ایک ایک بچے کو املا لکھوانے پر مقرر کر کے خود برآمدے میں ٹہلنے لگا تھا کہ ہر جماعت پر نظر رکھ سکے اور جب تھک گیا تو وہیں کرسی منگوا کر بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد ایک ایک بچے کو بلا کر اس کی تختی چیک کرنے لگا۔ وہ اس کام میں اتنا مصروف تھا کہ کسی کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ جب بہت قریب چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی تب اس نے چونک کر سر اٹھایا اور اس سامنے والی لڑکی کو دیکھ کر اسے حیرت تو ہوئی لیکن اس پر ظاہر نہیں ہونے دی اور پہلے قریب کھڑے لڑکے کو تختی تھما کر کمرے میں بھیجا پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"جی بی بی......! فرمایئے......؟"

"تسی تے کدی ملدے ای نہیں ماسٹر جی......!" (آپ تو کبھی ملتے ہی نہیں ماسٹر جی) لڑکی نے لجا کر کہا تو وہ بمشکل خود کو سنبھال پایا۔

"کیوں......؟ کوئی کام ہے آپ کو......؟"

"نہیں جی......!"

"پھر...... میرا مطلب ہے کیوں ملنا چاہتی ہیں آپ مجھ سے......؟" اس نے قصداً ناگواری سے پوچھا۔

"اے تے میتوں وی نئی پتا۔ بس دل کرو اے۔" (یہ تو مجھے بھی نہیں پتا بس دل چاہتا ہے)۔

"دیکھو بی بی......! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" وہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اور تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ میں یہاں نوکری پر آیا ہوا ہوں۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

"میں کی کراں ماسٹر جی......! میرا دل......" وہ حال سنانے جا رہی تھی کہ اس نے ٹوک دیا۔

"ایک منٹ......!" پھر دور سے آتی لڑکی کو غور سے دیکھنے اور پہچاننے کے بعد اس سے کہنے لگا۔

"دیکھو......! وہ حوالدارنی آ رہی ہے۔ اس کے آنے سے پہلے یہاں سے چلی جاؤ ورنہ......"

"میتوں پتا اے جی......! تسی حوالدارنی کولوں ڈردے او۔ پر میں نئی ڈردی۔" (مجھے پتا ہے آپ حوالدارنی سے ڈرتے ہو پر میں نہیں ڈرتی)۔ اس نے کہا اور جم کر کھڑی ہو گئی تو وہ سچ مچ پریشان ہو گیا۔ پتا نہیں حوالدارنی اس طرف کیوں آ رہی تھی اور اسے آج ہی آنا تھا۔ جانے اس لڑکی کی یہاں موجودگی کو وہ کیا رنگ دے اور لوگوں کے سامنے جس طرح بیان کرے گی اسے سوچ کر ہی وہ پسینے میں نہا گیا۔ پھر اس لڑکی سے بہت عاجزی سے بولا۔

"میں تماشا نہیں بننا چاہتا۔ خدا کے لئے اس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔"

"ہائے ماسٹر جی......! تسی تے بڑے ای ڈرپوک او۔" لڑکی نے اس کا مذاق اڑایا۔

"ہاں......! میں اعتراف کرتا ہوں میں بزدل ہوں، ڈرپوک ہوں، اپنی عزت کی دھجیاں نہیں اڑوا سکتا۔" وہ تلملا کر غصے میں یوں کھڑا ہوا کہ کرسی پیچھے الٹ گئی تو وہ شاید اس کے غصے سے خائف ہوئی پھر بھی جاتے جاتے بولی تھی۔

"میں فیر آواں گی ماسٹر جی......!"

"نان سینس......!" اس نے دانت پیسے پھر حوالدارنی کو قریب آتے دیکھ کر پلٹ کر پیر سے کرسی سیدھی کرنے لگا۔ مقصد محض اس کے فوری سامنے سے بچنا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کیا الٹا سیدھا کہے گی لیکن حیرت انگیز کہ نہ تو اس نے اس لڑکی کی بابت کوئی سوال کیا نہ کچھ جتایا بلکہ جیسے اسے وہ لڑکی دکھائی ہی نہیں دی تھی اور بڑے آرام سے جس مقصد سے آئی تھی کہنے لگی۔

"ماسٹر جی......! کاکا پورے پانچ سال کا ہو گیا ہے۔ اسے داخل کر لو۔"

"ہاں......اچھا......! تم بیٹھو......! میں فارم لے کر آتا ہوں۔" اسے جیسے موقع مل گیا۔ فوراً تیز قدموں سے برآمدے کے آخری سرے پر بنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو وہ اسی طرح کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ......! میں اور کرسی منگواتا ہوں۔"

"بس ٹھیک ہے ماسٹر جی......! تم جلدی سے اس کا نام لکھو۔" وہ بیٹھنے پر آمادہ نہیں ہوئی تو وہ خود ہی اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر جیب سے پین نکال کر پوچھنے لگا۔

"ہاں......! کیا نام ہے اس کا۔"

"عارف حسین......!"

"باپ کا نام......؟"

"صفدر حسین......!"

وہ جو پوچھتا گیا وہ جواب دیتی گئی اور جب فارم فل ہو گیا تو وہ اسے یوں دیکھنے لگا جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس سے دستخط کرنے کو کہے یا انگوٹھا لگانے کو۔

"کیا بات ہے ماسٹر......؟" اس کے ٹوکنے پر وہ جلدی سے ایک جگہ انگلی سے اشارہ کر کے بولا۔

"یہاں انگوٹھا لگا دو۔"

"انگوٹھا کیوں......؟ میں دستخط کر سکتی ہوں۔" اس نے کہا اور بڑے آرام سے اس کے ہاتھ سے پین لے کر دستخط کرنے کے لئے اس کے گھٹنے پر رکھے فارم پر جھک گئی۔ بس ایک پل لگا تھا اسے دستخط کرنے میں اور اس ایک پل میں اس پر قیامت بیت گئی تھی۔

"بس یا اور کچھ......؟" وہ سیدھی کھڑی ہو کر پوچھ رہی تھی اور وہ حواسوں میں ہوتا تو جواب دیتا۔ وہ تو گم سا ہو گیا تھا۔

"ابھی بٹھا دوں کاکے کو یا کل سے آئے گا......؟" وہ عجلت میں تھی جب ہی اس کے جواب کا انتظار کیا نہ اس کی خاموشی محسوس کی۔ ابھی بھی خود ہی کہنے لگی۔

"کل سے لے آؤں گی کتابوں کے ساتھ اور ہاں......! یہ داخلے کے پیسے لے لو۔ اس کے بعد تو کوئی پیسے نہیں لو گے ناں......؟"

اس نے ذرا سا نفی میں سر ہلایا تو وہ مطمئن سی ہو کر جانے لگی لیکن پھر جانے کیا خیال آیا کہ رک کر پوچھنے لگی۔

"وہ دوسرا ماسٹر کہاں ہے......؟"

"وہ چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ آجائے گا دو چار دن میں۔" وہ بتا کر چور سا بن گیا کیونکہ ادھر اس نے یوں بھنویں اچکائی تھیں جیسے کہہ رہی ہو جب ہی تمہیں موقع مل گیا۔

"لاحول ولا......!" اس کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک جھنجلاتا رہا۔ کبھی اس لڑکی پر جو زبردستی گلے پڑ رہی تھی اور کبھی اس پر جو کچھ دیر کو اوسان چھین گئی تھی۔

(مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے ڈرنے کی......؟ میں خود تو بلانے نہیں گیا تھا۔ یہ اسکول ہے یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔ بچوں کی مائیں، بہنیں جیسے ابھی حوالدارنی آئی تھی)۔ وہ کسی متوقع صورت حال کو سوچ کر خود کو بہلاتا رہا تھا۔ پھر چھٹی ہونے پر گھر جاتے ہوئے اس نے قصداً حوالدارنی کے کھیت کا راستہ اختیار کیا۔ مقصد اسے جتانا تھا کہ اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے وہ منہ چھپاتا پھرے۔

شیشم کی چھاؤں تلے کاکا سو رہا تھا اور حوالدارنی پتا نہیں کہاں تھی۔ وہ اس کی تلاش میں سارے کھیت میں نظریں دوڑاتا آگے آیا تو وہ اسے نہر کے قریب کھدائی کرتی نظر آئی۔

"یہاں کیا کررہی ہو......؟" اس نے قریب جا کر پوچھا تو وہ جو پہلے ہی جھنجلائی ہوئی تھی تڑخ کر بولی۔

"نظر نہیں آرہا......؟ کھدائی کررہی ہوں۔"

"ہاں مگر کیوں......؟ میرا مطلب ہے یہاں کیوں کھدائی کررہی ہو......؟"

"پانی کے لئے۔" وہ بہت تھکی ہوئی نڈھال سی کدال رکھ کر بیٹھی اور دوپٹے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

"نامرادوں نے میرے کھیت کا پانی بند کردیا ہے۔ یہاں سے نالی بناؤں گی اور نہر میں سے نکالوں گی۔"

"اس طرح تو تمہارا کھیت پانی سے بھر جائے گا۔" اس نے فوراً اسے ہونے والے نقصان سے آگاہ کیا۔

"کیوں بھر جائے گا......؟ جتنے پانی کی ضرورت ہوگی لوں گی پھر نالی بند کردوں گی۔"

وہ بڑے آرام سے کہہ کر پھر کھڑی ہوگئی اور کدال اٹھا کر کھدائی کرنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ بظاہر اس کے ہاتھ کتنے نرم تھے لیکن جب زمین پر کدال مارتی تو ان کی سختی اور طاقت کا اندازہ ہوتا۔ اس کا دل چاہا اس کی مدد کردے لیکن فوراً ہی ہمدردی جتانے کا نتیجہ یاد آنے پر اس نے خود کو روک لیا اور قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔

"کس نے بند کیا ہے تمہارے کھیت کا پانی......؟"

"ارے......! میں اکیلی عورت ہوں ناں......! اسی لئے لوگ کسی نہ کسی بہانے مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ کبھی پانی بند، جب بیج بوتی ہوں تو لڑکوں کو بھیج کر میرے کھیت میں دوڑا دیتے ہیں اور جب سبزیاں اُگتی ہیں تو اپنے جانوروں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔" وہ اپنے کام میں مصروف رہ کر بول رہی تھی۔

"اسی لئے تو سارا سارا دن نگرانی کرتی ہوں اپنے کھیت کی پھر بھی روز لڑکے بہت کچھ لے جاتے ہیں۔ جس دن کوئی میرے ہاتھ لگ گیا ناں تو دیکھنا کیا حشر کروں گی۔"

"تم شکایت کیوں نہیں کرتیں......؟ میرا مطلب ہے یہاں کے کونسلر سے۔"

"ارے......! وہی (گالی دے کر) تو یہ سب کرواتا ہے ورنہ کسی کی مجال ہے۔ وہ چوہدری ہے ناں

یہاں کا...... یہ آس پاس کے سارے کھیت اسی کے ہیں اور چاہتا ہے کہ میں اپنا کھیت بھی اسے دے دوں۔ آیا تھا میرے پاس خریدنے، میں نے منع کردیا۔ بس تب سے مجھے پریشان کررہا ہے اور سمجھتا ہے اس طرح پریشان ہو کر میں اپنا کھیت بیچنے پر تیار ہوجاؤں گی۔ ہونہہ......!"

"یہ تو بڑا ظلم ہے تمہارے ساتھ۔" وہ کیا کرتا جو کچھ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس پر تاسف کا اظہار کرنے سے کب تک خود کو روکتا۔

"غریب تو پیدا ہی ظلم سہنے کے لئے ہوتا ہے۔" وہ دُکھ سے بولی پھر ایک دم سیدھی کھڑی ہوئی تو وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ گنے کی کھڑی فصل میں کسی کی موجودگی کا یقین کرنے کے بعد وہیں سے چیخ چیخ کر پکارنے لگی۔

"حرام کے پلو......! باہر نکل کے آؤ...... تیری تو......"

"اُف......!" اس نے وہاں سے کھسکنے ہی میں عافیت جانی اور گھر تک آیا تو دوسری مصیبت تاک کے پیچھے منتظر تھی۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوا اور سیدھا اوپر جانے کے بجائے وہیں آنگن میں رکھی چارپائی پر لیٹ گیا۔ حوالدارنی کا اسے پتا تھا کہ وہ مغرب کے بعد ہی آتی تھی اس لئے اس نے سوچا پسینہ خشک ہونے پر وہ یہیں نل پر بیٹھ کر نہالے گا لیکن اس سے پہلے ہی اسے نیند آگئی۔ حالانکہ یہ سونے کا وقت تھا نہ ہی اس کا ارادہ۔ غالباً پسینے سے بھیگے بدن پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے تھپکنے کا کام کیا تھا جو وہ بڑی میٹھی نیند سویا اور اگر اُٹھایا نہ جاتا تو شاید صبح تک سوتا رہتا۔ حوالدارنی نے آتے ہی گلاس میں پانی بھر کر اس کے منہ پر پھینکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا تو وہ دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"کیوں وے......! یہ تیرے ماں کا گھر ہے کیا......؟ ذرا سا بات کرتی ہوں تجھ سے کہ تو......"

"شٹ اپ......!" وہ زور سے چیخ پڑا کیونکہ ذہن ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس لئے صورت حال سمجھنے سے قاصر تھا۔

"کیا کہا......؟" حوالدارنی کا انداز دوسرے پل جھپٹنے والا تھا۔ وہ سر جھٹک کر چارپائی کے دوسری طرف اُتر گیا اور کاکے کو مخاطب کرکے بولا۔

"کاکے......! میں تیری ماں کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔" اس کے ساتھ ہی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گیا۔ پیچھے وہ اسے سنانے کو بہت اونچا بول رہی تھی۔

"تیری ہمت ہے میرے منہ لگنے کی......؟ تیرے جیسے تو......" وغیرہ وغیرہ۔

اس نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے پھر کھانا کھانے کی غرض سے باہر نکل آیا اس وقت تک حوالدارنی کی بک بک بند نہیں ہوئی تھی اور یقیناً آس پڑوس والے سن رہے تھے جب ہی آکر اس سے ہمدردی جتانے لگے۔

"ماسٹر جی......! اے عورت کسی نوں نہیں بخش دی۔"

"ہاں......! تہاڈے نال کی شکایت ہوگئی اوہنوں......؟"

"بس......! عادت سے مجبور ہے۔"

وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے مختصر جواب دے کر کھانا کھانے میں لگ گیا۔ اس

کے بعد یونس کا پتا کرنے اس کے چاچا کی طرف نکل گیا تو پھر بہت دیر تک ان ہی کے پاس بیٹھا رہا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اس کا دھیان بٹ گیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکی ہو گی تب اس نے گھر کی راہ لی۔ موسم بدلنے سے اب وہ سناٹا نہیں رہا تھا۔ گو کہ گلیاں ابھی بھی سنسان تھیں لیکن گھروں میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنے دروازے میں داخل ہوا تو آگے حوالدارنی کاکے کے ساتھ آنگن میں اسی چارپائی پر بیٹھی تھی۔

"ماسٹر جی آ گئے۔" کاکے نے اسے دیکھتے ہی جیسے اپنی ماں کو اطلاع دی تو وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"اِدھر آنا ماسٹر جی......" وہ ناچار قریب آیا تو وہ ایک قاعدہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یہ کاکے کا قاعدہ دیکھو...... ! ٹھیک ہے......؟"

"ہوں......!" اس نے قاعدے پر نظر ڈالتے ہی "ہوں" کی آواز نکالی اور فوراً آگے بڑھ گیا۔

"تم تو ناراض ہو گئے ماسٹر جی...... ! کیا کروں میں......؟ اچھا بولوں گی تب تو اور بری بنوں گی۔"

وہ جانے کیا کہہ رہی تھی وہ ان سنی کرتا اوپر آ گیا۔ بے وقت سویا تھا اس لئے اب نیند کا دور دور پتا نہیں تھا۔ کچھ دیر کسی کتاب کا مطالعہ کرتا رہا پھر اماں کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ پچھلے خط میں اماں نے اس کی بہن راحیلہ کے لئے آنے والے کسی رشتے کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کی رائے پوچھی تھی اور وہ اس کا جواب لکھ رہا تھا کہ وہ اپنا پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی ہاں بھریں۔ اس کے بعد وہ راحیلہ کے خط میں اپنے یہاں کے حالات لکھ رہا تھا کہ خاموشی میں کسی چیز کے گرنے یا ٹکرانے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ قلم رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھ کر جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ آواز کیسی تھی اور کس طرف سے آئی تھی۔ تبھی دوبارہ "ٹھک" کی آواز پر وہ اُچھل پڑا۔ اس کی بند کھڑکی پر پتھر مارا گیا تھا اور مارنے والے بلکہ والی کا خیال آتے ہی اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اُٹھ کر لائٹ آف کر دی کہ وہ مایوس ہو کر اپنی اس حرکت سے باز آ جائے گی لیکن اس کا لائٹ آف کرنے کا اور ہی مطلب لیا گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پتھر آنے لگے۔ کتنی دیر تک وہ دم سادھے پڑا رہا پھر حوالدارنی کا خیال آیا کہ کہیں اسے نہ خبر ہو جائے۔ تب اُٹھ کر اس نے کھڑکی کھول دی اور تاروں کی روشنی میں دیکھا وہ لڑکی اشارے سے بلا رہی تھی۔

(ٹھیک تو کہتی ہے حوالدارنی انہیں کہ خود کو سنبھالا نہیں جاتا ان سے)۔ وہ منہ لٹکا کر سوچتا۔ کھیس اور تکیہ اُٹھا کر کمرے سے نکل آیا۔ اس کی بلا سے وہ ساری رات کھڑی رہے۔ اس کی جگہ اگر کوئی منچلا ہوتا تو اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور وہ بھی کوئی ایسا کھرا جذبات سے عاری تو جوان تو نہیں تھا۔ اس کے سینے میں دل بھی تھا اور دل میں اُمنگیں بھی لیکن اُمنگوں کی رُسوائی اسے کسی طور گوارا نہیں تھی۔ وہ عزت کرتا اور کروانا جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان ساری برائیوں کا سبب ناخواندگی ہے۔ وہ سامنے والی لڑکی اگر کچھ پڑھی لکھی ہوتی تو کم از کم اپنے ماں باپ کی عزت کا ضرور خیال کرتی۔

صبح جب وہ اسکول جانے کے لئے نکلنے لگا تو کاکا اپنا بستہ لے کر اس کے پاس چلا آیا۔

"ماسٹر جی...... ! میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔" اس نے بے دھیانی میں کاکے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا لیکن پھر فوراً برآمدے میں کھڑی اس کی ماں کو دیکھنے لگا تو وہ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولی۔

"لے جاؤ...... ! تمہارے سر پر چڑھ کر تو نہیں جائے گا......؟ اپنے پیروں سے چلے گا۔"

اس نے بمشکل خود کو کچھ جتانے سے باز رکھا اور کاکے کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

○ ○ ○

پھر دو روز بعد یونس آ گیا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ کیونکہ ایک تو اس کو اکیلے پڑھانے میں مشکل ہو رہی تھی دوسرے سامنے والی لڑکی جس کا نام شاداں تھا روز چلی آتی تھی۔ جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اس کے غصہ کرنے اور ڈانٹنے کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا اور اب یونس کے آنے سے اس کا خیال تھا کہ اس سے چھٹکارا مل گیا لیکن اس وقت وہ واقعی چکرا گیا جب یونس نے اس کے کمرے کے دروازے میں آ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ملاقات آئی ہے۔"

"ک...... کون ہے......؟" اس کی ہکلاہٹ پر یونس ہنس پڑا۔

"یعنی اب مجھے بھی چکر دو گے......؟"

"چکر میں تو میں خود پڑا ہوا ہوں۔" وہ جھنجلاتا ہوا دروازے تک آیا اور دور کھڑی شاداں کو دیکھ کر یونس سے کہنے لگا۔

"یار...... ! خدا کے لئے اس لڑکی کو سمجھاؤ...... ! مجھے تو یہ پاگل لگتی ہے۔"

"تیرے پیار میں پاگل......" یونس گنگنایا اور اس کے گھورنے پر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

"معلوم تو کرو...... شاید کسی کام سے آئی ہو......؟"

"نہیں...... ! اسے کوئی کام نہیں ہے۔"

"اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو......؟"

"اس لئے کہ یہ روز آتی ہے اور اپنی فضول بکواس سے میرا دماغ خراب کر دیتی ہے۔" اس نے غصے سے کہا تو یونس کچھ دیر اس کے سرخ چہرے کو دیکھتا رہا پھر قدرے افسوس سے بولا۔

"بڑے بدذوق ہو یار...... ! تمہیں تو دل لگی بھی نہیں آتی۔ تمہاری جگہ اگر میں ہوتا تو......"

"میں اپنی جگہ تمہیں ہی بھیج رہا ہوں۔" وہ فوراً بولا۔

"لیکن مجھے وہ گھاس نہیں ڈال رہی۔ کہہ رہی ہے تمہیں بھیجوں۔ خیر آؤ میرے ساتھ......!" یونس اس کے بازو میں بازو ڈال کر زبردستی اسے کھینچتا ہوا لے گیا اور شاداں کے پاس رُک کر پوچھنے لگا۔

"ہاں بی بی...... ! کیا کام ہے......؟"

"ماسٹر جی نوں بلایا سی۔" شاداں نے اس کی طرف اشارہ کر کے لجا کر کہا تو اس کی دیدہ دلیری پر وہ اندر میں آ گیا۔ یونس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر شاداں سے بولا۔

"کیوں......؟ کیوں بلایا سی......؟"

"میلوں کی پتا جی...... ! اناں کولوں پچھو۔ (مجھے کیا پتا ان سے پوچھو)۔"

"اچھا ٹھیک ہے...... ! ان سے میں پوچھ لوں گا۔ تم جاؤ اور آئندہ یہاں مت آنا۔" یونس نے خاصے

رُعب سے کہا تو وہ بھی تنک کر بولی

''کیوں جی......؟''

''اس لئے کہ یہ اسکول ہے......بچوں کا اسکول......تمہارا روز روز یہاں آنا خود تمہارے حق میں اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بچے اتنے نا سمجھ نہیں ہیں۔ گلی گلی میں چرچا کرتے پھریں گے کہ تم یہاں آتی ہو۔'' یونس نے اپنے طور پر اسے کسی خطرناک صورت حال سے ڈرایا لیکن وہ بڑے آرام سے پوچھنے لگی۔

''فیر کتھے آواں......؟ (پھر کہاں آؤں)۔''

''اُف......!'' یونس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر اس کا بازو جھنجھوڑ کر بولا۔

''یار......! تو بھی تو کچھ بول۔''

''ہونہہ......!'' اس نے سر جھٹکا اور تیز قدموں سے کلاس روم میں گیا۔ پتا نہیں یونس کتنی منتوں سماجتوں کے بعد اسے بھیج پایا۔ اس کے بعد ہاف ٹائم کا گھنٹہ بجا کر اس کے پاس آ کر بیٹھا اور اسے دیکھ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا لیکن بولا کچھ نہیں۔ تب یونس خود ہی کہنے لگا۔

''شروع شروع میں میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک لڑکی خواہ مخواہ گلے پڑ گئی اور کچھ دن تو میں نے بھی اس کے ساتھ دل لگی کی لیکن پھر یہ سوچ کر سنبھل گیا کہ کہیں نوکری سے ہی نہ ہاتھ دھونے پڑیں اور ہاں......! مجھ سے پہلے جو ماسٹر تھا اس نے نوکری کی پروا نہیں کی۔ وہ بھگا لے گیا۔''

''کیا......؟'' اس نے تاسف کے ساتھ تعجب سے دیکھا۔

''اور کیا......؟ سب ہماری طرح مجبور تھوڑی ہوتے ہیں۔ اس پر نہیں ہو گی کوئی ذمہ داری اس لئے لے گیا بھگا کر۔''

''اور یہاں......میرا مطلب ہے اس لڑکی کے ماں باپ......؟''

''ارے چھوڑ یار......! ماں باپ اتنے بے خبر نہیں ہوتے سب خبر ہوتی ہے انہیں۔ تمہارا کیا مطلب ہے یہ جو ابھی آئی تھی تو اس کے گھر والوں کو پتا نہیں ہوگا......؟ اس لئے تو اتنی نڈر تھی۔ جانتی تھی کہ وہ ماں باپ کے سینوں پر بوجھ ہے جسے وہ خود نہیں سرکا سکتے بلکہ اس کے سرکنے کے منتظر ہیں۔'' یونس تلخ حقائق بیان کر رہا تھا۔

''وہ بھی کیا کریں بیچارے......؟ ایک کمانے والا، کھانے والے دس۔ پیٹ کو روٹی ملتی نہیں، تعلیم کہاں سے دلائیں......؟ بچوں کو تعلیم دلانے سے اور کچھ نہیں تو بندے کو کم از کم اچھے دنوں کی اُمید کا سہارا تو مل ہی جاتا ہے اور یہاں کیا ہے......؟ یہ بچے پرائمری پاس کر کے نکلیں گے تو ان میں سے تین یا چار کسی قریبی شہر جا کر میٹرک اور اس کے بعد بھی جہاں تک جا پائیں پڑھ سکیں گے باقی سب تو یہیں آوارہ گردی کرتے نظر آئیں گے اور ایسے ہی آوارہ گردوں کے پلے باندھنے سے بہتر لڑکیوں کے ماں باپ چاہتے ہیں کہ انہیں ہمارے جیسے ہی مل جائیں جو انہیں دو وقت روٹی کھلا سکیں۔''

یونس خاموش ہوا تو اس کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ چپ چاپ گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھنے لگا جن کے مقدروں پر چھائے غربت اور ناخواندگی کے بادل چھٹنے میں جانے ابھی کتنی صدیاں درکار تھیں نصف صدی تو محض دعوؤں میں گزر گئی تھی اور ان دعوؤں کو سچ کرنے والا کون ہوگا کون مسیحائی کو آئے گا کوئی عیسیٰ؟

کوئی خضر؟ یا حالات کی چکی میں پسنے والے کسی دن بغاوت پر آمادہ ہو کر سب ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

○ ○ ○

اس کے گھر سے اماں کا خط آیا تھا۔ انہوں نے راحیلہ کی شادی طے کر دی تھی اور اسے فوراً بلایا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ سوچ بھی رہا تھا کہ چار پانچ دنوں کی چھٹی لے کر گھر والوں سے مل آئے۔ چھ مہینے ہو گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور اس سے پہلے وہ کبھی اتنا عرصہ گھر سے دُور نہیں رہا تھا۔ بہرحال اب راحیلہ کی شادی تھی تو اس نے پورے پندرہ دن کی چھٹی لے لی اور اسی وقت گھر سے اپنا سوٹ کیس لے کر نکلا تو پہلے حوالدارنی کو بتانے کے لئے اس کے کھیت پر چلا آیا۔ وہ پیپل کے پیڑ تلے گائے کو اس کا قاعدہ پڑھا رہی تھی اور اس کے پاس کیونکہ وقت کم تھا اس لئے اس کے سر پر جاتے ہی بولا۔

''سنو......! میں رحیم یار خاں جا رہا ہوں۔''

''اکیلے؟'' حوالدارنی نے سر اُونچا کر کے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ سمجھا نہیں اور کچھ حیران ہو کر بولا۔

''کیوں......؟ تمہیں بھی جانا تھا......؟''

''میں کیوں جاؤں گی......؟''

''پھر پوچھا کیوں......؟ ظاہر ہے میں اکیلا ہوں تو اکیلا ہی جاؤں گا۔''

''کسی کو بھگا کر بھی تو لے جا سکتے ہو......؟'' اس نے جتنے آرام سے کہا وہ اسی قدر سلگ گیا اور کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ ہنسی۔ اسی انداز میں اپنی بات کی نفی کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں......! تم میں اتنا دم خم نہیں ہے بلکہ مجھے تو تمہاری فکر رہتی ہے کہ کہیں کوئی تمہیں نہ بھگا کر لے جائے۔'' اس نے سامنے پڑے پتھر کو پیر کی ٹھوکر سے ہوا میں اُچھالا پھر دانت پیس کر بولا۔

''میں اگر تمہارا لحاظ کرتا ہوں تو صرف اس لئے کہ تم ایک عورت ہو ورنہ......''

وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ پیچھے وہ چیخ چیخ کر پکار رہی تھی۔

''اے ماسٹر......! سنو تو......! واپس بھی آؤ گے یا ہمیشہ کے لئے جا رہے ہو......؟ میرا حساب تو چکا کر جاؤ۔ پورے ڈیڑھ سو نکلتے ہیں تمہاری طرف۔'' اس نے کوئی دھیان نہیں دیا اور پیروں سے دھول اُڑاتا چلا گیا۔

سفر خاصا طویل تھا لیکن آگے چھوٹے بہن بھائیوں نے اس کی آمد پر جس خوشی کا اظہار کیا اس سے ساری تھکان دُور ہو گئی۔ پھر اماں نے ڈانٹ کر جمیلہ اور خالد کو اس کے پاس سے ہٹایا اور اسے نہانے کو کہا۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کیونکہ گرد و غبار نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ کتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد وہ جی بھر کر نہایا کیونکہ وہاں صرف ایک بالٹی وہ بھی نیچے سے بھر کر لانی پڑتی تھی اور اب ظاہر ہے ایک بالٹی سے دل نہیں بھرتا تھا۔ نہا کر نکلا تو راحیلہ کھانا لے آئی۔ اسی وقت ابا بھی آ گئے اور کھانے کے دوران ہی اسے سمجھانے لگے کہ وہ ناحق دیہاتوں میں خوار ہو رہا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے کراچی چلا جائے۔ بڑا شہر ہے کہیں اچھی نوکری مل جائے گی۔

''بڑے شہروں کے مسائل بھی بڑے ہوتے ہیں ابا......! وہاں رہنے والوں کو نوکری نہیں ملتی مجھے کہاں سے مل جائے گی......؟ اور میں اپنی اس نوکری سے بہت مطمئن ہوں۔ رہی دیہات کی بات تو کچھ عرصے بعد ٹرانسفر کروا لوں گا۔'' اس نے کہا تو ابا ناگواری سے بولے۔

"رہو گے ماسٹر۔"

"آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے میں کوئی برا کام کر رہا ہوں۔ ہم نے جن سے پڑھا ہے وہ بھی تو ماسٹر ہی تھے اور ان کی تو آپ بہت عزت کرتے تھے پھر میرے ماسٹر ہونے میں آپ کو کیا برائی نظر آتی ہے......؟"

"برائی یہ ہے کہ اس میں ترقی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہیڈ ماسٹر ہو جاؤ گے۔"

"میں ہیڈ ماسٹر بھی نہیں ہوں گا کیونکہ مجھے پڑھانے کا شوق ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"اس شوق سے تم صرف اپنا پیٹ بھر سکتے ہو۔ کل کو شادی ہو گئی تو بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤ گے......؟"

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔ دوسرے ماسٹر تو جیسے سدا کنوارے رہتے ہیں۔ سب بال بچوں والے ہوتے ہیں اور کھلانے والا اللہ ہے۔" وہ دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتا اُٹھ کھڑا ہوا تو اماں نے فوراً ٹوکا۔

"کھانا تو کھا لو......!"

"بس......! کھا لیا۔" پھر جمیلہ سے چائے کا کہہ کر چھت پر چلا آیا۔

وہ کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی تو خالد اور راحیلہ بھی ساتھ تھے اور رات دیر تک بہن بھائی محفل جمائے بیٹھے رہے۔ وہ انہیں حوالدارنی کے قصے سنا سنا کر حیران کرتا رہا کہ کیسے ایک عورت سارے قصبے پر اپنی دھاک جمائے ہوئے ہے۔ مجال ہے جو کوئی اس کے سامنے سر اٹھا سکے۔

"کیا وہ وہاں کی چوہدرانی ہے......؟" جمیلہ نے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں بھئی......! معمولی عورت ہے۔ بس ایک چھوٹا سا کھیت ہے جس پر سبزیاں کاشت کرتی ہے۔"

"پھر لوگ اس سے ڈرتے کیوں ہیں......؟"

"اس کی زبان سے ڈرتے ہیں۔ مردوں کو مات دے جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے رکھ کے اس کے دو تھپڑ دے ماروں۔ بس......! اس کے عورت ہونے کا خیال کر جاتا ہوں۔ ویسے ہے بڑی دلیر۔" وہ اس کی تعریف کرنے سے بھی نہیں رہ سکا۔

"بڑے بڑے کام اکیلی کر لیتی ہے اور کسی کی مدد لینا تو گوارا ہی نہیں کرتی۔"

"اور اس کا شوہر......؟"

"شوہر نہیں ہے بس ایک بچہ ہے چار پانچ سال کا۔" اس نے بتایا تو راحیلہ افسوس سے بولی۔

"پھر تو بیچاری بڑی دکھی ہو گی......؟"

"لو...... سارے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے اس نے اور تم کہہ رہی ہو دکھی ہو گی۔" خالد نے راحیلہ کا مذاق اڑایا لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہ کر بولی۔

"ٹھیک تو ہے۔ وہ اگر ایسا نہ کرے تو لوگ اس کا جینا حرام کر دیں۔" اس نے چونک کر راحیلہ کو دیکھا اور اس کی بات کی گہرائی میں اترنے لگا۔ جب محفل برخاست ہوئی تب بھی وہ یہیں غوطے کھا رہا تھا۔

○○○

پھر اگلے دن سے وہ بہت مصروف ہو گیا۔ خریداری کی لمبی لسٹ اماں نے اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ بازاروں کے چکر کے علاوہ وہ رشتہ داروں کے ہاں دعوت نامے، پھر کسی اچھے پکانے والے کا انتظام، ایک کے

بعد ایک کام نکلتا گیا۔ گھر کی پہلی شادی تھی اس لئے سوچ سوچ کر ہی کام یاد آتے تھے اور یہ فکر بھی تھی کہ کچھ رہ نہ جائے۔ اس لئے آخری وقت تک وہ مصروف رہا۔

راحیلہ رخصت ہوئی تو جہاں اسے وداع کرتے ہوئے وہ آبدیدہ تھا وہاں یہ اطمینان بھی تھا کہ بہن عزت و آبرو سے اپنے گھر کی ہوئی۔ بہرحال اس کے بعد اس کی چار چھٹیاں باقی تھیں جو اس نے اپنے پرانے یاروں دوستوں سے ملنے اور آرام کرنے میں گزاریں۔ پھر جب واپس آنے لگا تو ابا ایک بار پھر اس کے پیچھے پڑ گئے کہ کراچی چلے جاؤ اور اب کے اس نے بحث نہیں کی۔ بس یہی کہا کہ سوچوں گا۔

ٹرین لیٹ ہونے کے باعث شام ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو حوالدارنی کاکے کو نل کے نیچے بٹھا کر نہلا رہی تھی۔ اسے اپنے بدن پر مٹی دھول کاٹنے لگی۔ دل چاہا کاکے کو ہٹا کر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے۔

"اماں......! ماسٹر جی......!" پانی کی موٹی دھار سے کھیلتے ہوئے کاکے نے اسے دیکھا اور فوراً اماں کو مطلع کیا تو وہ ہینڈ پمپ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

"آ گئے......!" اس نے سوال نہیں کیا تھا اس لئے وہ خاموش رہا اور سوٹ کیس نیچے رکھ کر چارپائی پر بیٹھنے لگا تھا کہ اس نے فوراً ٹوک دیا۔

"اے ادھر نہیں...... سیدھے اوپر جاؤ......! چلو......!"

"ذرا سانس تو لینے دو۔"

"سانس بھی اوپر جا کر لینا...... کوئی رعایت نہیں۔"

وہ انگلی سے "چلو چلو" کا اشارہ کرنے لگی تو توہین کے احساس کے ساتھ وہ سوٹ کیس اٹھاتا فوراً اوپر آ گیا اور جو گالیاں وہ بیچ چوراہے میں کھڑی ہو کر بکتی تھی وہ دل ہی دل میں اس کے نام کر رہا تھا۔

اگلی صبح جب وہ اسکول کے لئے نکلنے لگا تو کاکا پھر اس کے ساتھ ہو گیا لیکن وہ اس کی ماں کے رات والے سلوک سے اس قدر تپا ہوا تھا کہ اسے ساتھ لے جانے سے صاف منع کر دیا۔

"اپنی ماں سے کہو وہی تمہیں چھوڑ آئے گی۔" وہ عقب میں کھڑی سن رہی تھی۔ چیخ کر بولی۔

"کیوں......؟ تم کیوں نہیں لے جا رہے......؟"

"میری مرضی......!" اس نے بے نیازی دکھائی۔

"اوہو......! بڑے مرضی والے آ گئے چلو اٹھاؤ اپنا سامان اور نکلو یہاں سے میرا کمرہ خالی کرو اسی وقت۔"

"ک...... کیا مطلب ہے تمہارا......؟" وہ بوکھلا گیا لیکن پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔

"ہاں ہاں......! کر دوں گا خالی۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے یہاں رہنے کا۔ یہ مہینہ ختم ہونے تک میں اپنا دوسرا انتظام کر لوں گا۔"

"مہینہ ختم ہونے میں بہت دن ہیں اور مجھے ابھی کمرہ چاہئے۔"

"ابھی اس وقت میں سامان لے کر کہاں جاؤں گا......؟"

"مجھے کیا پتا......؟" اب اس کے بے نیازی دکھانے پر وہ بری طرح تلملا گیا اور سمجھ بھی گیا تھا کہ صرف کاکے کو ساتھ نہ لے جانے کی وجہ سے وہ ایسا کہہ رہی ہے جب ہی بہت ضبط کرتا ہوا کاکے کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"چل کاکے......؟"

"جب تک تم یہاں ہو کاکا تمہارے ساتھ جائے آئے گا۔ سنا ماسٹر......؟" پیچھے سے وہ حکم صادر کر رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا اور سارا دن وقفے وقفے سے یونس سے کہتا رہا کہ اسے کوئی اور ٹھکانا بتائے۔

"یہ آتے ہی تمہارا حوالداری سے پھڈا ہو گیا ہے یا تمہارے گھر والوں نے تمہیں ایک عورت کے پاس رہنے سے منع کیا ہے......؟" یونس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"یار......! عجیب عورت ہے۔ حکم یوں چلاتی ہے جیسے میں اس کا زر خرید ہوں اور میں نے اب تک بہت برداشت کر لیا اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔" وہ واقعی عاجز نظر آ رہا تھا۔

"اچھا دیکھو...... میں کوشش کروں گا۔" یونس نے ہامی بھری تو وہ مزید منت سے بولا۔

"بھول نہیں جانا یار......! اپنے چاچا سے کہو وہ تو یہیں کے رہنے والے ہیں۔ انہیں سب پتا ہو گا۔"

"ہاں......! فکر نہیں کرو۔ ان سے بھی کہوں گا اور اگر کہیں انتظام نہیں ہوا تو یہاں اسکول میں چلے آؤ۔ اتنے سارے کمرے ہیں کسی ایک میں ٹھکانا کر لو۔"

"یہاں آتے ہوئے میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن یہاں پانی تو ہے نہیں اور نہ باتھ روم۔" اس نے اصل مسئلے کی طرف نشاندہی کی پھر خود ہی کہنے لگا۔

"دیکھو ناں......! میں اپنی مدد آپ کے تحت یہاں ایک باتھ روم بنا لوں۔ کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں ہے۔ بچے بھی ساتھ مل جائیں گے۔"

"اور پانی......؟"

"پانی کے لئے پوری نہر بہہ رہی ہے۔" وہ یوں خوش ہو رہا تھا جیسے اس کا مسئلہ حل ہو گیا پھر اسی وقت اس نے اپنے لئے ایک کمرہ منتخب کر کے اسے کھول دیا اور اگلے دن دوسرا کام شروع کرنے کا سوچ کر مطمئن ہو گیا۔

"بس......! یہ مہینہ ختم ہوتے ہی یہاں آ جاؤں گا۔"

"ابھی کیوں نہیں......؟" یونس نے پوچھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"تھوڑا بدلہ تو لے لوں حوالداری سے۔ اب تک تو یوں خاموش تھا کہ رہنے کو کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا اور اب وہ کچھ بولے گی تو ایسی تیسی کر کے نکل آؤں گا۔"

"ایسا غضب مت کر یار......! وہ یہاں تک پہنچ جائے گی۔"

"پہنچ جائے۔" اب جیسے اسے کوئی پروا نہیں تھی اور یونس نے قدرے تعجب سے کندھے اچکائے تھے۔



پھر اگلے دو دن میں اس نے لڑکوں کے ساتھ مل کر باتھ روم تیار کر لیا تو خوش ہونے کے ساتھ اسے افسوس اس بات کا تھا کہ یہ کام پہلے کیوں نہ کر لیا۔ خواہ مخواہ ایک عورت کی اتنی بری سنتا رہا۔ اسے وہ رات یاد آئی جب سخت سردی میں وہ سڑکوں پر ٹھٹھرتا پھر رہا تھا اور اس کے بعد بھی اسے اسی گھر میں جانا پڑا تھا۔ پھر جب وہ اپنے لئے دوسرا گھر تلاش کر رہا تھا تو اس نے کیسی دھمکی دی تھی کہ کر کے دیکھو اپنی مرضی...... میں دیکھتی ہوں کون تمہیں رکھتا ہے......؟ حشر خراب کر دوں گی اس کا اور ساتھ میں تمہارا بھی۔ وہ اس کی دھمکی سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے بھی

مرعوب ہو گیا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ کیسی عورت ہے۔ اس لئے یہ سوچ کر اس نے اپنی کوششیں ترک کر دی تھیں کہ جانے وہ دوسرے لوگوں کا کیا حشر کرے۔ اپنی فکر نہیں تھی اسے۔ اس کی کون سی یہاں ماں بہنیں بیٹھی تھیں جنہیں وہ بیچ چوراہے میں رسوا کرتی۔ دوسرے لوگ اسی ڈر سے تو اس کے سامنے خاموش رہتے تھے۔

(ہونہہ......!)۔ اس نے سر جھٹک کر سامنے دیکھا تو ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ سفید کلف زدہ شلوار سوٹ اور سر پر بڑا سا پگڑ۔ وہ اسے علاقے کا چوہدری سمجھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم......؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"او جی...... ماسٹر جی کہاں ہیں......؟" اس نے پوچھا تو وہ اپنے حلیے پر جز بز ہو کر بولا۔

"جی فرمایئے......! میں ماسٹر شجاعت ہوں۔"

"اچھا جی...... ماسٹر شجاعت......! وہ میرا بھتیجا پڑھتا ہے یہاں میں اس کو لینے آیا ہوں۔" وہ خود کو معزز ظاہر کرنے کے لئے اُردو بول رہا تھا جس کے لئے اسے خاصی کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔

"وڈی دور سے آیا ہوں جی...... تے واپس وی جاناں اے۔"

"جی......! کیا نام ہے آپ کے بھتیجے کا......؟"

"عارف حسین ولد صفدر حسین۔"

"کون سی جماعت میں پڑھتا ہے......؟" اسے نام سنا ہوا ضرور لگا لیکن فوراً یاد نہیں آیا۔ جبھی کلاس پوچھی تو وہ قدرے بوکھلا کر بولا۔

"وہ جی...... وہ چھوٹا کاکا ہے۔ پہلی جماعت میں ہے کہ دوسری میں۔"

"میں سمجھا آپ کاکے کا پوچھ رہے ہیں وہ حوالدارنی کا بیٹا۔" اسے کاکے کا نام یاد آ گیا۔

"ہاں جی......! ہاں جی......! وہی کاکا...... میں اس کو لینے آیا ہوں۔ اس کا چاچا ہوں ناں میں۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آیئے تشریف رکھئے......!" اس نے رسمی جملہ بول کر اخلاقی تقاضا نبھایا۔

"بڑی مہربانی جی......! کبھی فرصت سے آیا تو بیٹھوں گا آپ کے پاس۔ ابھی تو جلدی میں ہوں ذرا دور وی جاناں اے۔ تھوڑا سا وقت ہے بھتیجے کے ساتھ گزار لوں۔ بھائی تو اللہ کو پیارا ہو گیا اس کی ایک اک نشانی ہے بس اس کو بلا دو۔" اس نے آبدیدہ ہو کر گویا التجا کی تو وہ جلدی سے جا کر کاکے کو اپنے ساتھ لے آیا اور اس شخص کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

"کون ہے بیٹا یہ......؟"

"چاچا......!" کاکے نے کہا لیکن لپک کر اس کی طرف نہیں گیا جبکہ وہ بانہیں پھیلائے کھڑا تھا تب وہ خود ہی آگے آیا اور کاکے کو بازوؤں میں بھر کر بولا۔

"چل پتر......! تیری اماں انتظار کر رہی ہے۔ میٹھے پراٹھے بنائے ہیں اس نے ہم دونوں کے لئے۔"

پھر سیدھا کھڑا ہوا اور کاکے کو اپنے کندھے پر بٹھاتے ہوئے اس سے بولا۔

"اچھا ماسٹر جی......! بڑی مہربانی......! کاکے کو لے جا رہا ہوں۔"

"جی......؟"

"میں اماں کے پاس جاؤں گا۔" کاکا چیخ پڑا۔

"ہاں پتر......! اماں کے پاس ہی جا رہے ہیں۔" وہ کہتا ہوا اونٹ کی طرح گردن ہلاتا چل پڑا تو اس نے کچھ دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر کلاس روم میں آ گیا۔

چھٹی کے بعد وہ روزانہ کی طرح یونس کے ساتھ اسکول سے نکلا اور کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد جب یونس اپنے راستے پر مڑ گیا تب اکیلے چلتے ہوئے اسے کاکے کا خیال آیا اور یہ کہ اسے گیارہ بجے ہی اس کا چاچا لے گیا تھا پتا نہیں وہ ابھی بھی گھر میں موجود ہو گا یا جا چکا ہو گا۔ وہ یہی سوچتا ہوا آ رہا تھا کہ پیپل کے تنے سے حوالدارنی کو ٹیک لگائے بیٹھے دیکھ کر وہ اس کے عقب میں رُک گیا اور اس کی گنگناہٹ سننے لگا۔

پیلو پکیاں وے پکیاں وے
آ چنوں رل یار ....
آ چڑوں دل ہار ....

"لو...... آ گیا۔" وہ یونہی شرارت پر آمادہ ہو کر اس کے سامنے آ کر بولا تو وہ ہونٹ بھینچ کر تیز نظروں سے گھورنے لگی۔

"اس طرح کیوں گھور رہی ہو......؟ ابھی خود ہی تو......"

"میں اپنے محبوب کو بلا رہی ہوں۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

"وہ نہیں آئے گا۔" اس نے اس خیال سے کہا کہ وہ فوراً پوچھے گی "کیوں"۔ تب وہ اس کا مذاق اُڑا کر کہے گا تمہاری حرکتوں کی وجہ سے۔ لیکن اس کے برعکس وہ آزردگی میں گھِر کر بولی۔

"میں جانتی ہوں۔"

"اچھا......!" وہ خجالت مٹانے کو ذرا سا جھینپا پھر فوراً بات بدلتے ہوئے بولا۔

"سنا ہے تم نے مہمانوں کی خاطر مدارت میٹھے پراٹھوں سے کی ہے۔"

"کون سے مہمان......؟" وہ ٹھٹک کر بولی۔

"میرے ہاں کوئی مہمان نہیں آتا۔"

"ہاں......! کاکے کا چاچا مہمان تو نہ ہوا۔" اس نے کہا تو وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور آس پاس دور تک دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کاکا کہاں ہے......؟"

"کیا مطلب......؟" وہ اس کے جارحانہ انداز پر سٹپٹایا۔

"میں پوچھتی ہوں کاکا کہاں ہے......؟ کہاں چھوڑ آئے ہو اسے......؟"

"افوہ......! میں کہاں چھوڑوں گا......؟ اس کا چاچا آیا تھا وہ لے گیا۔" وہ جھنجھلا کر بولا تو ایک پل کو وہ اپنی جگہ سُن ہو گئی اور دوسرے پل چیخ پڑی۔

"کیا کہا......؟ کاکے کو اس کا چاچا لے گیا۔ ہائے ابا......!" اس نے اپنے سینے پر دو ہتھڑ مارے پھر جیسے حواسوں میں نہیں رہی اور بھوکی شیرنی کی طرح اس پر پل پڑی۔

"میں اپنا کاکا تجھ سے لوں گی ماسٹر......! تو نے مجھ سے پوچھے بغیر اسے کیسے بھیج دیا......؟ بتا کس کے ساتھ بھیجا......؟" وہ اس کے ہاتھوں سے اپنا گریبان چھڑوانے کی کوشش میں پریشان ہو گیا۔ آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں نے پہلے اپنی جگہ ٹھٹک کر دیکھا پھر سب ان کے گرد جمع ہو گئیں تو اتنی عورتوں کے بیچ تماشا بننے پر وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا جبکہ حوالدارنی کوئی لحاظ نہیں کر رہی تھی۔ جس رفتار سے چیخ چیخ کر بول رہی تھی اسی تیزی سے اس کے ہاتھ چل رہے تھے۔

"تو نے میرے بیٹے کو اس کے دشمنوں کے حوالے کر دیا ماسٹر......! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تیری لاش کے ٹوٹے بھی نہیں ملیں گے۔ اگر تو زندہ سلامت اپنے گھر جانا چاہتا ہے تو ابھی اسی وقت میرا بیٹا لا دے۔" وہ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ تب بہت مجبور ہو کر اس نے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا جس سے وہ دور جا گری لیکن فوراً ہی اٹھ کر دوبارہ اس پر جھپٹنا چاہتی تھی کہ وہ مردانہ طاقت استعمال کرتا ہوا اس کی دونوں کلائیاں تھام کر سخت لہجے میں بولا۔

"خبردار......! ایک لفظ نہیں کہنا۔ اس طرح جنگلی پن کا مظاہرہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم......؟"

"جنگلی تیری ماں......! تیری......"

"شٹ اپ......!" وہ اس سے زیادہ اونچی آواز میں چلایا۔

"میری ماں بہن کا نام لیا تو تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ سیدھی طرح بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے......؟ بلکہ اس سے پہلے مجھ سے سنو......!" وہ یونہی اس کی کلائیاں تھامے ہوئے نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھا اور کھینچ کر اسے بھی بٹھایا پھر پہلے اطراف میں کھڑی عورتوں کو جانے کا اشارہ کیا اس کے بعد اس سے کہنے لگا۔

"دن میں گیارہ بجے کے قریب ایک شخص میرے پاس آیا تھا اور خود کو کاکے کا چاچا بتا کر کہا کہ وہ کاکے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تمہارے پاس سے ہو کر آیا ہے۔ اس کے باوجود میں نے کاکے کو بلا کر اس سے تصدیق کروائی کہ وہ واقعی اس کا چاچا ہے۔ اس کے بعد میں نے کاکے کو اس کے ساتھ جانے دیا اور مجھے نہیں معلوم وہ اسے کہاں لے گیا ہے......؟ کیونکہ اس وقت وہ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ تمہارے پاس آ رہا ہے یعنی کاکے سے کہہ رہا تھا کہ گھر چلو تمہاری اماں نے ہمارے لئے میٹھے پراٹھے بنا کر رکھے ہیں۔ اب تم بتاؤ تمہاری ان سے کیا دشمنی ہے اور وہ کاکے کو لے کر کہاں گیا ہو گا......؟"

بولتے ہوئے آپ ہی آپ اس کی کلائیوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی اور وہ جو بڑے غور سے سن رہی تھی آخر میں اس کے سوالوں پر جھٹکے سے اپنی کلائیاں چھڑا کر تڑخ کر بولی۔

"تو......! تو کیا کرے گا......؟"

"میں تمہارے کاکے کو لے آؤں گا۔"

"ہونہہ......!" وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر زمین میں سیدھا گڑا اپنا بیلچہ نکال کر کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"عورت کو تھپڑ مار کر سمجھتا ہے بڑا جی دار ہو گیا۔ ارے! کسی اپنے جیسے پر ہاتھ ڈال کر بتا تب جانوں۔"

"میں...... میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا۔" وہ اپنی طرف سے معذرت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بول پڑی۔

"تمہاری مجال ہے مارنے کی...... یہ مت سمجھنا کہ میں تھپڑ سے ڈر گئی...... اُدھار ہے مجھ پر...... ذرا کاکے کو لے آؤں پھر دیکھنا تمہارا کیا حشر کرتی ہوں...... بیچ چوراہے پر ہنگامہ نہ کیا تو بختاور نام نہیں۔"

"اُف......!" اس تصور سے اس کا خون گرم ہو گیا۔ اس عورت کو سمجھانا واقعی بہت مشکل تھا اور وہ جاتے جاتے رُک کر بولی۔

"بھاگ نہیں جانا بزدلوں کی طرح۔"

"نہیں......! میں یہیں اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ باقاعدہ دھرنا مار کر بیٹھ گیا اور اسے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ کچی زمین پر اس کے قدموں کی مضبوطی اس کے ارادے کی پختگی کو ظاہر کر رہی تھی اور وہ اس سے بہت نالاں بہت متنفر ہونے کے باوجود سراہے بغیر نہیں رہ سکا۔ معاً اسے راحیلہ کی بات یاد آئی۔

"ٹھیک تو ہے۔ وہ اگر ایسا نہ کرے تو لوگ اس کا جینا حرام کر دیں۔"

اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ لہرائی اور پھر وہ اس کے مقابل ڈٹ جانے کی بجائے خود کو بزدل کہلوانا منظور کر کے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ جب وہ رات کا کھانا کھانے کے لئے تندور پر آیا تو اسے دیکھتے ہی وہاں موجود لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یوں جیسے شدت سے اس کے منتظر ہوں۔ اس نے محسوس تو کیا لیکن کچھ نہیں پایا اور معمول کی طرح سب کو سلام کرتا ہوا بیٹھ گیا۔

"کیا کھاؤ گے ماسٹر جی؟" تندور والی کا انداز بھی کچھ اور تھا۔ وہ چونکا تھا کہ ادھر سے لالہ جی کی آواز آئی۔

"او ماسی......! ماسٹر جی نوں دُودھ ملائیاں کھوا۔"

"خیر ہے......؟" اس نے قدرے حیرت سے لالہ جی کو دیکھا جو اس کا کندھا تھپک کر بولا۔

"کمال کیتا اے ماسٹر جی تُسی...... حوالدارنی نوں چماٹ دے ماری۔"

"جی......؟" وہ حیرت کے ساتھ ٹھٹکا لیکن پھر فوراً سنبھل کر صاف مکر گیا۔

"نہیں لالہ جی......! میری کیا مجال ہے اس پر ہاتھ اٹھانے کی...... آپ سے کس نے کہا......؟"

"او مزارے دی عورت......" لالہ جی نے اس قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑا۔

"نہیں......! نہیں میرا حوالدارنی سے جھگڑا ضرور ہوا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور وہ جھگڑا بھی نہیں تھا بس وہ اپنی عادت کے مطابق بک بک کر رہی تھی۔"

"اچھا......؟" سب ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے انہیں سخت مایوسی ہوئی ہو اور وہ جلدی جلدی کھانا کھا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔

اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ حوالدارنی کاکے کو لینے کہاں گئی ہے اور اس کی واپسی کب ہو گی پھر بھی وہ اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ گو کہ غلطی اس کی نہیں تھی کیونکہ حوالدارنی نے کبھی اشارتاً بھی نہیں بتایا تھا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے۔ اگر بچے کے معاملے میں ہی اسے خبردار کر دیتی تو وہ کاکے کو ہرگز نہ جانے دیتا اور اب اس کی طرف سے فکر اور تشویش فطری تھی۔ دھیرے دھیرے رات بیت رہی تھی اور وہ اس کے آنگن میں ٹہل رہا تھا۔

اسی حساب سے ذہن سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

(پتا نہیں وہ کہاں رُلتی پھر رہی ہو گی...... اسے بچہ ملا یا نہیں......؟ مجھے اس کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔ وہ

اکیلی عورت کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہے......؟)

معاً چھت پر پتھر لگنے سے اس کی سوچیں منجمد ہو گئیں۔ دھیرے دھیرے اُٹھتے قدم بھی رُک گئے تو اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ سمجھ گیا کہ یہ حرکت شاداں ہی کی ہو سکتی ہے۔ اتنی رات کو جانے اس نے کہاں سے دیکھا تھا۔ کم از کم اپنے دروازے میں کھڑی ہو کر تو وہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ صحن کی چار دیواری خود اس کے قد سے بہت اُونچی تھی بہر حال وہ پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن دوسرے پتھر نے مجبور کر دیا ستاروں کی مدہم روشنی میں وہ اپنی چھت پر کھڑی نظر آئی اور اس کے متوجہ ہوتے ہی اشارے سے اس کے جاگنے اور ٹہلنے کا سبب پوچھنے لگی جواباً اس نے کوئی اشارہ نہیں کیا بس ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا دوسرا اشارہ تھا ساتھ ہلکی سی آواز بھی تھی۔

"میں آؤں......؟"

"اُف......!" وہ پریشان ہو گیا اور فوراً اپنے دروازے کی طرف دیکھا کہ آیا اندر سے بند ہے کہ نہیں۔ حوالدارنی کے لئے دروازہ کھلا تھا۔ اس نے بھاگ کر بند کیا پھر اس کی طرف دیکھے بغیر اُوپر آ کر لیٹ گیا تو کچھ دیر تک وقفے وقفے سے اس کی چھت پر چھوٹے چھوٹے پتھر گرتے رہے پھر شاید وہ مایوس ہو گئی اور یہ سلسلہ بند ہونے کے بعد ہی اس کی سوچیں وہیں سے شروع ہو گئی تھیں جنہوں نے اسے پوری رات نہیں سونے دیا۔ صبح کے قریب کہیں جا کر اس کی آنکھ لگی اور شاید وہ بہت دیر تک سوتا لیکن سورج کی پہلی کرن نے ہی اُٹھا دیا۔ دوبارہ سونے کی غرض سے وہ کمرے میں آیا تھا کہ اچانک حوالدارنی کے خیال سے اس کی نیند اچاٹ ہو گئی۔

(شاید وہ آ گئی ہو)۔ وہ تکیہ پھینک کر نیچے بھاگ آیا لیکن دروازہ رات خود اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔ وہ آتی تو دستک دیتی اور وہ ایسی بے خبری کی نیند بھی نہیں سویا تھا۔ اس کا ذہن پھر اس کو سوچنے لگا اور وہ یونہی منہ ہاتھ دھو کر وہ باہر نکل آیا۔ چائے کی شدید خواہش کے باوجود وہ کہیں نہیں رُکا۔ کیونکہ ابھی بھی لوگ اسے معنی خیز انداز میں سلام کر رہے تھے اور وہ سر جھکائے سب کے سلام کا جواب دیتا آبادی سے دُور نکل گیا۔

عجیب سی بے کلی تھی۔ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے۔ ایسی ہی پریشانی کے عالم میں وہ مختلف راستوں سے گزرتا ہوا اسکول پہنچ گیا۔ بچے آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ برآمدے میں کرسی رکھ کر بیٹھا اور ایک بڑے بچے کو بلا کر اسے چائے اور ساتھ میں پاپے (رس) لانے کو بھیج دیا۔

جس وقت یونس آیا وہ چائے میں پاپے (رس) ڈبو کر کھا رہا تھا جس پر وہ حیرت سے چلایا۔

"ارے......! سارے گاؤں میں تمہارا چرچا ہو رہا ہے اور تم یہاں بیٹھے پاپے (رس) کھا رہے ہو۔"

"کیا مطلب......؟" وہ سمجھ کر انجان بنا۔

"لوگ تمہاری بہادری پر خوش ہو رہے ہیں۔ سنا ہے تم نے حوالدارنی کو......"

"نہیں یونس......!" وہ فوراً بول پڑا۔

"پتا نہیں لوگوں میں کس نے یہ بات مشہور کر دی ہے۔ اس میں کوئی صداقت نہیں البتہ وہ ضرور مجھ پر چیخی چلائی تھی اور گریبان بھی پھاڑ ڈالا۔"

"کیوں......؟" یونس متعجب ہوا۔

"بس......! غلطی میری ہی تھی۔ میں نے اس کی اجازت کے بغیر کاکے کو اس کے چاچے کے ساتھ بھیج

دیا۔ اسی پر وہ ناراض ہوئی۔" اس نے سارا الزام اپنے سر لے لیا پھر خالی کپ ایک طرف رکھتا ہوا بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"تم بتا سکتے ہو کاکے کو اس کا چاچا کہاں لے گیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے اس کے چاچے کا گھر کہاں ہے؟"

"نہیں یار...... ! مجھے نہیں معلوم۔" یونس نے اس کے انداز میں جواب دے کر گھڑی دیکھی اور ایک بچے کو گھنٹہ بجانے کا اشارہ کیا تو وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

پھر بڑی مشکل سے وہ اس کی طرف سے دھیان ہٹا کر بچوں کو پڑھا پایا تھا اور اس کے لئے اسے بہت کوشش کرنی پڑی تھی۔ پھر بھی جہاں ذرا سی فراغت ملتی اس کا ذہن بھٹک جاتا۔

(پتا نہیں کاکا ملا یا نہیں......؟)۔ چھٹی کے بعد جب وہ گھر کی طرف آ رہا تھا تب بھی یہی سوچ رہا تھا۔

راستے میں حوالدارنی کا کھیت آیا تو اس نے دیکھا کہ دو لڑکے بڑی بے دردی سے اس کے کھیت کی کچی سبزیاں نوچ رہے تھے جس کا مطلب تھا وہ ابھی تک نہیں لوٹی ورنہ اس کی موجودگی میں کوئی اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

"اوئے......!" اس نے اونچی آواز میں سب لڑکوں کو للکارا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور اس خیال سے کہ کہیں وہ پھر نہ آ جائیں وہ وہیں پیپل کی چھاؤں تلے بیٹھ گیا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک لڑکا بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا اور پھولی سانسوں کے درمیان بتانے لگا۔

"ماسٹر جی...... ! تہاڈا سامان حوالدارنی باہر سٹ رئی اے۔" (آپ کا سامان حوالدارنی باہر پھینک رہی ہے)۔ اس نے پوری بات بھی نہیں سنی اور اُٹھ کر چل پڑا۔ گھر کے سامنے تماشا دیکھنے والے بھی موجود تھے۔ وہ ان کے درمیان سے جگہ بناتا آگے آیا تو حوالدارنی چھت پر کھڑی اس کی ایک ایک چیز وہیں سے نیچے کچی سڑک پر پھینک رہی تھی اور اپنی بے عزتی کے خیال سے وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکا۔ یہ کیا کم بے عزتی ہو رہی تھی۔ آس پاس کے گھروں سے عورتیں سر نکال کر دیکھ رہی تھیں اور اس کے اطراف مجمع سا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے نیچے بیٹھا اور سوٹ کیس کھول کر ادھر ادھر سے چیزیں اُٹھا کر اس میں ڈالنے لگا۔

"اب بھی مجھے تیری شکل نظر نہیں آنی چاہئے ماسٹر...... ! اور سن لو تم لوگ...... ! کسی نے اسے اپنے گھر میں جگہ دی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ آخر میں چیخ کر اسے اور پھر سب کو مخاطب کر کے بولی تو وہ سر اُونچا کر کے اسے دیکھنے لگا۔ پتا نہیں غصے سے یا سامان پھینکنے کی مشقت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا ایک ہی جست میں اُوپر جا کر تھپڑوں سے اس کا منہ مزید لال کر دے۔ بڑی مشکل سے خود پر ضبط کرتا وہ سر جھٹک کر کھڑا ہوا اور سامان اُٹھا کر چل پڑا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ اسکول میں اپنی رہائش کا انتظام کر چکا تھا ورنہ اس وقت سیدھا اسٹیشن جانا پڑتا جو اس کے لئے اور بے عزتی کی بات ہوتی۔

(کیا اُلو کا پٹھا ہوں میں جو اس عورت کے لئے پریشان رہا؟)۔ رات میں وہ اپنے آپ پر جھنجھلا رہا تھا۔

(چھوڑوں گا نہیں میں اس بے عزتی کا وہ بدلہ لوں گا کہ یاد کرے گی سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟ ہونہہ!)۔

○○○

اگلے روز اسکول میں کتنے لوگ اس سے ہمدردی جتانے آئے تو وہ اور تلملا گیا اور سارا وقت اس سے انتقام کے طریقوں پر غور کرتا رہا۔ چھٹی کے بعد یونس نے بہت کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے لیکن اس نے منع کر دیا

اور اس کے جانے کے کافی دیر بعد کھانا کھانے کے لئے نکلا تو قصداً حوالدارنی کے کھیت کا راستہ اختیار کیا۔ مقصد اس پر جتانا تھا کہ دیکھ لو میں یہیں موجود ہوں اپنے تئیں گردن اکڑا کر چل رہا تھا۔ لیکن آگے وہ یوں بن گئی جیسے اس سے پہلے کبھی اسے دیکھا ہی نہیں جس سے وہ خجل سا ہو کے رہ گیا اور محض اپنی خجالت مٹانے کی خاطر اسے مخاطب کر گیا۔

"سنو...... ! کاکا مل گیا......؟"

"تجھے کیا......؟ تو کون ہوتا ہے کاکے کا پوچھنے والا......؟" تڑخ کر جواب آیا۔

"اُستاد ہوں اس کا...... دو دن اور اسکول نہیں آیا تو نام کاٹ دوں گا اس کا۔" اس نے رعب جمایا تو وہ بیلچہ کندھے پر رکھ کر بولی۔

"اور میں رپٹ لکھوا دوں گی تمہاری...... تم نے بھیجا ہے اسے۔"

"ہاں میں نے بھیجا ہے چاچے کے ساتھ اور چاچے کے ساتھ بھیجنا کوئی جرم نہیں ہے۔"

"اس کا کوئی چاچا نہیں ہے۔ سمجھے......؟"

"اور وہ جو آیا تھا وہ......؟" وہ سچ مچ بوکھلا گیا۔

"مجھے کیا پتا کون آیا تھا......؟"

"خواہ مخواہ کی بات مت کرو۔ میں نے کاکے سے تصدیق کروائی تھی۔ وہ اسے چاچا کہہ رہا تھا۔"

"تم یہاں کتنے لوگوں کو چاچا، ماما کہتے ہو۔ وہ سب تمہاری ماں کے سگے تو نہیں ہیں۔" ایک تو وہ وہاں تک بڑی جلدی پہنچتی تھی۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا تب کندھے سے بیلچہ اتار کر وہ زمین پر مارتے ہوئے بولی۔

"جا او ماسٹر...... ! اپنا کام کر ورنہ ابھی جیل پہنچا دوں گی۔ حوالدار کی بیوی ہوں سب جانتے ہیں مجھے۔"

"واقعی......؟ میرا مطلب ہے تم حوالدار کی بیوی ہو......؟"

"تو لوگ مجھے حوالدارنی کیوں کہتے ہیں......؟" اس کے لہجے میں تمسخر تھا جیسے کہہ رہی ہو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے اور وہ سر کھجاتا ہوا بولا۔

"ہوں...... ! تو حوالدارنی صاحبہ...... ! کب لکھوا رہی ہو میری رپٹ......؟"

"بہت شوق ہے تمہیں جیل جانے کا......؟"

"جیل جانے سے زیادہ پھانسی چڑھنے کا شوق ہے اور اس کے لئے مجھے تمہیں قتل کرنا پڑے گا۔" وہ رات اس سے انتقام کے جتنے منصوبے بناتا رہا تھا ان میں اسے قتل کرنا بھی شامل تھا اور اب مذاق میں ہی سہی اس کا اظہار کر گیا تھا۔

"تو قتل کرے گا مجھے......؟ ارے...... ! اس سے پہلے میں......" وہ بیلچہ اُٹھا کر اس کی طرف لپکی تو وہ بوکھلا کر یوں بھاگا کہ بجائے پل پر چڑھنے کے نہر میں کود گیا اور وہ کنارے پر کھڑی للکار رہی تھی۔

○○○

اس کا نام بخت آور تھا اور شروع سے ایسی نہیں تھی بلکہ وہ تو بہت متحمل مزاج، صابر اور قدرے مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا اور اپنے گاؤں میں وہ واحد لڑکی تھی جس نے مڈل پاس کیا تھا اور وہ اس سے

آگے بھی پڑھنا چاہتی تھی لیکن گاؤں میں اس سے آگے تعلیم ہی نہیں تھی اور اماں ابا میں سے کوئی بھی اسے کسی قریبی شہر بھیجنے کو تیار نہیں تھا اور اس نے بھی محض اماں کی وجہ سے ضد نہیں کی تھی کیونکہ وہ اکثر بیمار رہتی تھی۔ گھر کا زیادہ کام کاج وہی کرتی تھی اور اسے یہی خیال تھا کہ اگر وہ کہیں چلی گئی تو اماں کو پریشانی ہوگی۔ یوں اپنے شوق کی قربانی دے کر وہ مکمل گھرداری میں لگ گئی تھی۔ اس کی ہم جولیاں بھی یہی کچھ کر رہی تھیں اس لئے بھی اسے زیادہ محسوس نہیں ہوا۔ پھر وہ مڈل تو پاس کر ہی چکی تھی اور اپنی سہیلیوں میں بہت پڑھی لکھی سمجھی جاتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات میں وہ اس سے مشورہ لینے آجاتیں اور سچ یہ ہے کہ ایسے میں نااہل بھی اہل ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو اچھے برے میں تمیز سکھاتے سکھاتے چھوٹی سی عمر میں وہ خاصی سمجھدار ہو گئی تھی۔

"کیا کہا......؟ شیدے نے تجھے نہر پر بلایا ہے......؟ خبردار جو تو گئی۔ ارے تجھے نہر میں ڈبو کر چلتا بنے گا اور تیری لاش بھی نہیں ملے گی۔" سکینہ بڑے شوق سے اسے بتانے آئی تھی اور اس نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

"صاف منع کر دے شیدے کو اور کہہ دے اگر وہ تیرے بغیر نہیں رہ سکتا تو شادی کر لے تجھ سے۔ اس طرح ملنا اچھی بات نہیں ہے اور تجھے نہیں پتا یہ لڑکے بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔" پھر سکینہ کے کان میں جانے کیا کہا کہ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔

"ہائے اللہ......!"

اسی طرح وہ اپنی ساری ہمجولیوں کو سمجھاتی تھی جس سے ان کے عاشق نامدار اس کے دشمن ہو گئے۔ ان کی نظر میں وہ ظالم سماج تھی جو ان کی محبوباؤں کو ان سے ملنے سے روک رہی تھی اور خود بھی کسی کو لفٹ نہیں دیتی تھی۔ پہلے تو سب نے اسی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چٹان تھی اور اس سے سر ٹکرا کر مایوس ہونے کے بعد ہی کسی نے سکینہ کو اپنے جال میں پھانسا تھا تو کسی نے تاجی کو اور اب یہاں بھی وہ راہ میں حائل ہو رہی تھی جب ہی سب نے اس کے خلاف محاذ بنا لیا اور باقاعدہ اسے تنگ کرنے لگے۔ سارا دن اس کے دروازے کے سامنے سے آتے جاتے ہوئے آوازیں کستے اور جب وہ کھیت پر ابا کو روٹی دینے جاتی تو اس کے پیچھے لگ جاتے گو کہ اسے براہ راست چھیڑنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے پھر بھی یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔ ادھر وہ گھر سے نکل کر پہلا موڑ مڑتی تھی کہ وہ سب کسی طرف سے نکل کر اس کے پیچھے چلتے ہوئے کورس میں گانا بھی شروع کر دیتے۔

تیری عمر ہے سولہ سال زمانہ دشمن ہے

وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ اسے پلٹ کر جواب نہیں دینا ورنہ وہ سب اور شیر ہو جائیں گے اور وہ یہی کر رہی تھی۔ جبکہ اندر اس کا دل بچے کی طرح لرزتا تھا۔ کیونکہ بہرحال وہ ایک لڑکی تھی اور اتنے ہٹے کٹے لڑکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کسی دن ان لڑکوں نے اس کے پیچھے چلنے کی بجائے سامنے آ کر اس کا راستہ روک لیا تو وہ بھاگ بھی نہیں سکے گی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ ابا یا اماں کو بتا دے لیکن اس خیال سے رہ گئی کہ بڑوں میں بات پہنچ کر کہیں خون خرابہ نہ کرا دے۔ اماں ویسے ہی بیمار رہتی تھی اور ابا کمزور۔ دوسروں کے مسائل حل کرنے والی اب اپنے لئے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ وہ آوارہ لڑکے جو پہلے اس سے کافی فاصلے پر چلتے تھے تو ہر گزرتے دن کے ساتھ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اگر یہی حال رہا تو زیادہ دن نہیں تھے جو وہ اس کے سامنے آن کھڑے ہوتے۔ اس تصور سے ہی وہ کانپ جاتی تھی۔ اس وقت وہ ابا کو روٹی دے کر واپس آ رہی تھی اور سخت

خوفزدہ تھی کیونکہ پیچھے اب بیہودہ گانوں کے ساتھ اسے مخاطب کر کے فلمی ڈائیلاگ بولے جا رہے تھے۔

"کدی ساڈے دل دی تک جا"

آہ بھر کر کہا گیا تو اس نے رفتار اور تیز کر دی۔

کیوں دور دور رہندے او حضور میرے کولوں
مینوں دس دیو ہویا کی قصور میرے کولوں

اس کی رفتار کے ساتھ انہوں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تھی اور اب تو آوازیں بہت قریب سے آ رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے ابھی کوئی ہاتھ اس کی طرف بڑھنے والا ہے۔ اس کی ہمت جواب دینے لگی اور بیچ گرنے کو تھی کہ سامنے سے ایک پولیس والے کو آتے دیکھ کر اس نے بے اختیار اسے پکار لیا۔

"سنو......!"

"کون......؟ میں......؟" اس نے رک کر اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ جلدی سے بولی۔

"ہاں تم......! دیکھو وہ لڑکے مجھے تنگ کر رہے ہیں۔" اس نے ان لڑکوں کی طرف دیکھا تھا کہ وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے تب وہ اس کے قریب آ کر پوچھنے لگا۔

"کون تھے یہ......؟"

"یہیں رہتے ہیں ہمارے محلے میں۔ بہت آوارہ ہیں۔ روزانہ میرے پیچھے لگ جاتے ہیں اور گھر بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔ جب دروازے کے سامنے سے گزرتے ہیں آوازیں کستے ہیں۔" وہ جلدی جلدی بتا کر کہنے لگی۔

"تم ان کا کوئی انتظام کر دو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"فکر نہیں کرو۔ کر دوں گا انتظام۔ آئندہ یہ تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ ویسے تم جاتی کہاں ہو......؟" اس نے اطمینان دلا کر پوچھا۔

"ابا کو روٹی دینے۔ وہ وہاں چوہدری بوٹا کے کھیت پر کام کرتے ہیں۔"

"تم کیوں جاتی ہو......؟ میرا مطلب ہے اور کوئی نہیں ہے تمہارے گھر میں......؟ کوئی بھائی وغیرہ۔"

"نہیں......! بس اماں ہیں اور وہ اتنی دور چل نہیں سکتیں۔"

"چلو......! میں تمہیں گھر چھوڑ دوں اور مجھے ان لڑکوں کے نام بتا دو۔ میں ڈی ایس پی صاحب سے کہہ کر ان کا صحیح بندوبست کرواتا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا تو نام بتانے میں وہ ہچکچائی کہ کہیں اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔

"ڈرو نہیں......! تمہارا نام نہیں آئے گا۔" اس نے حوصلہ دیا تو وہ رک کر بولی۔

"پھر بھی وہ سمجھ جائیں گے کیونکہ ابھی انہوں نے مجھے تمہیں پکارتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔"

"تم خوامخواہ ڈر رہی ہو۔ خیر......! میں خود معلوم کر لوں گا۔"

"بس جی......! یہ میرا گھر ہے۔ بہت بہت شکریہ......!" وہ گھر کے سامنے رک کر بولی۔ پھر چق اٹھا کر اندر جانے لگی تھی کہ وہ پکار کر بولا۔

"سنو......! میرا نام صفدر حسین ہے۔ وہ سامنے چوک سے دائیں ہاتھ پر آگے جا کر تھانہ ہے میں وہاں ہوتا ہوں۔ آئندہ کوئی ایسی پریشانی کی بات ہو تو تم وہاں آسکتی ہو۔"

"شکریہ......!" وہ اندر چلی آئی اور پھر صفدر حسین نے اسے اس پریشانی سے تو نجات دلائی لیکن خود اس وقت اطمینان سے ہوا جب اسے بیاہ کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اماں ابا بہت خوش تھے کہ ان کی پڑھی لکھی بیٹی کو اچھا پڑھا لکھا شوہر ملا تھا اور وہ اپنی سہیلیوں سے کہتی تھی۔

"دیکھو......! یہ ہے صحیح طریقہ۔ صفدر حسین نے مجھے پسند کیا اور فوراً شادی کر لی۔ تم ان آوارہ لڑکوں کے چکر میں نہیں آنا جو کبھی نہر پر بلاتے ہیں اور کبھی گنے کے کھیت میں۔"

اس کا سسرال کنڈیاں میں تھا۔ وہ بیاہ کر سیدھا وہیں گئی تھی۔ جتنے دن صفدر حسین کی چھٹی تھی دونوں وہیں رہے اس کے بعد جب صفدر حسین واپس ڈیوٹی پر آنے لگا تو گو کہ وہ اسے بھی ساتھ لانا چاہتا تھا لیکن ساس سسر نے اسے نہیں آنے دیا کہ نئی نویلی دلہن اکیلی کیسے رہے گی۔ صفدر تو سارا دن ڈیوٹی پر ہوگا دوسرے دلہن کے آنے سے ان کے گھر میں رونق ہوگئی ہے۔ حالانکہ پہلے سے دو بہویں موجود تھیں بہر حال اسے روکنے کے سو بہانے تھے سو وہ رُک گئی اور صفدر حسین اکیلا ہی واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس سے وعدہ کر گیا تھا کہ وہ جلد ہی آکر اسے لے جائے گا اور اپنے وعدے کے مطابق وہ ایک ہفتے بعد ہی اسے لینے پہنچ گیا تھا لیکن اس کی اماں کو چھوٹی دلہن کچھ زیادہ بھا گئی تھی اور یہ تو وہی جانتی تھی کہ اسے میاں کے ساتھ کیوں نہیں جانے دیا جا رہا۔ بڑی بہوؤں نے اس کے آتے ہی ساس سسر، دیور اور چھوٹی نندوں کے کام اس کے سر ڈال دیئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آخر اتنے عرصے سے ہم بھی تو کر رہی تھیں اب تمہاری ذمہ داری ہے اور وہ ان ذمہ داریوں سے جی چرانے والی نہیں تھی اس لئے جب صفدر حسین اپنی ماں سے اسے ساتھ لے جانے پر تکرار کر رہا تھا تو اس نے خود منع کر دیا۔

"مجھے یہیں رہنے دو صفدر......! اماں کے ساتھ رہ کر ہی تو میں گھر داری سیکھوں گی۔ مجھے تو آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم نہیں ہے۔"

"جب سر پر پڑتی ہے تو سب معلوم ہو جاتا ہے۔" صفدر کا کہنا بھی ٹھیک تھا لیکن وہ اسے سمجھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

پھر صفدر خود ہی ہر ویک اینڈ پر آنے لگا تھا اور بس اس کے آنے پر ہی ساس سسر اسے بیٹی بیٹی کہہ لیتے تھے ورنہ اس کی حیثیت گھر میں کام کرنے والی سے بھی بدتر تھی اور وہ کیونکہ گاؤں کے حساب سے اچھی پڑھی لکھی بھی جاتی تھی اس لئے اسے شوق تھا کہ کام بھی پڑھے لکھوں جیسے کرے جبھی میاں کے سامنے وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی بلکہ یوں پوز کرتی جیسے یہاں وہ بہت خوش ہے۔ وہ تو ایک روز صفدر حسین اچانک کسی کام سے آ گیا تھا۔ اس وقت وہ آنگن میں بیٹھی اپلے تھوپ رہی تھی۔ اس پر ساس کے کوسنے اور گالیاں جاری تھیں۔ صفدر حسین نے کچھ دیر دیوڑھی میں رُک کر یہ تماشا دیکھا اور انتظار بھی کیا کہ جواب میں وہ بھی کچھ بولے گی لیکن اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تب وہ آگے بڑھا اور اسی وقت اسے ساتھ لے کر اس گھر سے نکل آیا تھا۔

پھر کچھ دن وہ اپنے اماں ابا کے ساتھ رہی تھی۔ اس کے بعد صفدر حسین کا ٹرانسفر میانوالی کے قریب ایک قصبے میں ہو گیا تو صحیح معنوں میں اس کی نئی زندگی کا آغاز وہاں سے ہوا تھا۔ ان دنوں وہ بے حد خوش تھی گو کہ صفدر

حسین قدرے تیز مزاج کا تھا لیکن اس سے بہت محبت بھی کرتا تھا اور جہاں محبت ہو وہاں چھوٹی موٹی خامیاں اپنے آپ نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ صفدر کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہونے دے۔ اسے خصوصاً عورتوں کا دروازے میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر کی جھانکنے سے سخت چڑ تھی اسی لئے وہ سارا وقت گھر میں بند رہتی۔ اگر کسی کے ہاں سے میلاد یا کسی دوسری تقریب کا بلاوا ہوتا تو وہ صفدر سے پوچھ کر جاتی تھی اور اس طرح وہ منع نہیں کرتا تھا۔

پھر ہفتہ دس دن میں ایک آدھ بار اپنے ساتھ کہیں گھمانے لے جاتا۔ وہاں تفریح کے لئے بس دو ہی جگہیں تھیں۔ ایک کمپنی باغ اور دوسرا اسٹیشن۔ تیسری تفریح اسے گھر بیٹھے میسر آ جاتی تھی اور وہ تھی اس کی پڑوسن۔ جس نے سارے قصبے والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ عجیب باؤلی عورت تھی۔ اس کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اگر کسی کو چھینک بھی آ جاتی تو وہ باہر نکل کر اس کا گریبان پکڑ لیتی تھی۔ پھر جو اس کی ماں بہن ایک کرتی تو وہ گھر کے اندر پانی پانی ہو جاتی۔ اس روز صبح ہی صبح کسی کی شامت آئی تھی۔ وہ صفدر کے سامنے ناشتہ رکھتے ہوئے بولی۔

"توبہ......! کیسی لڑاکا عورت ہے۔ ذرا شرم حیا نہیں۔ گھر میں جوان بیٹی ہے اس کا بھی خیال نہیں کرتی۔"

صفدر نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کے برعکس اس عورت کی گالیوں پر محظوظ انداز میں ہنس رہا تھا۔

"تم ہنس رہے ہو......؟" وہ افسوس سے بولی۔

"پھر کیا کروں......؟"

"کوئی انتظام کرو اس کا۔ سارے محلے کو پریشان کیا ہوا ہے۔ اس روز سامنے والی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا میاں حوالدار ہے اس سے کہو۔"

"حوالدار کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس کا۔" صفدر نے کہا تو وہ اسے یاد دلاتے ہوئے بولی۔

"کیوں......؟ وہ اتنے سارے لڑکوں کو تو تم نے ٹھیک کر دیا تھا۔"

"وہ لڑکے تھے اور یہ عورت...... وہ بھی مردمار قسم کی اور ایسی عورتوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اُلٹا لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔"

"کیسے......؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہر شریف آدمی کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے اور وہ بھی ایک طرح سے ٹھیک ہی کر رہی ہے کیونکہ اس کے گھر میں جوان بیٹی ہے جس کا نہ باپ ہے نہ کوئی بھائی اور یہ عورت اگر ڈر کر منہ چھپا کر بیٹھ جاتی تو لوگ اس کا جینا حرام کر دیتے۔ سارے آوارہ چھچھورے اس کے گھر کے سامنے نظر آتے۔ اس وقت بتاؤ کون اس کی مدد کو آتا۔ اُلٹا سب اسے ہی الزام دیتے۔ اپنے آوارہ چھچھورے لڑکوں کو کوئی نہیں سمجھاتا اس کے برعکس اسے اور اس کی بیٹی کو آوارہ اور بدچلن کہہ کر سب انہیں یہاں سے نکالنے کی بات کرتے۔"

صفدر حسین ناشتہ کرتے ہوئے تلخ حقائق قدرے سرسری انداز میں بیان کر رہا تھا جبکہ وہ پوری توجہ سے سننے اور سمجھنے کے ساتھ اس عورت سے ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔ جب ہی اس کے بعد دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر اس نے بھی اپنی پڑوسن کی برائی نہیں کی بلکہ اندر ہی اندر وہ اس کی جی داری کو سراہتی تھی۔

"ٹھیک تو ہے..... اسے زندہ رہنے کا حق ہے اور وہ اسی طرح جی سکتی ہے۔"

یونہی کتنا بہت سارا وقت گزر گیا۔ وہ اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن تھی۔ اس کے سونے آنگن میں جہاں کاکے کی آمد سے ہلچل مچی تھی وہاں اسے ایک خوبصورت مصروفیت ہاتھ آ گئی تھی۔ کاکے کا سن کر اس کے سسرال کے سب لوگ آئے اور کافی دن اس کے پاس رہے تو یہاں بھی اس نے اسی طرح سب کی خدمت کی۔ اپنی طرف سے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پھر جاتے سمے اس کی ساس نے بہت چاہا کہ اسے اور کاکے کو اپنے ساتھ لے جائیں لیکن صفدر نے نہیں جانے دیا۔ اس کی مجبوری تھی وہ چلی جاتی تو اسے کھانے وغیرہ کی تکلیف ہوتی۔ یہی بات اس نے اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کی اپنی سوچ تھی۔

"زن مرید ہے تو..... ! بیوی نے تجھے پہلے سے پٹی پڑھا رکھی ہے۔ یہ اوپر سے جتنی سیدھی نظر آتی ہے اندر سے اتنی چالاک ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔" ان کی ایسی باتیں سن کر ہی اس نے صفدر سے کہا تھا کہ اسے کچھ دنوں کے لئے جانے دے لیکن وہ نہیں مانا اور ظاہر ہے وہ کیا کر سکتی تھی۔ ساس کی بری بھلی سن کر خاموش ہو رہی۔ البتہ ان کے جانے کے بعد صفدر سے بولی تھی۔

"تم نے ناحق اماں کو ناراض کر دیا۔"

"کوئی ناراض نہیں کیا۔ انہیں خود سمجھنا چاہئے۔ تمہیں ساتھ لے جا کر تمہارا اچار ڈالنا تھا انہوں نے۔"

"وہ پوتے کی خوشی اپنے گھر میں کرنا چاہتی تھیں۔"

"بس رہنے دو۔ یہ پہلا پوتا نہیں ہے ان کا۔ اس سے پہلے بھی پوتے کھلا چکی ہیں اور کھلا رہی ہیں اور تم کیوں ان کی طرفداری کر رہی ہو..... ؟ تمہارے ساتھ انہوں نے کون سا اچھا سلوک کیا..... ؟"

"اوہ..... ! میں نے تو یونہی ایک بات کی اور تم پیچھے ہی پڑ گئے۔" اس نے اُکتا کر بات ختم کر دی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس کے ابا آ گئے۔ وہ خاص طور سے اسے لینے آئے تھے کیونکہ اماں بہت بیمار تھیں اور اسے یاد کرتی تھیں۔ اس نے سنا تو پریشان ہو گئی۔ یہ خیال بھی تھا کہ پتا نہیں صفدر حسین اسے ابا کے ساتھ جانے دیگا کہ نہیں۔ اپنی ماں کے ساتھ تو نہیں جانے دیا تھا۔ لیکن اماں کی بیماری کا سن کر اس نے منع نہیں کیا بلکہ خود بھی چھٹی لے کر ساتھ چل پڑا اور آگے اماں جیسے اس کے انتظار میں تھیں۔ اسے اور کاکے کو جی بھر کر پیار بھی نہیں کر سکیں اور ابدی نیند سو گئیں تو وہ جو گھر سے صفدر سے کہہ کر چلی تھی کہ جب تک اماں ٹھیک نہیں ہو جاتیں وہ وہیں رہے گی، تیسرے دن ہی واپس اپنے گھر آ گئی تھی۔ کیونکہ ابا تو اگلے دن سے ہی کام پر جانے لگے تھے پھر وہ اکیلے گھر میں کیا کرتی۔

یونہی وقت گزرنے لگا۔ اسے اپنے گھر میں ہر طرح کا اطمینان تھا۔ بس ایک ابا کی فکر لگی رہتی تھی کہ اس عمر میں وہ اکیلے ہو گئے تھے پھر ان کے کھانے پکانے کی فکر۔ کئی بار خیال آیا کہ صفدر سے کہہ کر ابا کو اپنے پاس بلا لے۔ اکیلی بوڑھی جان کا کوئی اتنا بوجھ تو نہیں ہوگا لیکن اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ان دنوں وہ اسی پریشانی اور شش و پنج میں تھی جب صفدر نے اسے ابا کی شادی کی خبر سنائی ساتھ وہ مذاق بھی اُڑا رہا تھا۔ اپنے تئیں اسے ہرٹ کر رہا تھا کہ اس عمر میں اس کے باپ نے شادی کر لی لیکن وہ بڑے اطمینان سے بولی تھی۔

"چلو..... اچھا ہے۔ اس عمر میں انہیں ساتھی کی زیادہ ضرورت ہے۔"

اور ابا کی طرف سے اطمینان ہونے کے ساتھ اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اب اس کا میکے سے تعلق ٹوٹ گیا اور اس کے لئے اب سب کچھ صفدر حسین اور یہ گھر ہے۔ یوں وہ پہلے سے زیادہ صفدر کا خیال رکھنے لگی تھی۔ حقیقتاً یہ اس کی چھوٹی سی جنت تھی جہاں جگنوؤں کے ساتھ کاکے کی معصوم شرارتیں ہر وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹیں سجائے رکھتیں اور روزانہ رات میں جب کاکا سو جاتا تو وہ صفدر کے ساتھ اس کے مستقبل کے سپنے سجاتی۔

"ہم اسے بہت پڑھائیں گے۔ یہاں تو بس ایک ہی اسکول ہے پرائمری تک اس کے بعد ہم اسے شہر بھیج دیں گے بلکہ ایسا کرنا صفدر..... ! تم اپنا ٹرانسفر کسی شہر میں کروا لینا۔"

"ہاں..... ! یہی کرنا پڑے گا۔" صفدر اس سے پوری طرح متفق ہوتا۔

"تم ابھی سے کوشش کرو ناں..... ؟"

"ابھی تو بہت وقت ہے۔ پانچ جماعتیں تو کاکا یہاں پڑھ سکتا ہے۔"

"کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم اسے پانچ جماعتیں یہیں پڑھائیں..... ؟ شروع ہی سے کسی اچھے اسکول میں پڑھے گا تو اس کی بنیاد مضبوط ہوگی۔" اس نے کہا تو صفدر سوچتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ خیر! ابھی تو یہ ایک سال کا ہے اگلے ایک دو سالوں میں ہم شہر چلیں گے۔"

اور یونہی مستقبل کے سپنے دیکھتے ایک سال گزر گیا یعنی کاکا دو سال کا ہو گیا تھا تب صفدر حسین اپنے ٹرانسفر کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے لئے اسے اپنے افسران کے بہت آگے پیچھے پھرنا پڑ رہا تھا اور ایک معمولی حوالدار کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ ایک دن وہ اپنی درخواست دیتا تو اگلے دن کسی کو یاد بھی نہیں ہوتی تھی۔ گویا اپنا آپ منوانے کے لئے اسے کوئی کارنامہ انجام دینے کی ضرورت تھی جس سے خوش ہو کر اس کی پروموشن کے ساتھ درخواست پر عملدرآمد ہو۔ پھر قسمت سے ایک موقع ہاتھ آ گیا جب وہ اپنا آپ منوا سکتا تھا اور اس وقت اس پر صرف یہی دُھن سوار تھی جبھی وہ اکیلا ہی ڈاکوؤں سے لڑ گیا تھا۔ چار میں سے تین کو مار ڈالا اور جو بچ گیا تھا اس کی گولی سے خود کو نہیں بچا سکا اور اس کی تو جیسے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ صفدر حسین کی آخری خواہش پر اسے اس کے آبائی گاؤں لے جایا گیا تو بس اس کی تدفین تک ہی اس کے سسرال والوں نے اس کی بیوہ اور بچے کا وجود برداشت کیا تھا وہ بھی شاید اس لئے کہ اس کے ساتھ پولیس کی دو گاڑیاں تھیں ورنہ اس منحوس کو دہلیز پر بھی کوئی نہ چڑھنے دیتا۔ اس کے بعد وہ التجائیں کرتی رہ گئی کہ ساری زندگی ان سب کی غلامی کرے گی۔ اسے اور اس کے بچے کو سر چھپانے کو تھوڑی سی جگہ دے دو لیکن وہاں دل میں جگہ نہیں تھی گھر میں کہاں سے نکلتی۔

وہ ناچار واپس لوٹی تو ابا اپنی بیوی کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ یہی سمجھی کہ اسے لینے آئے ہیں۔ دل کو تھوڑی ڈھارس بندھی تھی لیکن ابا نے جھوٹے منہ بھی اسے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھے، تعزیت کی اور بیوی کو لے کر چلے گئے۔ یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ اکیلی کیسے رہے گی اور ایسے وقت میں اسی پڑوسن نے اسے سہارا دیا تھا جس کی بد زبانی، بدکلامی سے سب پناہ مانگتے تھے اور وہ خود لاکھ دل میں اس کی جی داری کو سراہتی پھر بھی اس سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہی عورت کہہ رہی تھی۔

"فکر نہ کر پتر..... ! میں آں ناں..... !" (میں ہوں ناں)۔

اور پھر جیسے وہ اپنے گھر کی طرف کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنے دیتی تھی اسی طرح اس کے گھر کی بھی رکھوالی

بن گئی لیکن اس کا مسئلہ صرف یہی نہیں تھا بلکہ اس کے سامنے تو مسائل کا انبار تھا۔ پیٹ کا مسئلہ سب سے بڑا تھا۔ پھر گھر بھی اپنا نہیں تھا۔ مہینے بھر بعد ہی کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان نے گھر خالی کرنے کا کہہ دیا۔ وہ جائے تو کہاں جائے۔ اکیلی جان ہوتی تو کسی ندی میں ڈوب رہتی، کاکے کے ساتھ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور سچ کہتے ہیں کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو بے آسرا نہیں چھوڑتا۔ ایسے ہی وہ جب ہر طرف سے مایوس ہو چکی تھی تب حکومت کی طرف سے صفدر حسین کی بہادری کے اعتراف میں تحفے کے ساتھ اس کی بیوہ کو دو بیگھہ زمین الاٹ کی گئی اور وہ فوری طور پر تو اس زمین سے کچھ حاصل نہیں کر سکتی تھی اس لئے خاصی سمجھداری سے کام لیتے ہوئے اس نے دو کنال زمین فروخت کر کے اس سے حاصل ہونے والی رقم سے سب سے پہلے تو جس مکان میں مقیم تھی اسے خرید کر رہائش کے مسئلے سے آزاد ہو گئی۔ باقی حساب سے سال بھر کا خرچ رکھ کر اس نے سوچا زمین ٹھیکے پر دے دے لیکن کوئی بھی ٹھیکیدار اس کی زمین پر کاشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ہر دوسرے دن زمیندار کے آدمی اس سے باقی زمین بھی بیچنے کی بات کرنے آتے تھے جس سے وہ سمجھ گئی کہ ان لوگوں نے ٹھیکیداروں کو اس کی زمین پر کام کرنے سے منع کیا ہے تاکہ مایوس ہو کر وہ زمین بیچنے پر آمادہ ہو جائے اور کئی بار وہ مایوس ہوئی بھی لیکن پھر سوچتی کہ اس طرح تو وہ پھر خالی ہاتھ رہ جائے گی۔ پیسہ کب تک چلے گا۔ جبکہ کاکے کو بڑا ہونے میں ابھی بہت سال ہیں۔ جب اپنی پڑوسن کے سامنے اس نے یہ مسئلہ رکھا تو وہ اس کی پیٹھ تھپک کر بولی تھی۔

"ماشاءاللہ.....! جوان جہان ہے تو..... جا خود جا کے اپنی زمین آباد کر۔ کسی کی محتاجی اچھی نہیں ہوتی۔ ارے.....! اپنی دال روٹی جوگا تو کرے گی باقی جب کاکا بڑا ہوگا تو سنبھال لے گا۔"

"ہاں! یہ میرے کاکے کی امانت ہے میں اسے بیچوں گی نہیں۔" اس نے عزم سے سوچا تھا اور ساری بات عزم اور ہمت کی تھی اس کے بعد مشکلیں آتی پڑیں کہ آساں ہو گئیں حقیقتاً اب وہ کسی مشکل سے نہیں گھبراتی تھی۔

○ ○ ○

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی تو کتنی دیر تک وہ دم سادھے پڑا رہا۔ اس ویرانے میں اور وہ بھی اتنی رات کو کون ہو سکتا تھا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دروازے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے برآمدے میں کوئی چل رہا ہے اور ابھی وہ قیاس نہیں کر پایا تھا کہ اس کے بند دروازے کو یوں دھکا لگا جیسے ادھر سے کھولنے کی کوشش کی گئی ہو اور جب دروازہ نہیں کھلا تو ہلکی سی دستک ہوئی۔

"ک..... کون.....؟" اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

"میں.....!" ہلکی سی آواز آئی۔ وہ سمجھ نہیں سکا لیکن اطمینان ہو گیا کہ کوئی انسان ہی ہے جب ہی چارپائی سے اتر کر دروازے کے قریب آ کر بولا۔

"میں کون.....؟"

"شاداں.....!"

"ہائیں.....؟" وہ بے حد حیران ہوا اور فوراً کنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے وہ دونوں بازوؤں میں ایک گٹھڑی دبائے آرام سے کھڑی تھی۔

"تم.....؟" وہ اس کے پیچھے نظریں دوڑا کر پوچھنے لگا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو.....؟"

"کسے دے نال کیوں آواں گی ماسٹر جی.....؟" وہ اٹھلا کر بولی تو وہ تو چکرا گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا.....؟ یہ اتنی رات کو تمہیں ایسی کیا ضرورت آن پڑی جو اکیلی گھر سے نکل آئیں.....؟ کسی کو ساتھ لے لیتیں.....؟"

"ہائے ماسٹر جی.....! تُسی تے....." وہ ایک دم گٹھڑی پھینک کر اس کے گلے میں بازو ڈالنا چاہتی تھی کہ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا اور کرخت لہجے میں بولا۔

"یہ کیا حرکت ہے.....؟ کیوں آئی ہو تم یہاں.....؟"

"اتاں وی نئی سمجھدے.....؟" (اتنا بھی نہیں سمجھتے)۔ وہ کہہ کر رونے لگی تو وہ بجائے اسے چپ کرانے کے کمرے سے باہر نکل آیا اور کھلی فضا میں گہرے سانس کھینچنے لگا۔ حقیقتاً وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ یعنی اس کی طرف سے حوصلہ افزائی نہ ہونے کے باوجود یہ لڑکی اتنی جرأت کر گئی تھی۔

(اُف.....! صبح جب لوگوں کو پتا چلے گا تو.....)۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ پورا پسینے میں نہا گیا۔

قدرے توقف سے عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

"ناراض کیوں ہوندے او ماسٹر جی.....؟ اے دیکھو.....! میں سارا زیور وی لے کے آئی آں۔" اس نے سناٹے میں مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی گٹھڑی کھول رہی تھی ساتھ ساتھ کچھ بولتی بھی جا رہی تھی۔ وہ سن نہیں رہا تھا بس دیکھ رہا تھا۔ گٹھڑی کھلتے ہی زیورات نیچے پھسل گئے اور اس کے ہاتھوں میں گوٹا کناری لگے کپڑے تھے۔

"مینوں بڑا شوق اے..... اے کپڑے پا کے تے میں....." شاداں نے جھلملاتا دوپٹہ اپنے گال کے ساتھ لگایا تو بالکل غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے دوسرے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

"ہائے ظالماں.....!" وہ وہیں بیٹھ کر رونے لگی تو پہلے اس نے اپنے حواسوں پر قابو پایا پھر پیچھے کھسکتا ہوا بولا۔

"ایسے مت بیٹھو.....! چلو یہ ساری چیزیں سمیٹو اور جس طرح آئی ہو اسی طرح واپس جاؤ۔"

"میں نہیں جاناں۔" وہ چیزیں سمیٹتی ہوئی منمنائی۔

"نہیں جاؤ گی تو میں تمہارے باپ کو یہیں بلا لاؤں گا۔ چلو اٹھو.....!" اس نے رعب سے کہا تو وہ جلدی سے گٹھڑی باندھ کر کھڑی ہو گئی اور رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگی لیکن اس وقت نرم پڑ کر وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا جب ہی لہجے میں شدید سختی سمو کر بولا۔

"جاؤ.....! اور خبردار.....! آئندہ ادھر کا رخ کیا۔"

"کیوں جاواں.....؟ مینوں ڈر لگدا اے۔" (کیسے جاؤں مجھے ڈر لگتا ہے)۔ وہ دور تک پھیلے میدان کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"آتے ہوئے ڈر نہیں لگا تھا.....؟" اس کے چبھتے ہوئے طنز کے باوجود وہ صاف گوئی سے بولی۔

"نئیں.....!"

"کیوں......؟"

"پتا نہیں جی...... ! چھدوں میں آ رہی سی تے انی کالی رات نئیں سی ہن تے بڑا ای ہنیرا اے۔" (جب میں آ رہی تھی تو اتنی کالی رات نہیں تھی اب تو بڑا اندھیرا ہے)۔ اس کے لہجے کی آزردگی پر اس نے چونک کر دیکھا پھر فوراً نظریں چرا کر بولا۔

"چلو...... ! میں چھوڑ آتا ہوں۔" اور واپسی کا تمام راستہ وہ خاموش رہی وہی بولتا رہا۔

"تم نے بہت غلط قدم اُٹھایا تھا۔ میری جگہ کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا تھا جو تمہارے لئے واپسی کے سارے راستے بند کر دیتا اور خود بھی تمہیں چھوڑ جاتا۔ بتاؤ...... ! اس وقت تم کیا کرتیں......؟ تمہارے ماں باپ غریب ہیں تمہیں ان کا خیال کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔" وہ بہت چپکے چپکے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جب گلی کے موڑ پر وہ رُک گیا تو آہستہ سے بولی۔

"راستے میں چھوڑ دو گے ماسٹر...... ! تو میں پھر بھٹک جاؤں گی۔" وہ جزبز سا ہو کر آگے چل پڑا۔

حوالدارنی کے گھر کے سامنے اس کا گھر تھا اور پہلے اس نے دھیان نہیں دیا۔ جب شاداں گھر کے اندر چلی گئی تب واپس پلٹتے ہوئے اس کی نظر سامنے پورے کھلے دروازے سے اندر آنگن کے بیچوں بیچ بیٹھی حوالدارنی پر پڑی تو ایک لمحے کو وہ اپنی جگہ سُن ہو گیا۔ کیونکہ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہت کوشش سے بھی وہ اس سے نظریں چرا کر نہیں جا سکا۔ اس کے برعکس اس کے پاس جا کر اپنی صفائی پیش کرنے کی غرض سے بولا۔

"وہ شاداں...... ! پاگل ہے نادان ہے۔"

"اس سے بڑے نادان تو تم ہو ماسٹر......!" بہت مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ فوراً بول پڑی۔

"ارے...... ! اتنا اچھا موقع گنوا دیا......؟ لڑکی خود چل کر گئی تھی تمہارے پاس، بھگا لے جاتے......؟"

"میں ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا۔" وہ اس کی محسوس کی جانے والی معنی خیز مسکراہٹ سے سُلگ کر بولا پھر بدلے میں طنز سے پوچھنے لگا۔

"ویسے تم کیا یہی دیکھنے کے لئے دروازہ کھول کر بیٹھی ہوئی ہو کہ آیا میں شاداں کو چھوڑ جاتا ہوں یا......"

"میں نے شاداں کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔" وہ درمیان بول پڑی۔

"پھر تمہیں کیسے پتا کہ وہ خود میرے پاس آئی تھی......؟"

"تم اسے بلاتے تو پھر چھوڑنے نہ آتے ماسٹر...... ! اور سنو...... ! یہ دروازہ میں نے کسی کی جاسوسی کے لئے نہیں کھلا رکھا۔ میں اپنے کاکے کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"کاکا ابھی تک نہیں آیا......؟"

"نہیں......!" وہ پہلی بار اتنی ٹوٹی ہوئی کمزور نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔

"سنو...... ! میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں۔"

"تم......؟" حسبِ عادت مدد کے نام پر وہ ایک دم جیسے اکڑنے لگی تھی کہ وہ فوراً بول پڑا۔

"چلاّؤ مت...... ! میں جانتا ہوں تم بڑی جی دار ہو۔ تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی

بختاور...... ! کبھی کبھی زندگی میں ایسا مقام بھی آتا ہے جب انسان تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے بتاؤ...... ! کاکے کو اس کا چاچا کہاں لے گیا ہے......؟" وہ اس کے نرم دھیمے لہجے میں ہونٹ بھینچ کر دوسری طرف مڑ گئی لیکن وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی دیکھ چکا تھا۔

"مجھ پر اعتماد کرو بختاور...... ! میں تمہارے کاکے کو لے آؤں گا۔ بتاؤ...... ! تمہاری کس سے کیا دشمنی ہے......؟" اس نے یوں نفی میں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کوئی دشمنی نہیں۔

"پھر وہ کاکے کو اس طرح تم سے پوچھے بغیر کیوں لے گیا؟" اس نے جھک کر پوچھا تو وہ دُکھ سے بولی۔

"مجھے کمزور کرنے کے لئے اور اپنی بات منوانے کے لئے۔"

"کیا بات......؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کہ میں اس سے شادی کر لوں۔"

"کس سے......؟ کاکے کے چاچے سے......؟"

اس کی نظروں میں وہ لمبا چوڑا سراپا گھوم گیا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر پوچھنے لگا۔

"تو تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے......؟"

"اعتراض نہ کروں تو کیا شادی کر لوں اس سے......؟" وہ تڑخ کر بولی۔

"اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے بلکہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے۔" وہ اپنے تئیں اسے سمجھاتے ہوئے کہنے

"ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور آگے لمبی زندگی پڑی ہے۔ اپنا نہیں تو کاکے کا سوچو۔ یہ بھی اچھا ہے کہ اس کے دادا دادی کو خیال ہے جو تمہیں دوبارہ اس گھر میں آباد کرنا چاہتے ہیں۔"

"بس کرو ماسٹر...... ! جب جانتے نہیں ہو تو کیوں اتنا بول رہے ہو......؟" وہ ٹوک کر نخوت سے بولی۔

"میرا گھر آباد کریں گے وہ...... ہونہہ...... ! ایسے ہی خدا ترس ہوتے تو مجھے نکالتے کیوں......؟ بے آسرا کیوں چھوڑتے......؟"

"انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے جب ہی تو......" وہ اس کے گھورنے پر بات اُدھوری چھوڑ کر یونہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو کچھ دیر کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی اور پھر اس خاموشی میں حوالدارنی کی سسکیاں گونجنے لگیں۔

"ارے...... رے...... ! روتی کیوں ہو......؟" وہ اس کے رونے سے زیادہ اس بات سے پریشان ہوا کہ کہیں اس کی آواز آس پاس نہ سنی جائے۔

"کیا کروں......؟ پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں کاکے کو گئے ہوئے۔ پتا نہیں وہ نامراد اسے کہاں لے گیا ہے......؟" وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"کہاں لے گیا ہے......؟ کیا مطلب......؟ اپنے گھر گیا ہو گا......؟"

"نہیں...... ! وہاں تو میں اسی روز گئی تھی۔ ایک دن رہی بھی لیکن وہ نہیں آیا اور کاکے کی دادی صاف مکر گئی کہ اسے کچھ پتا نہیں۔ پھر اُلٹا مجھے الزام دینے لگی کہ میں نے بچے کو کہیں اِدھر اُدھر کر دیا ہے۔ بس...... ! میرا

کاکا مل جائے پھر دیکھنا میں ان کا کیا حشر کرتی ہوں۔ ابھی تو مجبور ہوں زیادہ کچھ بولوں گی تو وہ کاکے کو نقصان پہنچا دیں گے۔" وہ اپنی مجبوری پر بری طرح کڑھ رہی تھی۔ پھر اسے دیکھ کر گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"تم کیوں خود کو تھکا رہے ہو۔۔۔؟ جاؤ۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔!" اس نے بھی "ہاں" کی صورت گہری سانس کھینچی لیکن اس کے پاس سے اٹھا نہیں اور قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔

"تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔۔۔؟ میرا مطلب ہے ماں باپ، بہن بھائی۔"

"صرف ابا ہیں۔ وہاں کلور کوٹ میں لیکن وہ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے بولی۔

"تم مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کر رہیں۔۔۔؟ مجھے کاکے کے چاچا کا نام پتا بتاؤ تو میں اپنے طور پر کوشش کرتا ہوں۔" اس نے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"اس کا نام فدا حسین ہے۔ کندیاں میں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ حوالدار صفدر حسین کا بھائی فدا حسین۔"

"حوالدار صفدر حسین کا بھائی فدا حسین۔" وہ زیر لب بڑبڑایا اور اپنا لائحہ عمل سوچنے لگا تھا کہ معاً گلی میں شور کی آواز سے چونک کر حوالدارنی کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھنے لگی تھی۔ بہ زبان خاموشی جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ یہ کیسا شور ہے۔

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ابھی قدم بڑھایا ہی تھا کہ کھلے دروازے سے کتنے آدمی ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔ سب سے آگے کاکے کا چاچا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی لاٹھی سے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باقی لوگوں سے بولا۔

"دیکھ لو۔۔۔! اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔۔۔! یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اسی لئے یہ عورت ساس سسر کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔"

(اُف۔۔۔!)۔ وہ اپنی جگہ سُن ہو گیا اور اس کے برعکس وہ پورا زور لگا کر چیخی۔

"فدا حسین۔۔۔! خبردار جو مجھ پر کوئی بہتان لگایا تو۔"

"ارے۔۔۔! میں کیا بہتان لگاؤں گا بی بی۔۔۔! یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تجھے اور تیرے اس کچھ لگتے کو۔۔۔؟" فدا حسین اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"دیکھ کیا رہے ہو بھائیو۔۔۔! پوچھو اس ماسٹر سے آدھی رات کو یہاں کیا کر رہا ہے۔۔۔؟"

"مم۔۔۔ میں۔۔۔" وہ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی بس اسی قدر کہہ سکا تو وہ غصے سے اسے دھکا دے کر ان سب کے سامنے تن کر بولی۔

"اس سے نہیں مجھ سے پوچھو۔۔۔! میں بتاتی ہوں۔ تمہاری بہو بیٹیاں جو آدھی رات کو گھر سے نکل کر جاتی ہیں یہ انہیں راستہ دکھاتا ہے۔ جاؤ جا کر پہلے اپنے گھروں کی خبر لو۔"

"جھوٹی ہے یہ۔۔۔ مکار ہے۔۔۔! اپنی بے حیائی چھپانے کے لئے دوسروں پر الزام رکھتی ہے۔"

"میں الزام رکھتی ہوں۔۔۔ بتاؤ ماسٹر انہیں۔۔۔ کس کو گھر چھوڑ کر آئے ہو۔۔۔؟" اس نے پوچھا تو وہ سچ

سچ پریشان ہو گیا۔ اپنی عزت تو خاک میں مل ہی رہی تھی دوسرے کی عزت کو گھسیٹنا کسی طرح مناسب نہیں لگا جب ہی ہونٹ بھینچ گیا۔

"بتاؤ ماسٹر۔۔۔! کون تھی تیرے ساتھ۔۔۔؟" وہ جیسے پاگل ہو کر اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم۔۔۔!" اس کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش نے اس کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا اور وہ ایک دم سناٹے میں آ کر اسے دیکھنے لگی۔

"اب کیا کہتی ہے بختاور۔۔۔؟ ماسٹر نے تو سچ بول دیا۔" فدا حسین اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا تو اس نے ایک نظر اس لڑکی کو دیکھا جس کے ہاتھوں کی گرفت اس کے بازو پر کمزور ہو رہی تھی۔ پھر وہ اپنا مضبوط ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھتا ہوا فدا حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"یہ کچھ نہیں کہے گی فدا حسین۔۔۔! تمہیں جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔"

"تم سے تو میں یہی پوچھوں گا کہ آدھی رات کو تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔؟"

"تمہارا انتظار۔۔۔!" وہ سکون سے بولا۔

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم کاکے کو لے کر آنے والے ہو اس لئے میں یہاں چلا آیا اور دیکھو تمہارے انتظار میں ہم نے دروازہ کھلا رکھ چھوڑا تھا۔ صرف تمہارے لئے فدا حسین۔۔۔! جبکہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے ساتھ لے کر آئے ہو یہ ہمیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے کبھی میرے اس گھر میں رہنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ پورا ایک سال رہا ہوں میں یہاں۔ پوچھو ان سے کیوں لالہ جی۔۔۔؟"

"جی ماسٹر جی۔۔۔!" لالہ جی نے فوراً تائید کی تو وہ افسوس سے بولا۔

"پھر آپ اس کی باتوں میں کیوں آ گئے۔۔۔؟"

"معاف کرنا ماسٹر جی۔۔۔!" اس نے سب کے جھکے ہوئے سروں سے نظریں ہٹا کر بختاور کو دیکھا۔ وہ ابھی تک گم صم کھڑی تھی۔ بہت دھیرے سے اس کا ہاتھ تھپک کر وہ فدا حسین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اب بتاؤ فدا حسین۔۔۔! کاکا کہاں ہے۔۔۔؟"

"تم کون ہو اس کے۔۔۔؟ میں کبھی نہیں بتاؤں گا۔ وہ میرے بھائی کی نشانی ہے۔ میرے پاس رہے گا۔ اگر بختاور کو اس سے پیار ہے تو میرے ساتھ چلے۔" فدا حسین نے جب دیکھا کہ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا بلکہ الٹا اب لوگ اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں تو بوکھلاہٹ میں جانے کیا کیا بکتا باہر نکل گیا۔

"کی گل اے ماسٹر جی۔۔۔؟ سانوں وی دسو۔۔۔!" (کیا بات ہے ماسٹر جی ہمیں بتاؤ)۔ لالہ جی نے کہا تو وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں۔۔۔! ابھی آپ لوگ جائیں۔ ضرورت پڑی تو بلا لوں گا۔"

"اے بی بی نوں کی ہویا اے۔۔۔؟" (بی بی کو کیا ہوا ہے)۔ ماما جی نے جاتے جاتے رُک کر حوالدارنی کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہو جائے گی ابھی۔" اس نے کہا اور حوالدارنی کو دونوں کندھوں سے تھام کر چارپائی پر بٹھایا۔ پھر سب کے جانے کے بعد اس کے لئے پانی لے کر آیا اور گلاس اس کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''لو......! پانی پی لو۔''

''تم.....!'' اس کے ہونٹ ذرا سے نیم وا ہو کر بند ہوئے تو وہ سننے کے لئے اس کے قریب ہو کر بولا۔

''ہاں کہو......! کیا بات ہے......؟''

''تم......!''

''پتا نہیں کیا کہہ رہی ہو......؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو گلاس میں سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹا مارا جس سے اس نے ہچکی کے انداز میں اندر سانس کھینچی۔ پھر کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اسے دیکھنے لگی تو وہ فوراً گلاس اسے تھما کر پیچھے ہٹ گیا لیکن بے سود کیونکہ اس نے گلاس تھامتے ہی اسے کھینچ مارا تھا۔ اس کے بعد یقیناً دس گھر اِدھر دس گھر اُدھر اس کی آواز سنی گئی۔

''اوئے بزدلا......! میں تھی تیرے ساتھ یا وہ تیری ماں جس کا نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے تجھے......؟''

وہ دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھتا رہا۔ پورے دس منٹ تک۔ اس کے بعد اس کے ہونٹ چپل کر وہیں ساکت ہو گئے تب کچھ حیران ہو کر اس نے کانوں میں سے انگلیاں نکالیں تو پتا چلا وہ رو رہی ہے۔

''اُف......! عجیب پاگل لڑکی ہو۔ خود ہی چیختی چلاتی ہو اور پھر روتی بھی ہو۔'' وہ جھنجلایا پھر ایک دم آگے بڑھ کر تیز لہجے میں بولا۔

''بس......! فوراً چپ ہو جاؤ اور خبردار جواب ایک لفظ بھی کہا۔ تمہارے عورت ہونے کا بہت لحاظ کر لیا میں نے۔''

''تم......! تم چلے جاؤ یہاں سے نہیں تو......'' وہ غصے سے کانپتے ہوئے کھڑی ہوئی اور کسی چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تو اس نے خود ہی بیلچا اٹھا کر اسے تھما دیا۔

''لو......! مارو مجھے۔''

''میں...... میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔'' وہ پھنکاری۔

''جان دینے کو کھڑا ہوں۔'' اس نے آرام سے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لئے اور نظریں اس پر جما دیں تو وہ قدرے سٹپٹا کر بیلچہ زمین پر مارتے ہوئے بولی۔

''چلے جاؤ ماسٹر......! میں بہت بری عورت ہوں۔ سچ مچ جان لے لوں گی تمہاری......!'' وہ مبہم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر چھپا کر بولا۔

''میں نہیں جاؤں گا۔ تم اٹھاؤ بیلچا اور......'' اور وہ بیلچہ پھینک کر وہیں زمین پر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی تو وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سنو......! تم بری عورت نہیں ہو۔ برا یہ معاشرہ ہے جو تم جیسی اکیلی عورتوں کو تحفظ نہیں دے سکتا۔ اٹھو......! اس طرح مت بیٹھو جیسے کوئی تھک ہار کر مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔ نہیں بختاور......! تم ہار نہیں سکتیں۔ تمہیں جیتنا ہے۔ بہت جی دار ہو تم......! چاہو تو دنیا فتح کر سکتی ہو۔ ویسے آدھی دنیا تو فتح کر چکی ہو۔''

وہ دھیرے سے گھٹنوں سے سر نکال کر اسے دیکھنے لگی تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''شجاعت علی کا دل۔'' اس کی آنکھیں جانے تحقیر سے کٹی تھیں یا غصے سے۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور آسمان پر نمودار ہوتی ہلکی سی سپیدی دیکھ کر کہنے لگا۔

''دیکھو......! صبح ہو رہی ہے۔ میں کاکے کو لینے جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ شام سے پہلے لوٹ آؤں گا۔ کیا میں اُمید رکھوں کہ تم کاکے کے ساتھ ساتھ میرا بھی انتظار کرو گی......؟''

اس نے اچانک اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے نظریں چرانے پر بولا۔

''اچھا......! چلتا ہوں۔ دروازہ بند کر لو اور اطمینان سے سو جاؤ۔ میں کاکے کو لے کر ہی آؤں گا۔'' وہ تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

○○○

اس وقت تک اس کے ذہن میں کاکے کی بازیابی کے لئے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا اور اب اس سے دعوے سے کہہ تو آیا تھا لیکن فوری طور پر سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سیدھے کندیاں جانا بے کار تھا کیونکہ وہ بتا چکی تھی کہ کاکا وہاں نہیں ہے۔ ہوٹل پر بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل مختلف طریقے سوچتا اور الجھتا رہا۔ کیونکہ وہ کوئی جذباتی نوجوان نہیں تھا جو کسی فلمی ہیرو کی طرح دھاڑتا ہوا ولن کے سر پر پہنچ جاتا اور اکیلا دس آدمیوں سے لڑ کر بچے کو لے آتا۔ اس کے برعکس وہ تمام پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔

''کی گل اے ماسٹر جی......! پریشان لگدے او......؟'' پٹواری نے اسے مسلسل سوچوں میں گم دیکھ کر ٹوکا تو وہ چونک کر بولا۔

''نہیں......! کوئی ایسی بات نہیں ہے۔''

''رات حوالدارنی دے گھر کا وا جھگڑا سی......؟''

''وہ...... اس کے بچے کا جھگڑا تھا۔'' اس نے گول مول جواب دیا پھر بھی وہاں بیٹھے سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''بچے دا کی جھگڑا اے......؟''

''پتا نہیں......! اس کا چاچا اسے لے گیا ہے اس کی ماں سے پوچھے بغیر۔ دس دن ہو گئے ہیں۔'' پھر اس نے مختصراً بتایا کہ کس طرح کاکے کا چاچا اسکول آ کر دھوکے سے اسے لے گیا ہے۔ اس کے بعد کہنے لگا۔

''میری غلطی ہے۔ مجھے کاکے کو نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ یوں بھی اسکول آ کر بچے ہماری ذمہ داری ہو جاتے ہیں اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں اسے کہاں ڈھونڈوں......؟ اس کی ماں کو تسلی تو دے آیا ہوں لیکن......''

''تسی پہلے نہیں دسیا ماسٹر جی......! تے او حوالدارنی نے وی نہیں دسیا۔'' (آپ نے پہلے نہیں بتایا اور حوالدارنی نے بھی نہیں بتایا)۔

''کڑی کملی اے۔'' (لڑکی پاگل ہے)۔

''ساڈوں دسو ماسٹر جی......! کون لے کے گیا اے ساڈے بچے نوں......؟'' (ہمیں بتائیں کون لے گیا ہے ہمارے بچے کو)۔ ایک کے بعد ایک سب بولنے لگے تھے۔

''چلو جی لے کے آنے آں۔'' (چلو ابھی لے کے آتے ہیں)۔

''نہیں......! اس طرح نہیں۔'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش کر دیا۔ پھر کہنے لگا۔

''بچے کا معاملہ ہے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہے۔''

''فیز کس دھوکی کرتا ہے......؟'' (آپ بتائیں کیا کرنا ہے)۔ گویا ہوش کی کمی کا اعتراف تھا۔

''ابھی آپ کو کچھ نہیں کرنا۔ پہلے میں کاکے کے بارے میں معلوم کر لوں اس کے بعد دیکھیں گے۔''

وہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ اچانک اسے ایک راستہ نظر آیا تھا اور وہ اسی وقت چل پڑا۔ ڈاک خانے سے آگے پولیس اسٹیشن تھا۔ اس وقت ڈیوٹی پر موجود حوالدار سے اس نے اپنا تعارف کرایا اور کاکے کی رپورٹ درج کرنے کے بجائے ساری صورت حال بتا کر اسے اپنے ساتھ کندیاں چلنے کو کہا کیونکہ وہ اس معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد حوالدار نے اس کے ساتھ چلنے کی ہامی بھری تو لیکن اگلے دن۔ جس سے وہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولا۔

''آج کیوں نہیں......؟''

''آج ڈی ایس پی صاحب آنے والے ہیں۔ میرا ڈیوٹی پر موجود ہونا ضروری ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ میں پھر کل کس وقت آؤں......؟''

''آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ماسٹر جی......! میں خود آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

''بڑی مہربانی......!'' وہ اس سے مصافحہ کر کے نکلا تو سیدھا اسکول آ گیا۔ گو کہ ایک دن کی کوئی بات نہیں تھی لیکن حوالدار نے وہ شام کا کہہ کر آیا تھا۔ اس لئے خاصا بدل سا ہو رہا تھا۔ دن میں کئی بار اس نے چاہا کہ جا کر اسے بتا آئے کہ آج نہیں کل لیکن اپنی ہی بات کہ کاکے کو لے کر ہی آؤں گا سے رہ گئی رہی اور کل کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ جانے کتنے دن لگ جائیں۔ وہ اسے جھوٹا کہہ کر بدگمان ہو سکتی تھی۔ ابھی تو آس کے ساتھ انتظار کے دیپ جلائے بیٹھی ہوگی اور وہ دیپ بجھنے نہیں دے گا۔

رات میں سونے سے پہلے اس نے اماں کو تفصیلی خط لکھا جس میں حوالدانی کے تمام حالات بتا کر اس کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اس کے بعد قدرے اطمینان سے سویا تھا۔

○ ○ ○

اگلے دن وہ بڑی بے قراری سے حوالدار کا انتظار کر رہا تھا۔ بار بار کلاس روم سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑا ہوتا اور وہ چھٹی کے بعد ہی آیا۔ اس وقت تک حقیقتاً وہ مایوس ہو چکا تھا۔

''معاف کرنا ماسٹر صاحب......! کچھ دیر ہو گئی۔ اصل میں ڈی ایس پی صاحب نے ایک کام سے کلورکوٹ بھیج دیا تھا۔ وہاں سے آ کر کھانا کھایا پھر سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔'' حوالدار نے آتے ہی دیر سے آنے کی معذرت کے ساتھ سبب بتایا تو وہ اپنی بدگمانی پر اندر ہی اندر نادم ہو کر بولا۔

''کوئی بات نہیں......! میں بھی ابھی فارغ ہوں۔''

''چلیں پھر......؟''

''ہاں......! میں تیار ہوں۔'' وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

اسے کندیاں میں کاکے کے ملنے کی اُمید نہیں تھی اور راستے میں اس نے حوالدار سے بھی یہی کہا کہ بچہ

وہاں نہیں ہوگا لیکن اس کے ددھیال والوں سے معلوم ہو جائے گا اور یہ کام حوالدار ہی کر سکتا ہے۔

''فکر نہیں کریں ماسٹر صاحب......! میں ان کے مردوں سے اُگلوا لوں گا۔ اگر آپ رپورٹ درج کروا دیتے تو میں ایک ایک کو تھانے بلاتا اور وہ بچے کو بھی خود لا کر آپ کے حوالے کرتے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن یہ کچھ گھریلو قسم کا معاملہ ہے سہولت سے حل ہو جائے تو اچھا ہے۔ تھانہ کچہری کرنے سے لوگ دشمنیاں بڑھا لیتے ہیں۔ اس لئے میں نے رپورٹ درج نہیں کرائی۔'' اس نے کہا تو حوالدار اسے سراہتا ہوا بولا۔

''آپ سمجھدار آدمی ہو۔'' وہ بس مسکرا کر رہ گیا۔

کندیاں میں کسی کو ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا۔ پھر لوگ ابھی حوالدار صفدر حسین اور اس کے کارنامے کو بھولے نہیں تھے۔ جس پہلے شخص سے اس نے حوالدار صفدر حسین کے بھائی فدا حسین کا پوچھا تو اس نے صحیح راہنمائی کرتے ہوئے سیدھا اس کے گھر پر لا کھڑا کیا اور شاید قسمت مہربان تھی کہ دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والا فدا حسین ہی تھا جسے دیکھتے ہی اس نے اپنے ساتھ کھڑے حوالدار سے کہا۔

''یہی بچے کو لے کر آیا تھا۔''

''ماسٹر جی......! تُسی ادھر کدھر آ گئے......؟'' معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہی فدا حسین نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا جسے تھام کر وہ بھی قصداً انجان بن گیا۔

''یہاں ایک کام سے آیا تھا سوچا تم سے ملتا چلوں اور ہاں......! وہ کاکا تمہارے ساتھ آیا تھا بہت دن ہو گئے۔ اس کے اسکول کا بہت حرج ہو رہا ہے۔''

''ہاں ہاں ماسٹر جی......! آپ اندر تو آؤ......! کوئی لسی پانی......'' فدا حسین نے سامنے سے ہٹ کر انہیں راستہ دیا تو اس نے حوالدار کو دیکھا اور پھر اس کا خیال کر کے کچھ دیر بیٹھنے پر آمادہ ہو گیا۔ ورنہ دل چاہ رہا تھا فوراً کاکے کو لے کر واپسی کی راہ لے۔

''ماسٹر صاحب......! اس کے تو مجھے دیکھتے ہی چھکے چھوٹ گئے۔'' فدا حسین لسی پانی کا انتظام کرنے گیا تو حوالدار نے اس سے کہا۔

''اسی لئے تو میں آپ کو لے کر آیا ہوں۔ میں جانتا تھا معاملہ یہیں نمٹ جائے گا کیونکہ یہ کوئی عادی مجرم تو ہے نہیں۔ بس جوش میں آ کر بھی کوئی غلط کام کر جاتے ہیں اور پھر......''

کاکے کے آنے سے اس کی بات اُدھوری رہ گئی۔ وہ دروازے میں ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''ماسٹر جی......! اماں نہیں آئی......؟''

''نہیں......! اس نے مجھے بھیجا ہے۔ چلو گے ناں میرے ساتھ......؟'' اس نے ہاتھ ہلا کر کاکے کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ قریب آ کر بولا۔

''چاچا نہیں جانے دے گا مجھے۔''

''جانے دے گا پتر......! جانے دے گا۔'' حوالدار نے اسے تسلی دی۔ تب ہی فدا حسین لسی کا جگ اور گلاس لے کر آ گیا اور بیٹھتے ہی کاکے سے کہنے لگا۔

"کاکے...... ! جا دادی نوں تے پھوانوں مل کے آ۔" (دادی اور پھوپھی سے مل آؤ)۔ ہم اس کا بھلا سوچتے ہیں۔ زمانہ خراب ہے آپ بتاؤ...... ! اکیلی عورت رہ سکتی ہے......؟"

"اب اکیلی نہیں رہے گی۔" وہ بے اختیار کہہ گیا۔

"جی سائیں......؟" فدا حسین نے پتا نہیں سنا نہیں یا سمجھا نہیں، سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو وہ فوراً بات بدل گیا۔

"کاکے کو بلاؤ...... ! ہم چلتے ہیں۔ اس کی ماں انتظار کر رہی ہوگی۔"

"ہاں سائیں...... ! بلاتا ہوں۔"

○ ○ ○

اور واپسی میں رات اتر آئی تھی۔ وہ حوالدار کا بہت شکریہ ادا کر کے کاکے کے ساتھ اس کی گلی تک آیا تو اچانک کسی خیال کے تحت رک گیا۔ کاکا اپنا گھر دیکھتے ہی بھاگنے لگا تھا لیکن وہ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر ہوٹل پر لے آیا اور بٹھا کر کہنے لگا۔

"ابھی تم یہیں بیٹھو...... ! کھانا کھاؤ اور جب تک میں تمہیں آواز نہ دوں گھر نہیں آنا۔"

"کیوں ماسٹر جی......؟"

"اس لئے کہ تمہاری ماں بہت غصے میں ہے۔ تم اسے بتائے بغیر چلے گئے تھے ناں......؟ میں پہلے جا کر اسے سمجھاتا ہوں پھر تمہیں بلاؤں گا۔"

"اماں مارے گی......؟" کاکا ماں کے پاس جانے کو بے چین بھی تھا اور ڈر بھی گیا۔

"نہیں...... ! میں اسے منع کروں گا۔ تم پہلے کھانا کھاؤ آرام سے۔" اس نے لڑکے کو بلا کر کاکے کو کھانا دینے کو کہا اور کھانا آنے تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد کاکے کو تسلی دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ حوالدارنی کے دروازے پر آ کر دستک دی تو اندر سے اس کی کمزور آواز سنائی دی۔

"کون اے......؟"

"میں ہوں شجاعت علی......!" اس نے کہا تو حوالدارنی کے بدن میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ بھاگتی ہوئی آئی تھی اور پورا دروازہ کھول کر بس ایک نظر اسے پھر اس کے آس پاس بے قراری سے دیکھنے لگی تھی۔

"کاکا نہیں آیا۔" وہ مایوسی سے بولا تو وہ چیخ پڑی۔

"کیوں......؟ تمہیں ملا تھا کاکا......؟ یا ان لوگوں نے تمہیں بھی......"

"صبر سے...... پہلے مجھے بیٹھنے تو دو...... اتنی دور سے آ رہا ہوں۔" وہ ٹوک کر اندر آنا چاہتا تھا لیکن وہ راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں...... ! پہلے مجھے کاکے کا بتاؤ......؟"

"میں کاکے سے مل کر آ رہا ہوں اور باقی بات آرام سے بیٹھ کر پانی پینے کے بعد بتاؤں گا کیونکہ لاری اڈے سے یہاں تک آتے آتے میری زبان خشک ہو گئی ہے۔ یہ دیکھو......!" اس نے زبان باہر نکالی تو وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں بس...... ! دم نکلنے کو ہے تمہارا...... ! آؤ مرو......!" اس کے ساتھ پلٹ کر سیدھی مٹکے کے پاس گئی اور گلاس میں پانی نکال کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ آرام سے چارپائی پر بیٹھ گیا تھا تب اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر کے بولا۔

"جزاک اللہ...... ! جزاک اللہ...... ! ایسا ٹھنڈا پانی پلایا ہے تم نے یقیناً اس میں تمہاری محبت شامل ہوگی۔" وہ تلملائی ضرور لیکن مصلحتاً خاموش رہی۔

"ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں......؟" وہ گلاس ایک طرف رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ چارپائی کے دوسرے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ماسٹر جی...... ! کیوں تنگ کرتے ہو مجھ دکھیاری کو......؟ جو بھی بات ہے بتا ڈالو۔" وہ اس کے لہجے کی آزردگی محسوس کر کے اسے مزید ستانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں یہاں سے حوالدار کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ کاکا وہیں کندیاں میں ہے اپنے دادا دادی کے پاس۔"

"تو تم اسے لائے کیوں نہیں......؟"

"زبردستی اٹھا لاتا کیا......؟ وہ خود ہی آنے پر تیار نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کے دادا دادی اور چاچے نے بھی بہت کہا کہ بیٹا چلے جاؤ لیکن وہ نہیں مانا۔ کہنے لگا اب میں یہیں رہوں گا اور اماں کو بھی یہیں بھیج دو۔ یہاں سب بہت اچھے ہیں۔" وہ کن انکھیوں سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔

"اور...... اور...... کیا کہہ رہا تھا......؟"

"اور...... ہاں...... ! کہہ رہا تھا وہ چار دن میں چاچے کے ساتھ آ کر تمہیں لے جائے گا۔"

"کیوں......؟ مجھے کیوں لے جائے گا......؟" وہ اس پر یوں بگڑی جیسے اسی کا قصور ہو۔

"مجھے کیا پتا......؟ شاید تمہاری شادی وادی......" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ دراصل یہی جاننا چاہتا تھا کہ وہ فدا حسین سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی اور وہ بھڑک اٹھی۔

"میری شادی......؟ ہونہہ...... ! یہ تو بھول جائے فدا حسین کہ میں کبھی اس سے شادی کروں گی۔ میرے بچے کو بہکا کر سمجھتا ہے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔"

"نہیں...... ! اس نے تمہارے بچے کو بہکایا نہیں ہے بلکہ میرا خیال ہے وہ سچ مچ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ آخر اس کا خون ہے اور اسے تمہارا بھی خیال ہے۔"

"نہیں ماسٹر...... ! تم نہیں جانتے۔ انہیں بچے سے پیار ہے نہ میرا خیال انہیں صرف میری زمین کا لالچ ہے۔" وہ دکھ سے بتانے لگی۔

"جب تک مجھے زمین نہیں ملی تھی کسی نے پلٹ کر میری خبر تک نہیں لی۔ اس وقت کیا کاکا ان کا خون نہیں تھا......؟ زمین ملتے ہی سب کی محبتیں جاگ اٹھیں۔ ان سے کہو بے شک ساری زمین لے لیں مجھے میرا کاکا دے دیں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"ارے...... ارے...... ! رونا نہیں...... ! تم روتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" اس کی آواز بھرانے پر

اس نے فوراً ٹوکا لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا ماسٹر......! زندگی میں کبھی کبھی ایسا مقام بھی آتا ہے جب انسان اکیلا کچھ نہیں کر سکتا اور پھر میں تو عورت ہوں اکیلی عورت۔''

''اب تم اکیلی نہیں ہو بختاور......! میں ہوں تمہارے ساتھ۔'' اس نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔

''نہیں ماسٹر......! میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم شریف آدمی ہو اور میں بہت بری ہوں۔''

''تم بری نہیں ہو برائی کو اپنی طرف آنے سے روکنے کے لئے تم نے جو لبادہ اوڑھا وہ وقت کی ضرورت تھی۔ میں ایک سال یہاں رہا ہوں اسی گھر میں۔ اگر تم میں برائی ہوتی تو میری شرافت کا دامن دوسرے ہی دن تار تار ہو چکا ہوتا۔ آج اگر میں اپنی نظروں میں بھی سرخرو ہوں تو صرف تمہاری بدولت ورنہ مرد کو بہکتے کیا دیر لگتی ہے۔''

وہ اس کی آنکھوں سے چھلکتے آنسو انگلیوں پر سمیٹ کر بولا پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر کھڑا ہوا تو کہنے لگا۔

''بہر حال وہ وقت گزر گیا۔ تم نے جو لبادہ اوڑھا تھا اسے اتار پھینکو اور مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم گنوار عورتوں کی طرح چیخ چیخ کر نہیں بولو گی اور نہ ہی گالیاں دو گی کیونکہ میں ساری زندگی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر نہیں بیٹھ سکتا۔''

اس کے بھیگے چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ نے چھب دکھلائی تھی۔ تبھی کاکے نے دروازے میں آ کر پکارا۔

''اماں......!'' وہ بری طرح چونکی اور بھاگ کر کاکے کو بازوؤں میں بھر کر پوچھنے لگی۔

''تو کس کے ساتھ آیا......؟''

''ماسٹر جی کے ساتھ......!'' کاکے نے بتایا تو وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''میں نے سوچا پتا نہیں کھانا وغیرہ پکایا ہے کہ نہیں اور بچہ بیچارہ بھوکا تھا اس لئے میں اسے ہوٹل میں بٹھا آیا تھا۔'' وہ اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو وہ کاکے کو چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پھر مجھ سے جھوٹ کیوں بولا......؟''

''وہ بس......!'' وہ شرارت سے مسکرایا لیکن ادھر اس کا دماغ گھوم چکا تھا۔ بیلچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''تیری تو میں......'' اس نے فوراً کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تو اس کا بیلچے کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا اور زبان بھی دانتوں میں دبا لی تھی۔

''شاباش......!'' وہ کانوں میں سے انگلیاں نکالتے ہوئے بولا۔

''اب تم حوالدارنی نہیں ماسٹرنی ہو...... کیا ہو......؟''

''ماسٹرنی......!'' بے آواز جنبش کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکان کھیلنے لگی تھی۔

⊖ ⊖ ⊖